انتساب

علامہ ارشد القادری

(۱۹۲۵ء/۲۰۰۲ء)

کے نام

جن کا قلم ہمیشہ آسودہ حال مسلمانوں اور قائدین کو میڈیا کی اہمیت، ضرورت اور اس
کے ہمہ گیر اثرات کا احساس دلاتا رہا

فہرست

باسمہ تعالیٰ

اظہاریہ

مسلم صحافت کی تاریخ پونے دوسو سال پرانی ہے، اس طویل عرصے میں اپنی تمام تر جد و جہد اور صحافتی تقاضوں کی تکمیل کے باوجود اسے کبھی بھی وہ عروج حاصل نہیں ہو سکا جو دوسری قوموں کی صحافت کا مقدر ٹھہرا- ان پونے دوسو سالوں میں ذرائع ابلاغ کا دائرۂ کار وسیع تر ہوتا گیا، لیکن مسلم صحافت غیر منقسم ہندوستان سے مسلم سماج اور اس کے بعد مسلمانوں کے مذہبی یا اردو پسند حلقوں میں سمٹتی چلی گئی- ان گزرے ہوئے سالوں میں کبھی کسی تحریک یا جذبے کے زیر اثر مسلم صحافت کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا دکھا بھی تو صرف اس وقت تک جب تک مذکورہ تحریک یا جذبے میں حرارت باقی رہی- ان کی یخ بستگی کے ساتھ ہی مسلم صحافت کی یہ وسعت سمٹ کر پھر اپنے محور پر گردش کرنے لگی- آگے چل کر مسلم صحافت کے بطن سے ہی مسلمانوں کی مذہبی صحافت نے بھی اپنے بال و پر نکالے، لیکن بہ استثنائے چندان کے ذمہ داران کی صحافتی تقاضوں سے بے خبری مذہبی رسالوں کو طویل زندگی نہیں دے سکی اور اگر وسائل کی فرواوانی نے کسی کو لمبی عمر تک زندہ بھی رکھا تو اسے عوام کی جانب سے قبولیت کا خلعت عطا نہیں ہو سکا-

مذہبی صحافت کی عدم مقبولیت نے ہی شاید مؤرخین کو اس کی مبسوط تاریخ لکھنے سے بے پروا رکھا، ناقدین نے اس کے محاسن و معائب پر گفتگو نہیں کی اور محققین نے اس کے لیے اپنی بساط تحقیق نہیں بچھائی- دنیا کی مختلف قوموں اور زبانوں یہاں تک کہ مسلم صحافت

کی تاریخ اور عروج و زوال پر بھی ہمیں کثیر سرمایہ ملتا ہے، جب کہ مذہبی صحافت کی تاریخ، اس کے عناصر و اسالیب، رجحانات اور محاسن و معائب پر مشتمل چند مبسوط علمی و تحقیقی مضامین بھی نہیں ملتے- کسی بھی ترقی یا زوال کے دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں: ایک داخلی اور دوسرا خارجی- داخلی عناصر کا تعلق صلاحیت، پیش کش اور طریق کار سے ہوتا ہے، جب کہ خارجی عناصر حالات اور ماحول پر مشتمل ہوتے ہیں- ترقی کا مدار دونوں عناصر کی صحیح تنظیم و ترتیب پر ہے، ان میں سے کسی ایک کی ناہمواری زوال اور نامقبولیت کا باعث بن جاتی ہے- عام مسلم صحافت اور مسلم مذہبی صحافت کی تاریخی کڑیوں کو مختلف ادوار میں جوڑنے کی کوشش کی جائے تو ہر دور میں ذرائع ابلاغ کے ہمہ گیر اثرات کے باوجود دونوں کی نامقبولیت کو مذکورہ نکتے میں دیکھا جا سکتا ہے-

مسلم صحافت کے داخلی عناصر تو ہر دور میں صحیح رہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے دائرۂ اثر کو خارجی عناصر نے کبھی وسیع اور ہمہ گیر ہونے کا موقع نہیں دیا، یہ خارجی عناصر مختلف زمانے میں مختلف رہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱-انگریزی سرکار کی سیاسی قلابازیاں
۲-۱۸۵۷ء کے الم ناک حادثے
۳-لسانی تعصب
۴-ہندؤں اور مسلمانوں کا مذہبی اور معاشرتی تناؤ
۵-تقسیم ہند
۶-اردو زبان کا اسلامائزیشن
۷-تقسیم ہند کے بعد اقلیتی اور اکثریتی مفادات پر حکومتوں کا جانب دارانہ رویہ

جب کہ مذہبی صحافت سے عوام کی عدم دلچسپی کا سبب خارجی عناصر کے ساتھ داخلی عناصر بھی رہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱-پیش کش کا روایتی طریق کا
ر۲-Outdated موضوعات کا انتخاب

۳-عصری مفاہیم اور اسالیب سے بے خبری
۴-صحافتی اصول سے ناآشنائی
۵-فروعی مسائل پر جنگ و جدال
۶-رسائل کی اشاعت میں وقت، محنت اور توجہ کی کمی
۷-صحافت کی اہمیت و اثرات سے غفلت

برصغیر میں مسلم صحافت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۷ تک، دوسرا دور ۱۸۵۸ء سے ۱۹۰۰ء تک، تیسرا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک اور چوتھا دور ۱۹۴۸ء سے تا حال- جبکہ مذہبی صحافت کا آغاز ۱۸۷۰ء سے ہوتا ہے-

مسلم صحافت کے پہلے دور میں مسلمانوں کی مذہبی صحافت کی بات کی جائے، جس میں عموماً مذہبی امور پر مسلمانوں کی رہنمائی مقصود ہوتی ہے، اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے اور مذہبی و ملی مسائل کا تاریخی و تجزیاتی مطالعہ ہوتا ہے، مسلم صحافت کے اس پہلے دور میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا- حیرت کی بات ہے کہ انگریزوں نے اپنی طاقت کے ابتدائی مرحلے میں ہی عیسائیت کی تبلیغ کا آغاز مختلف شعبوں سے کر دیا تھا جس میں صحافت بنیادی کردار ادا کر رہی تھی، لیکن مسلمانوں کی جانب سے کوئی مجلّہ یا رسالہ شروع نہیں کیا گیا، حالانکہ ردعمل میں اس کام کا آغاز ناگزیر تھا- اس کے علاوہ ۵۷ء سے پہلے ملک کے سیاسی حالات بھی ایسے نہیں تھے جیسا کہ اس کے بعد ہوئے، مادی انقلاب نے ہندوستان کے دروازے پر دستک بھی نہیں دی تھی اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تپش کو کسی ''ازم'' نے ٹھنڈا کیا تھا- یہ سچائی ہے کہ اس وقت مسلمان سیاسی سطح پر جوجھ رہے تھے مگر مسلم دشمنی کی ایک بڑی وجہ ان کے مذہبی اور ایمانی معاملات بھی تھے- انگریزوں کے ذریعے فارسی زبان کے خاتمے کی کوشش اور اسلامی علوم و فنون کو مٹانے کی جد و جہد اسلام دشمنی کے روشن استعارے تھے-

یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دین کی رہنمائی اور اشاعت اس کے علما ہی کرتے ہیں، اسلام

کا استحکام اور تبلیغ بھی علماے شریعت کے ذریعے ہی ہوتی رہی ہے- حیرت ہے کہ برصغیر میں مسلم صحافت کے آغاز اور عروج میں علما نے ہی کمان سنبھالی، لیکن اپنے پہلے صحافتی دور میں انھوں نے ہی مذہبی صحافت کو بالکل نظر انداز کر دیا، دوسرے لفظوں میں صحافت کے ذریعے اسلام کے استحکام وتبلیغ کی کوشش سے پہلو تہی کی گئی- مسلم صحافت کا آغاز وارتقا اگر علما کے ذریعے نہیں ہوا ہوتا تو یہ شکایت اتنی برمحل نہیں ہوتی جتنی مذکورہ حالت میں ہو جاتی ہے- یہ شکایت اس وقت اور بھی بامعنی ہو جاتی ہے جب یہ تکلیف دہ تاریخ سامنے آتی ہے کہ اس وقت علما کا ایک بڑا طبقہ منقولات اور دینی وملی ضرورتوں سے صرف نظر کر کے یونانی فلسفے کی درس وتدریس اور عقول عشرہ، خرق والتیام فلک اور جزء الذی لا یتجزیٰ کے رد وابطال میں مصروف تھا- قدیم فلسفے کی تردید پر مشتمل ان لا حاصل مصروفیات کا ایک عظیم دفتر آج بھی بطور یادگار لائبریریوں میں محفوظ ہے- ستم یہ ہے کہ علما کی تدریس کا ایک بڑا حصہ آج بھی ان کے بطلان پر صرف ہو رہا ہے، حالانکہ برصغیر میں نہ اس وقت مذکورہ نظریات کا کوئی پرستار تھا اور نہ آج کوئی ان کا حامی وموید ہے- ایسے میں یہ سوال اپنی پوری توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کہ مذہبی حلقے میں یونانی فلسفے کے تردید وابطال کی یہ ہنگامہ آرائیاں کیوں اور کس کے لیے تھیں؟ ہزار کوششوں کے باوجود بھی میں آج تک اس کا کوئی تسلی بخش جواب اپنے آپ کو دے کر مطمئن نہیں کر سکا- یہ بات بھی بڑی حیران کن ہے کہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہی یوروپ کے اندر برپا ہونے والے جدید سائنسی انقلاب نے یونانی فلسفے کو رد کر دیا تھا اور اس کے بالمقابل ڈارون ازم، مارکسزم اور فرائڈ کے جنسی فلسفے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی، جو براہ راست مذہبی افکار وعقائد سے متصادم تھے اور بشمول برصغیر دنیا کے بڑے خطے کے ذہن وفکر کو تہ وبالا کر رہے تھے، مگر یوروپ کا یہ جدید فلسفہ نہ اس وقت علما کی دلچسپی کا موضوع تھا اور نہ آج ہے- ممکن ہے دو سو سالوں کے بعد جب کسی نئے فلسفے کی بنیاد پڑے تو وہ یوروپ کے مذکورہ نظریات کی تدریس وتردید کی طرف متوجہ ہوں-

مسلم صحافت کے پہلے دور کی طرح دوسرے دور میں بھی مذہبی صحافت کا نام ونشان

نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ کچھ اخبارات ورسائل کبھی کسی شمارے میں اپنی مضامین شائع کر دیا کرتے تھے- سرسید کے اخبار کے علاوہ دوسرے دور کی پوری مسلم صحافت پہلے پہل صحافت برائے صحافت پر عامل رہی، لیکن اپنے اخیر دور میں اس کی پوری توجہ آزادی وطن کی جدوجہد پر مرکوز ہو گئی- یہ صحیح ہے کہ دوسرے دور میں مسلم صحافت کا مرکزی موضوع آزادی وطن رہا اور یہ بھی سچ ہے کہ اس دور میں مذہبی صحافت کہیں نظر نہیں آتی، لیکن میری رائے میں باقاعدہ مذہبی صحافت کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے- یہ الگ بات ہے کہ اس آغاز کو وسعت نہیں مل سکی-

برصغیر میں صحافت کی مفصل تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے ہی مذہبی صحافت کی بنیاد رکھی اور ۲۴؍دسمبر ۱۸۷۰ء میں علی گڑھ سے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا- اس رسالے کا مقصد مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور ان کی معاشرت کی اصلاح تھی- سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کے پہلے ہی شمارے میں ''تمہید'' کے زیر عنوان اپنے مقصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''بس ہمارا مطلب ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اس مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہو سکے ان کے دین ودنیا کی بھلائی میں کوشش کریں-'' (ص:۱)

اس رسالے کے تعلق سے محمد افتخار کھوکھر نے تاریخ صحافت میں لکھا ہے کہ:

''تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا- اس اخبار نے مسلمانوں کو فرسودہ روایات، رسومات کی اندھا دھند تقلید ترک کرنے کا مشورہ دیا، مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنی زندگیوں میں اسلام کو رائج کریں، لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر قسم کے علوم وفنون سے استفادہ کریں-''

(ص:۸۳، مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان)

یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ تہذیب الاخلاق کی بے پناہ شہرت ومقبولیت کے باوجود اس صدی کے آخر تک مذہبی صحافت کا کوئی دوسرا نقش سامنے نہیں آسکا، اس عرصے

میں اگر کوئی مذہبی رسالہ جاری ہوا بھی ہوگا تو اس کی عدم مقبولیت تاریخ صحافت میں اپنا اندراج نہیں کرا سکی۔ مسلم صحافت کے پہلے دور کی طرح دوسرے دور میں بھی مسلم صحافیوں اور علما کی سرگرمیوں کے موضوعات اور ان کی ترجیحات مختلف تھیں، جن میں مذہبی صحافت کی گنجائش نہیں تھی، جس کا خمیازہ مؤرخین کی بے اعتنائی، عوام کی عدم دلچسپی اور نامقبولیت کی شکل میں مذہبی صحافت آج تک بھگت رہی ہے، جب کہ اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا یہ ایک بڑا اور مؤثر ذریعہ ہوسکتا تھا۔ سرسید نے اس نوشتہ دیوار کو پڑھ لیا اور مذہبی صحافت کے ذریعہ مسلم سوسائٹی میں ذہنی وفکری انقلاب برپا کردیا۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ برصغیر کی اصلاحی، صحافتی، ادبی اور تعلیمی تاریخ کے حوالے سے مؤرخین، محققین اور لکھنے والوں کی کوئی بات سرسید کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

مذہبی صحافت کے آغاز وارتقا میں سرسید کے نمایاں کردار کے اعتراف کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ انہوں نے اپنی مذہبی صحافت اور مذہبی تحریروں کے ذریعے دین کی جو تعبیر وتشریح پیش کی وہ ''اعتزالی فکر'' کی نئی شکل تھی، جو امت مسلمہ کے شدید مذہبی انحرافات کا سبب بن گئی۔ سرسید کی تعلیمی، صحافتی اور اصلاحی میدانوں میں گرانقدر خدمات کے باوجود علما سے ان کے شدید اختلافات کی وجہ مذکورہ تعبیر وتشریح ہی تھی۔ یہ نظریاتی اختلافات آگے چل کر ان کی تعلیمی، اصلاحی اور صحافتی تحریکوں پر بھی براہ راست اثر انداز ہوئے۔ سرسید کی مذہبی تشریحات اور امت مسلمہ پر ان کے اثرات کے حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اقتباس قابل مطالعہ ہے:

''سرسید کے کام کو اصلاح اور تنقید عالی کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ مسلمانوں میں ان کے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی، تعلیمی تحریکیں اٹھی ہیں ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح ان سے ملتا ہے، دراصل مبالغہ کی حد سے متجاوز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں ان سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے، وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کے دنیا سے رخصت ہوئے۔'' (ترجمان القران، شوال

۱۳۵۹ھ بحوالہ مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف، مولانا منظور نعمانی، ص:۹۲، مطبوعہ الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

مسلم صحافت کے تیسرے دور کو انقلابی عہد کہا جاسکتا ہے اس دور میں مسلم صحافت اپنے عروج پر تھی۔ اس دور میں اگر مذہبی صحافت کی بات کی جائے تو بیسویں صدی کے آغاز سے مذہبی صحافت کا باقاعدہ اجرا اور برصغیر کے مختلف خطوں سے اس کی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس عرصے میں ۱۹۴۷ء تک تقریباً ڈیڑھ سو مذہبی رسائل وجرائد کا سراغ ملتا ہے۔ مسلم صحافت کے اس تیسرے دور میں مولانا آزاد کے ''الہلال'' کو اگر مذہبی صحافت کے زمرے میں لایا جائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی مجلّہ یا رسالہ شہرت اور مقبولیت کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکا جہاں تک الہلال کے رسائی تھی۔ جہاں تک اس دور کی مذہبی صحافت کی افادیت کا تعلق ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اس ڈیڑھ سو رسائل کی فہرست میں ایسے کئی رسائل اور مجلّات سامنے آئے جو اپنے اپنے حلقوں میں مسلمانوں کی دینی وشرعی رہنمائی کا ذریعہ بنے نیز ان کے ذریعے بالواسطہ اردو زبان کا فروغ بھی ہوا، کیونکہ اس دور میں فارسی زبان عملی طور پر ختم ہوچکی تھی اور جتنے بھی رسائل وجرائد منظر عام پر آرہے تھے وہ سب کے سب اردو میں تھے۔ ان میں قاضی عبدالوحید فردوسی کا ماہنامہ تحفۂ حنفیہ، پٹنہ (۱۹۰۸ء) اور مفتی عمر نعیمی کا السواد الاعظم، مرادآباد (۱۹۱۸ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے تحریک ندوہ کے مسلکی اشتراک واتحاد کی پالیسی کے خلاف اہل سنت و جماعت کی طرف سے بنیادی کردار ادا کیا جبکہ موخر الذکر نے قیام پاکستان کی تحریک میں اپنے مشمولات اور فکر انگیز مضامین کے ذریعے نمایاں حصہ لیا۔ لیکن پہلا قاضی عبدالوحید کے انتقال کے بعد اور دوسرا تقسیم ہند کے بعد جاری نہ رہ سکا۔ ان کے علاوہ اس دور کے مذہبی رسائل وجرائد میں ہفت روزہ الفقیہ، امرتسر (۱۹۱۸ء) ماہنامہ ترجمان القرآن، حیدرآباد (۱۹۳۲ء) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ (۱۹۱۶ء) اور ہفت روزہ پیغام، کلکتہ (۱۹۲۱ء) کافی اہم تھے اور اپنے مشمولات اور اثرات کے اعتبار سے تمام معاصر رسائل پر فوقیت رکھتے تھے لیکن جب بات صحافت کے وسیع اثرات کی کی جائے تو اس بات کو بھی ماننا ہوگا کہ اس دور

میں کوئی بھی مذہبی مجلّہ یا رسالہ وسیع پیمانے پر مسلم معاشرے میں قابل ذکر اثرات قائم نہیں کر سکا- اس کی بنیادی وجہ ''داخلی عناصر'' (جس کی تفصیل ابتدا میں بیان کر دی گئی) کی بے ترتیبی کے ساتھ ''مسلمانوں کی مسلکی تقسیم'' بھی تھی-

برصغیر کی مسلم تاریخ میں محققین کے ذریعے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مسلکی فرقہ بندی کی ابتدا شاہ اسماعیل دہلوی (۱۷۷۹ء/۱۸۳۱ء) کے ذریعے ہوئی، جب انھوں نے ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴/۲۵ء) میں 'تقویۃ الایمان' نامی کتاب لکھی- اس کتاب کی اشاعت سے قبل مسلمانوں میں دو ہی فرقے مشہور تھے، ایک شیعہ اور دوسرا سنی- اس کتاب کی اشاعت کے بعد مختلف ادوار میں متعدد فرقے وجود میں آئے، جیسے وہابی، اہل حدیث، اہل قرآن، دیوبندی، چکڑالوی، نیچری وغیرہ- ہر فرقہ اصول اور فروع میں خاص نظریات کا حامی و داعی تھا- اس طرح مسلمانان ہند مختلف فرقوں اور مسلکوں میں بٹتے چلے گئے- ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی یہ مسلکی تقسیم صرف نظریاتی اور فکری سطح تک محدود نہیں رہی، بلکہ ۵۷ء کے بعد ایک انسٹی ٹیوشن کی شکل میں جتنے مدارس وجود میں آئے، مساجد تعمیر ہوئیں، تنظیمیں اور تحریکیں تشکیل پائیں، کتابیں لکھی گئیں ان سب پر مسلکی رنگ غالب رہا، کیونکہ ہر سطح اور ہر محاذ سے اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ اور دفاع کی کوششیں کی جا رہی تھیں- اس ماحول میں جب مذہبی صحافت کی ابتدا ہوئی تو مسلکی تقسیم کا اثر اس پر بھی پڑا- کسی بھی مسلک کے صحیح یا غلط اور اس کے حق تبلیغ و دفاع کی بحث سے قطع نظر اس دور کے تمام مذہبی رسائل اپنے اپنے مسلک کی نمائندگی کر رہے تھے، اس لیے ان میں سے کوئی ایک بھی امت کا رسالہ نہیں بن سکا- مذہبی صحافت کی یہ مسلکی تقسیم اس کی عام مقبولیت، توسیع اور اثرات میں رکاوٹ بن گئی، اس لیے کہ ہر پرچہ اپنے خاص مسلکی نظریات کے ساتھ صرف اپنے ہی حلقے میں پڑھا جا رہا تھا- یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ہر چیز کے کچھ اپنے تقاضے اور اصول ہوتے ہیں، جن کی پاسداری ضروری ہوتی ہے- صحافت کے بھی اپنے تقاضے اور اصول ہیں، جس کو حد سے زیادہ نظریاتی تسلط، تقسیم، ادعائیت، موضوعیت اور جانب داریت راس نہیں آتی-

۴۷ء کے بعد مسلم صحافت کے آخری دور میں اگر مذہبی صحافت کی بات کی جائے تو اس کی اشاعت و اثرات کو دیکھ کر بہت خوشی نہیں ہوتی- ۴۷ء سے قبل مذہبی صحافت کی جو داخلی اور خارجی صورت حال تھی، وہ ۴۷ء کے بعد مزید بگڑتی چلی گئی اور جو اہم مذہبی رسائل و جرائد تھے، وہ یا تو بند ہو گئے یا پھر تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے- وقت گزرنے کے ساتھ برصغیر کے مذہبی کینوس پر مسلکی تقسیم کا رنگ جب مزید گہرا ہوا تو مذہبی صحافت کا دائرۂ اثر بھی بہت محدود ہوتا چلا گیا- اب ہمیں اگر مذہبی صحافت کی اشاعت، اثرات اور مشمولات کا جائزہ لینا ہو تو انہیں مسلکی خانوں میں تقسیم کر کے ہی لیا جا سکتا ہے- ۴۷ء کے بعد کی یہ تمام صورت حال کے باوجود اگر مذہبی صحافیوں نے اس کے داخلی عناصر پر توجہ دی ہوتی تو آج مذہبی صحافت کا رنگ ہی الگ ہوتا، کیوں کہ بقول شخصے دنیا میں دو ہی چیزیں قابل فروخت ہیں، ایک جنسیات اور دوسری مذہبیات- دراصل انسان مجموعہ ہے جسم اور روح کا- اس کی جسمانی طلب کی انتہا اگر جنسی لذتوں کا حصول ہے تو روحانی تسکین کا ذریعہ مذہب- اس لیے مذہبی صحافت سے عوام کی عدم دلچسپی، اس کی محدود اشاعت، مختصر زندگی اور بے ثمری کا ٹھیکرا عوام اور صحافت کے ''مذہبی عنوان'' کے سر پھوڑنے کی بجائے اپنے رویوں پر غور کرنا چاہیے- اپنا محاسبہ انہیں یہ احساس ضرور دلائے گا کہ ہائی ٹیک ذرائع ابلاغ کی موجودہ صدی میں مذہبی رسائل کی پیش کش کا طریق کار کتنا پرانا ہے- سائنسی انقلاب کے ذریعے مادیت اور صارفیت کا جو سیلاب آیا ہے وہ مذہب، روحانیت اور انسانیت کو نگلنے کے لیے بے تاب ہے- جس سے معاشرے میں بے شمار جدید مسائل پیدا ہو گئے ہیں- ان جدید مسائل سے منہ پھیر کر مذہبی صحافت کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا جا رہا ہے، وہ کتنا غیر مفید اور بے فیض ہے- موجودہ صدی میں صحافت کو مؤثر ترین بنانے کے لیے ترسیل کی زبان کو دلچسپ، معروضی اور عام فہم بنانے کی کوشش تیز تر ہوتی جا رہی ہے، جب کہ مذہبی صحافت کا اسلوب کتنا پیچیدہ اور فہم سے بالاتر ہے- مسلمانوں کی معاشی، تعلیمی اور سماجی مسائل پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے دور جاہلیت کے قبائل کی طرح فروعی مسائل پر طویل جنگ و جدال ان پر مستزاد-

مذہبی صحافت کے مذکورہ تمام مسائل کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر میں کچھ رسائل ایسے بھی نکلے جو معاصر مذہبی رسائل میں اپنی تحریری، فکری اور علمی انفرادیت کی وجہ سے اپنے اپنے حلقوں میں مقبول ہوئے- ان میں اہل سنت و جماعت کا پندرہ روزہ ''جام کوثر'' کلکتہ، ماہنامہ ''جام نور'' کلکتہ، ماہنامہ ''پاسبان'' الہ آباد اور ان کے بعد ماہنامہ ''حجاز جدید'' دہلی (۱۹۸۸ء) قابل ذکر ہیں- اول الذکر دونوں رسائل علامہ ارشد القادری (۱۹۲۵ء/۲۰۰۲ء) کی زیر ادارت ۶۱/۱۹۶۰ء میں نکلے اور تین چار سالوں میں بند ہوگئے- اپنے مختصر عہد میں یہ دونوں رسائل اپنے مدیر کے اسلوب تحریر اور انداز فکر کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئے- اسی طرح دیوبندی مکتب فکر کا ''الجمعیۃ'' دہلی اور ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند- جماعت اسلامی کا سہ روزہ ''دعوت'' دہلی اور مولانا وحید الدین خان کا ''الرسالہ'' دہلی مذہبی معاصر رسائل و اخبارات میں نمایاں رہے- اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ صحافت خواہ وہ سیاسی ہو، ملی یا مذہبی، اپنے آپ میں کشش اور اثر اندازی کی صلاحیت رکھتی ہے- اس کے ذریعے وسیع پیمانے پر ذہن سازی، فکری تعمیر و ترقی، دعوت و تبلیغ اور اصلاحات کا ناقابل تنسیخ نقش معاشرے میں قائم کیا جاسکتا ہے- شرط یہ ہے کہ صحافت کو جبری اصول و نظام کی بجائے اس کے اپنے اصول اور تقاضوں کے تحت چلایا جائے-

---

مذہبی صحافت کی مذکورہ تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۰۰۲ء میں ہم نے ماہنامہ جام نور کی نشاۃ ثانیہ کا فیصلہ کیا اور اسی سال اکتوبر میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا- جدید پیش کش، updated موضوعات اور عصری اسلوب کے ساتھ اس کے داخلی عناصر کی صحیح تنظیم و ترتیب پر بھرپور توجہ دی گئی، جس کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی صحافت کے زوال کی کہی ان کہی داستانوں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے یہ رسالہ ہند و پاک کے وسیع حلقے کی آواز بن گیا- اس کی اشاعت کے آٹھ برسوں میں کئی اہم ترین موڑ آئے، جہاں اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہوا، یہاں تک کہ مئی ۲۰۱۰ء سے اس کی اشاعت پاکستان سے ہونے لگی- شاید جام نور کی اشاعت اور مقبولیت کا یہ ایسا تاریخی سنگ میل ہے، جہاں تک مذہبی صحافت کی

پوری تاریخ میں کوئی دوسرا رسالہ نہیں پہنچ سکا- یہ بات ایک طرف جام نور کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انفرادیت کا اشاریہ ہے تو دوسری طرف اس بات کا ثبوت کہ اگر موجودہ دور میں مذہبی صحافت عصری تقاضوں سے ہم آہنگ اور سنجیدہ وعلمی لب لہجے میں ہو تو نہ صرف وہ وسیع حلقے میں پڑھی جائے گی بلکہ اس کے دوررس اثرات بھی مرتب ہوں گے-

جام نور کو مقبولیت اور انفرادیت بخشنے میں دیگر بہت سے عوامل کے ساتھ جدید تقاضوں پر مشتمل اس کے مستقل کالمز کا نمایاں حصہ رہا ہے، ان کالموں میں خاص طور پر ''روبرو''، ''تحریری مباحثہ'' اور ''خامہ تلاشی'' قابل ذکر ہیں- ان میں اول الذکر کالم 'روبرو' کے تحت ہم نے برصغیر کی معروف مذہبی، ملی، سیاسی، ادبی، تعلیمی، تحریکی اور صحافتی شخصیات سے انٹرویوز لینے کا آغاز پہلے شمارے سے ہی کیا- اب جبکہ جام نور اپنی مسلسل اشاعت کے ۱۰۰ر شمارے پورے کر چکا ہے، انٹرویوز لینے کی رسم اسی تسلسل سے جاری ہے- میرا خیال ہے کہ مذہبی رسائل و جرائد کی دنیا میں اس مستقل کالم کو جام نور کی ''اوّلیات'' میں شمار کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، کیونکہ مذہبی صحافت کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں کسی بھی رسالے یا جریدے نے مستقل کالم کے تحت مسلسل انٹرویوز لینے کا اہتمام نہیں کیا-

جام نور کی آٹھ سالہ اشاعت میں اب تک ہند و پاک کی تقریباً ۱۰۰ر معروف شخصیات اور ان افکار و خیالات سے ہم اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے ہیں- خیال آیا کہ ذاتی افکار، عالمی و ملکی حالات، شعر و سخن، علم و ادب، تاریخ و تصوف اور مسلمانوں کے داخلی اور خارجی مسائل پر مبنی ان گراں قدر انٹرویوز کو کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے تاکہ آنے والی نسل بھی ان افکار و خیالات سے رہنمائی لیتی رہے- زیر نظر مجموعے میں جن شخصیات کا انٹرویوز شامل ہے ان کا تعلق مختلف میدانوں اور شعبوں سے ہے، اس لیے ''روبرو'' کے نام سے انٹرویوز کے اس مجموعے کو تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

پہلی جلد: علما و مشائخ پر مشتمل ہے-

دوسری جلد: ادبا، شعرا اور ناقدین ادب پر مشتمل ہے-

تیسری جلد: ملی، سیاسی، تعلیمی، تحریکی اور صحافتی شخصیات پر مشتمل ہے-

تقریباً ایک ہزار صفحات پر پھیلے تین جلدوں میں انٹرویوز کے اس منفرد مجموعے کو پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ انٹرویوز لینے میں مناسب شخصیت کا انتخاب سے لے کر سوالات کی ترتیب، وقت کا تعین، ریکارڈ کردہ جوابات کی نقل، اس کی ترتیب وایڈیٹنگ اور تعارفی خاکہ لکھنے تک جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان کی انجام دہی میں جام نور کی پوری ٹیم خاص طور پر مدیر جام نور ذیشان احمد مصباحی کا نمایاں رول رہا ہے۔ ان کی حصہ داری کے بغیر اس کام کا خوش اسلوبی سے انجام پانا ممکن نہیں تھا۔

خوشتر نورانی
۱۰؍نومبر ۲۰۱۰ء

شیخ ابوسعید احسان اللہ چشتی

زیب سجادہ آستانہ چشتیہ عارفیہ، سید سراواں (الہ آباد)

سید سراواں الہ آباد کی معروف خانقاہ عارفیہ، سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ صفویہ کی شاخ ہے جس کو عارف باللہ حضرت مخدوم شاہ عارف صفی قدس اللہ سرہ (متوفی ۱۳۲۰ھ) نے قائم کیا تھا۔ شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ محمدی چشتی صفوی اسی آستانے کے زیب سجادہ ہیں۔ آپ اپنے والد گرامی کے چچا، شہزادۂ بانیٔ خانقاہ حضرت شاہ احمد صفی قدس اللہ سرہ کے مرید وخلیفہ ہیں۔ آپ کی ولادت سید سراواں کے قدیم عثمانی خانوادے میں ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جناب علی ظہیر چشتی صابری نقشبندی علیگ مرحوم اور والد گرامی حضرت حکیم آفاق احمد ملقب نہال عارف قدس اللہ سرہ سے حاصل کی، جبکہ آپ کی پرورش آپ کے خالو جناب شکیل احمد عثمانی کی کفالت وسرپرستی میں ہوئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی۔اے (فارسی) میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں تعلیم کے درمیان ہی بانیٔ خانقاہ کے سالانہ عرس کے موقع پر ۱۷؍ذی القعدہ ۱۳۹۸ھ کو آپ کے مرشد نے آپ کو بیعت کیا اور سلاسلِ اربعہ کی خلافت واجازت اور آستانے کی سجادگی سے نوازا۔ ۱۹۹۳ء میں فقہ وتصوف اور شریعت وطریقت کے جامع افراد تیار کرنے کے لیے ''جامعہ عارفیہ'' قائم کیا۔ آپ کی مثنوی ''نغمات الاسرار فی مقامات الابرار'' مسائل ومباحث تصوف میں اردو میں متن کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بیعت وخلافت میں نہایت محتاط ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مریدین وخلفاء کی تعداد کم ہے، غیر مسلموں میں آپ نے دعوت وتبلیغ کا اہم کام انجام دیا ہے، تقریباً سو سے زائد لوگ آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر چکے ہیں۔ حال ہی میں آپ کی نگرانی میں تصوف پر برصغیر سے پہلی بار علمی ودعوتی مجلّہ کتابی سلسلہ ''الاحسان'' شائع ہوا ہے۔

سوال:-علماے ربانیین کون ہیں؟اور علماے سوء کی شناخت کیا ہے؟

شیخ ابوسعید چشتی:-علماے ربانیین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی صحبت میں اللہ یاد آئے اور آخرت کا یقین مضبوط ہو جن کی زندگی ''**اِنّ صَلاتِی وَنُسکِی ومحیایَ ومماتي لِلّٰه رب العٰلمین**'' کا کامل مظہر ہو، جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے الگ ہوں، جنہیں دنیوی کاروبار اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرسکے، ان کے پیش نظر صرف دین کی اشاعت وتبلیغ ہو، ان کی قربت ومعیت میں انسان کو اپنی خامی وکوتاہی کا اعتراف ہو، عجز وانکسار پیدا ہو، معصیت سے بچنے کا عزم وارادہ محکم ہو، طاعات کی طرف میلان وشوق میں اضافہ ہو، راہ خدا میں انفاق کا جذبہ بیدار ہو-

اور علماے سوء وہ ہیں جو دین کو دنیا حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں، جن کے قول وفعل میں تضاد ہو، دوسروں کو اللہ کا راستہ بتائیں اور خود عمل سے دور رہ کر حقیر دنیا کی تلاش میں سرگرداں رہیں، جن کی صحبت دین سے بے رغبتی پیدا کرے، اللہ سے غفلت کا سبب بنے، غرور وتکبر کا باعث ہو اور بغض وحسد، کینہ وعداوت اور غیبت وعیب جوئی جیسے ناپسندیدہ امور کی طرف لے جائے- ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے سے بزرگوں نے منع فرمایا ہے-

سوال:-اسلامی دعوت کا سلسلہ جو ابتدائی ادوار میں تھا، بعد میں کیوں رک گیا؟

شیخ ابوسعید چشتی:-افراد امت کے دل ودماغ پر جب تک ''**کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر**'' کا حقیقی مفہوم غالب رہا ''**قوا انفسکم واھلیکم نارا**'' پر جب تک عمل پیرا رہے اور ''**ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة**'' کے مقتضا ومنشا پر تبلیغ قائم رہی تو اسلامی دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہا، اور جیسے جیسے خیر امت کو اپنی ذمہ داریوں اور دعوت وتبلیغ کی اہمیت وضرورت کا احساس ختم ہوتا گیا، اسلامی دعوت کا کام ماند پڑتا گیا، حالانکہ دین کا کام جوش وجذبہ اور اخلاص کے ساتھ ساتھ ایثار وقربانی چاہتا ہے ؎

خود خدا کہتا ہے تم میں کچھ کریں تبلیغ دیں

اس کا یہ مطلب نہیں نا اہل بھی دیکھے یہ خواب
کارِ دیں اوروں کی خاطر کودنا ہے آگ میں
یہ نہیں سبزوں کی جانب بیل بکری کا شتاب

آج بھی اگر افراد امت اسی احساس اور جذبہ وخلوص کے ساتھ دعوت واصلاح کا کام کریں تو ان شاء اللہ ضرور ہوگا-

سوال :-موجودہ ہندوستانی پس منظر میں آپ تصوف اور خانقاہ کو کتنا متحرک پاتے ہیں؟

شیخ ابوسعید چشتی:-موجودہ ہندوستانی پس منظر میں خانقاہیں اس طرح متحرک نہیں جیسا کہ ہونی چاہیے، **الا ماشاء اللّٰه** ، البتہ علمی تصوف کچھ نہ کچھ متحرک ضرور ہے، لیکن یہ حرکت انسانیت کو روحانی سکون فراہم کرانے کے لیے کافی نہیں ہے-

سوال :-ایک خاص طبقہ کا الزام ہے کہ تصوف جامد غیر فعال اور اباحیت پسند ہے، اس تعلق سے آپ کیا فرماتے ہیں؟

شیخ ابوسعید چشتی:-تصوف نام ہے اسلام اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے تزکیۂ نفس، اخلاق حسنہ اور احسان کو حاصل کرنے کا، جب اصل تصوف یہ ہے تو بلا شبہ تصوف جامد غیر فعال اور اباحیت پسند ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام وایمان کا تقاضا اس کے بر خلاف ہے- وہ لوگ تو تصوف اور حقیقتِ تصوف سے آشنا ہی نہیں ہیں جو اس طرح کی بے بنیاد تہمتوں پر اپنا نظریہ قائم کرتے ہیں، جو کچھ وہ تصوف کے نام پر اپنے ارد گرد پا رہے ہیں اس کا حقیقی تصوف سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اس طرح کا الزام لگانے والے معذور ہیں، ان کو چاہیے کہ تصوف کو کسی حقیقی صوفی کی صحبت میں رہ کر سمجھیں کیونکہ تصوف صرف ایک فکر نہیں بلکہ مکمل عمل پیہم کا نتیجہ ہے-

سوال:-تصوف، سریت وباطنیت میں بنیادی فرق کیا ہے؟

شیخ ابوسعید چشتی:-شریعت کے ظاہری احکام پر عمل کرتے ہوئے ان کے باطنی آداب کی رعایت وپاس داری کا نام تصوف ہے- اور شرعی احکام کو غیر ضروری سمجھ کر ظاہری

عمل کو ترک کر دینا ،صرف باطن پر توجہ کا دعویٰ کرنا باطنیت ہے جو سراسر گمراہی اور اسلامی نظریہ کے منافی ہے-

سوال :- رہبانیت کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اور ایک صوفی اور ایک راہب میں کیا فرق ہے؟

شیخ ابوسعید چشتی:- رہبانیت (عزلت، گوشہ نشینی، اعتکاف) کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں اور احسان کے ضابطوں پر عمل کرتے ہوئے خوف خدا اور رضائے الٰہی کی خاطر تزکیہ نفس میں مشغول ہو جانا جسے مجاہدۂ نفس بھی کہتے ہیں سورۂ حدید کے اندر اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ ورحمۃ ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا فاٰتینا الذین اٰمنوا منھم اجرھم وکثیر منھم فٰسقون مگر ساتھ ہی ساتھ اس کے کچھ تقاضے ہیں جن کی پاس داری از حد ضروری ہے- ان تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر کوئی اسے اختیار کرتا ہے تو ایسی رہبانیت باعث اجر وثواب ہے ورنہ عذاب وعتاب کا سبب-

جیسا کہ مذکورہ آیت میں اس بات کی وضاحت ہے کہ قوم نے رضائے الٰہی کے لیے رہبانیت ایجاد کی حالانکہ اللہ نے ان پر یہ فرض نہیں کیا تھا پھر ان میں سے اکثر لوگ اس کے حقوق کی رعایت نہ کر سکے جس کے سبب وہ عذاب کے مستحق ٹھہرے اور جن لوگوں نے اس کی رعایت کی ان کو ان کے رب کی طرف سے اجر عطا کیا گیا-

اگر رہبانیت عبث ہوتی تو اصحاب کہف نے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بھی عبث ہوتا مگر ان کی رہبانیت میں شریک ہونے والا کتا بھی جنتی ہو گیا اور اگر مطلق یہ ممنوع ہوتی تو نبی کریم ﷺ غار حرا میں نہ جایا کرتے اور نہ اصحاب صفہ گھر بار چھوڑ کر مسجد میں گوشہ نشین ہوتے- حدیث ''**لارھبانیۃ فی الاسلام**'' کی حقیقت ایسی ہی ہے جیسے کہ ''**کل بدعۃ ضلالۃ**''- نہ ہر بدعت گمراہی، نہ ہر رہبانیت ممنوع-

ابن جریر نے ابن مسعود کے حوالے سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ہم سے پہلے لوگ اکہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے ان میں سے صرف تین فرقوں نے نجات پائی باقی ہلاک ہو گئے، ان میں سے ایک فرقہ بے دین وظالم بادشاہ کے سامنے سینہ سپر ہو گیا اور ان سے دین عیسوی کی حمایت میں قتال کیا تو بادشاہ نے ان کو شہید کر دیا دوسرا فرقہ جس میں قتال کی قوت نہ تھی پھر بھی انھوں نے دین عیسوی کی تبلیغ جاری رکھی، بادشاہ نے انہیں بھی شہید کروا دیا تیسرا فرقہ جس کے اندر نہ تو قتال کرنے کی قوت تھی اور نہ ہی تبلیغ کے لیے حالات سازگار تھے جس کی وجہ سے وہ پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اور رہبانیت اختیار کی-

سوال:- وحدۃ الوجود کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور کیا یہ تصور ہندو فلسفے سے ماخوذ ہے؟

شیخ ابوسعید چشتی:- وحدۃ الوجود کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ واجب الوجود کے سوا موجود بالذات حقیقت میں کوئی نہیں، وجود حقیقی صرف اور صرف اسی کا ہے، جو ہر اعتبار سے حلول واتحاد اور شرکت ودوئی سے پاک ومنزہ ہے- **قل ھو اللہ احد ،ولم یکن لہ کفوا احد** اللہ تھا اور نہیں تھی اس کے سوا کوئی شئ **کان اللہ ولم یکن معہ شئ غیرہ** وہ اپنی ذات وصفات میں تغیر وتبدل سے پاک ہے الآن کما کان اب بھی وہ ایسا ہے جیسا کہ تھا ؎

محال تھا کوئی ہوتا یہاں سوا اس کے
یہ کل جہان ہے منت پذیر کم نظری

جو بھی کائنات میں نظر آ رہا ہے ؎

سب کمال نگہ ساقی میخانہ ہے
موج مے ہے نہ صراحی ہے نہ پیمانہ ہے

یہ تصور کہ وحدۃ الوجود ہندو فلسفہ سے ماخوذ ہے ہر گز درست نہیں- یہ تو خالص ایمان اور حقیقی اسلام ہے کہ موجود بالذات صرف اور صرف اللہ ہے، وہی حاضر ہے، وہی ناظر ہے، وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے، وہی مالک الملک وحدہ لا شریک لہ ہے- حقیقت میں صرف وہی مطاع اور حاکم ہے، ارادہ اور مشیت ہے تو صرف اسی کا ہے، فاعل مطلق ہے تو صرف وہی ہے، کتاب وسنت کے مطابق لاموجود الا اللہ کے

معنی یہی ہیں-واجب الوجود کے سوا جو بھی وجود ہے ممکن الوجود ہے، باقی صرف اور صرف
اسی کی ذات ہے جو واجب وقدیم ہے" **کل من علیها فان ویبقی وجه ربک
ذوالجلال والاکرام**"

ممکن الوجود پر نظر کے اعتبار سے "ہمہ از اوست" یعنی ہمہ تجلیات از اوست-اور
واجب الوجود پر نظر کے اعتبار سے "در ہمہ تجلیات متجلی خود اوست"

سوال:-وحدۃ الوجود لوگوں کو منجمد کرتا ہے، اس رائے سے آپ کہاں تک اتفاق
کرتے ہیں؟

شیخ ابوسعید چشتی:-ہم اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں رکھتے، اس لیے کہ وحدۃ
الوجود ایک حال ہے جو سالک پر طاری ہوتا ہے غیر سالک اس کی حقیقت سے ناواقف ہوتا
ہے، سالک اس حال میں اپنی ذات سے فانی اور حق سے باقی ہوتا ہے، وہ اپنی مرضی سے
کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ اس کا ہر فعل اللہ کے ارادہ ومشیت کے تحت صادر ہوتا ہے-سالک
اس حال میں ایک آلہ کی مانند ہوتا ہے اور حق تعالیٰ فاعل ہوتا ہے۔

اختیارم چوں قلم باشد بدست ذات او
کار او کار من است وکار من کار اوست

سوال:-موجودہ دور میں خانقاہیں دعوت وتبلیغ میں کیا کردار ادا کرسکتی ہیں؟

شیخ ابوسعید چشتی:-موجودہ دور روحانی اضطراب اور بے چینی کا دور ہے، ہر عام
وخاص روحانی سکون کی تلاش میں ہے اور صحیح رہنمائی نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں
افراد آئے دن گمراہ ہو رہے ہیں، انسان اختلافات سے دور ہو کر پرسکون اطمینان بخش
زندگی کا متلاشی ہے مطلوب تک رسائی کے درست طریقے ہاتھ نہ آنے کی بنیاد پر اکثر لوگ
"وحدۃ ادیان" کا قول کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو بلاشبہ گمراہی ہے، ایسا صرف اس لیے
ہو رہا ہے کہ خانقاہیں متحرک نہیں ہیں، خانقاہیت کا مقصد فوت ہو گیا ہے، اکثر خانقاہوں
میں شیروں کی جگہ لومڑیوں نے لے لی ہے۔

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

آج بھی اگر تمام خانقاہیں مکمل طور سے فعال ہو جائیں تو خانقاہوں کا برپا کیا
ہوا ایمانی وروحانی انقلاب تمام عالم پر چھا جائے-

دعوت وتبلیغ کے لیے یہ دور ادوار ماضیہ سے زیادہ مناسب ہے، دعوت واصلاح کے
میدان میں جن دشواریوں کا سامنا ہمارے متقدمین صوفیہ کو رہا وہ دشواریاں ہمارے لیے
نہیں ہیں- بلکہ ذرائع ووسائل کی فراہمی کے سبب موجودہ دور میں دعوت وتبلیغ کا کام آسان
سے آسان تر ہو گیا ہے، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ موجودہ دور میں خانقاہیں دعوت وتبلیغ
کے میدان میں اہم کلیدی رول ادا کرسکتی ہیں شرط ہے کہ خانقاہیں حقیقت میں خانقاہ ہو
جائیں اور خانقاہوں میں رہنے والے حضرات مکارم اخلاق کے سانچے میں اپنے آپ کو
ڈھال کر صداقت وامانت کا پیکر بن جائیں-

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

سوال:-آپ خانقاہیت اور درگاہیت میں کسی تفریق کے قائل ہیں؟

شیخ ابوسعید چشتی:-نام سے کچھ نہیں ہوتا نیت اور خلوص سے ہوتا ہے۔

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

نام کچھ بھی رکھ دیا جائے کام اچھا ہو تو اچھا، ورنہ نہیں، خانقاہیت کو درگاہیت کہا جائے
یا درگاہیت کو خانقاہیت کہا جائے بات برابر ہے، اپنی اپنی اصطلاح ہے، جیسے مسلسل
اعتکاف کرنے کو رہبانیت کہے یا وہ رہبانیت جو ربانیت کا سبب بنے اعتکاف مسلسل کا نام
دے دے، ایک انسان تجارت میں غرق ہے اور مقصد ہے کہ جو مال حاصل ہو گا دین کی
اشاعت میں صرف کروں گا، تو یہ انسان اس عابد شب زندہ دار سے بہتر ہے جو عابد شمار
ہونے کے جذبہ کے تحت عبادت کرتا ہے، حالانکہ ظاہر برعکس ہے-کمال صرف نیت وارادہ
کا ہے "**انما الاعمال بالنیات**"

سوال :-تصوف اور تفقہ میں باہم کیا رشتہ ہے؟ اور ایک خانقاہ اور ایک مدرسے میں کیا تعلق ہونا چاہیے؟

شیخ ابوسعید چشتی :-تعلق باللہ پیدا کرنے کے لیے نفس کے تزکیہ کا نام تصوف ہے اور تعلق باللہ کے لیے غور وفکر کے ذریعے علوم وذرائع کی تفتیش وتحقیق کا نام تفقہ ہے گویا کہ تفقہ ایک تفکیری عمل ہے اور تصوف اس تفکیری عمل کا عملی سلوک ہے، اسے یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ تفقہ عمارت کے تعمیری لوازمات ومنسلکات ہیں اور تصوف تعمیری عمل ہے -تفقہ اور تصوف دونوں کا مطلوب ومقصود ایک ہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دونوں دو الگ الگ مرحلے کا نام ہے-

مدارس وخانقاہ دونوں کا مدعا ومطلوب بہر حال ایک ہے مگر دونوں کے کام الگ الگ ہیں نوعیت کار بدلی ہوئی ہے، اسی تبدیلی کے سبب دونوں میں فرق نظر آتا ہے مگر واضح رہے کہ دونوں غیر مربوط نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متعلق ہیں، اس لیے کہ مدرسہ علوم وفنون کے حصول کی جگہ ہے اور خانقاہ ان علوم کو تعلق باللہ کے لیے عملی شکل دینے کی جگہ-

تفقہ وتصوف اور مدرسہ وخانقاہ کا باہمی ارتباط اس طرح ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ناقص ونامکمل ہیں- اگر کوئی صرف تفقہ میں لگ جائے اور تصوف سے علاحدگی اختیار کرلے تو ناپختہ اور دم بریدہ ہے، ایسے ہی جو کوئی تفقہ کے بغیر تصوف میں غرق ہو تو وہ گمراہ وزندیق ہوسکتا ہے- اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص تلاش منزل میں نامعلوم راستہ پر چل پڑے-

اس لیے تفقہ اور تصوف دونوں کو ایک دوسرے سے الگ تصور کرنا غلط ہے- ان کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے امام مالک کا یہ قول نہایت جامع ہے "**من تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن جمع بينهما فقد تحقق**" (جس نے فقہ حاصل کیا اور صوفی نہیں بنا وہ فاسق ہوگیا اور جو صوفی بنا مگر فقہ حاصل نہیں کیا وہ زندیق ہوگیا اور جس نے دونوں چیزیں حاصل کرلیں اس نے حقیقت کو پالیا-) اور امام اعظم کا ارشاد فرمانا "نعمان ہلاک ہوگیا ہوتا اگر دو سال جعفر صادق رضی اللہ

عنہ کی صحبت میں نہ رہتا"-

سوال:-تصوف اور صوفیہ کا مستقبل کیا ہے؟ کیا تصوف کا دور ختم ہوگیا؟

شیخ ابوسعید چشتی:-"ماہمانیم کہ بودیم وہماں خواہد بود" تصوف کا دور تھا، ہے اور رہے گا-تصوف کا کام ہے انسانی روحوں کو سکون فراہم کرنا، معاشرہ کو پرامن بنانا اور بندوں کا تعلق ان کے رب حقیقی سے جوڑنا، انسانیت کو اس کی ہمیشہ ضرورت ہے، جب دنیا میں بد امنی وانتشار کا ماحول پیدا ہوتا ہے تو انسانیت بلبلا اٹھتی ہے اور سکون واطمینان کی متلاشی ہوتی ہے، مالک حقیقی کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی ہے اور اس کا مداوا صرف اور صرف تصوف ہے- بلاشبہ تصوف کا دور باقی رہے گا اور جب تک تصوف رہے گا صوفیہ پیدا ہوتے رہیں گے- جب جب انسانوں کو کسی مربی اور مرشد کی ضرورت ہوگی اللہ تعالیٰ ایسے افراد دنیا میں بھیجتا رہے گا، اس کی رحمت کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں-

عالمی تناظر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تصوف اور صوفیہ کا مستقبل اچھا اور روشن ہے، کیونکہ آج کا انسان داخلی وخارجی اضطراب سے عاجز آکر روحانی سکون کی تلاش میں ہے اور یہی وہ وقت ہے جہاں صوفیہ کی ضرورت بڑھ جاتی ہے-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

شیخ ابوسعید چشتی:- ماہنامہ جام نور مذہبی رسائل میں اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتا ہے، ہر ماہ علمی، تحقیقی اور اصلاحی مواد پیش کرتا رہتا ہے- قارئین "**خذ ما صفا ودع ما كدر**" پر عمل کرتے ہوئے اس سے استفادہ کریں- ماہنامہ کے ذمہ داروں سے گزارش ہے کہ وہ صدق واخلاص کے ساتھ اس دینی مشن پر قائم رہیں اور اس رسالے کو دنیا کے بجائے آخرت کا توشہ بنائیں- اللہ ہم سب کو شریعت حقہ پر عمل کرتے ہوئے ارادت کاملہ کے ساتھ صوفیہ کی خدمت کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے- **آمین بجاہ سید المرسلین** ❑❑❑

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۹ء)

مولانا احمد القادری مصباحی

بانی وسربراہ اسلامک اکیڈمی، امریکہ

مولانا احمد القادری مصباحی کا شمار ذی علم شخصیات میں ہوتا ہے-آپ کی پیدائش ۱۲ر رجب ۱۳۷۸ھ ضلع اعظم گڑھ یوپی کے ایک گاؤں ''بھیرہ ولید پور'' میں ہوئی- ابتدائی تعلیم کے بعد حفظ قرآن کے لیے مدرسہ اشرفیہ ضیاء العلوم خیرآباد گئے اور تکمیل الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں کی، یہیں سے قرات حفص اور درس نظامی کی سند بھی اعلی پوزیشن کے ساتھ ۱۹۸۳ء میں حاصل کی-علم حدیث وفقہ اور طریقت میں بھی متعدد اکابر سے آپ کو اجازت حاصل ہے- فراغت کے بعد بالترتیب دارالعلوم قادریہ، چریا کورٹ، دارالعلوم اشرفیہ ضیاء العلوم خیرآباد، مدرسہ مدینۃ العلوم بنارس اور پھر اخیر میں الجامعۃ الاشرفیہ میں تدریسی خدمات سے منسلک رہے-مولانا احمد القادری بہترین مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ داعیانہ خوبیوں سے بھی متصف ہیں، انہیں خوبیوں کی وجہ سے ۱۹۹۵ء میں افریقہ کا سفر کیا- یہاں آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کے دوران تقریباً ایک سو افراد آپ کے ہاتھ پر اسلام سے مشرف ہوئے-اسی غرض سے ۱۹۹۷ء میں امریکہ کا سفر کیا-یہاں پہنچ کر آپ نے ''اسلامک اکیڈمی'' کی بنیاد رکھی، اکیڈمی کے تحت حفظ وقراءت، افتاء وارشاد اور درس نظامی جیسے اہم شعبے ہیں اور تاحال اس کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں-مولانا تبلیغ وتدریس کے ساتھ ساتھ فقہ وافتاء میں بھی اچھا درک رکھتے ہیں، امریکہ پہنچ کر انہوں نے سمت قبلہ، اوقات نماز جیسے بڑے بڑے مسئلوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے-ان سب کے ساتھ ایک اچھے قلمکار بھی ہیں، اب تک ان کے تقریباً نصف درجن تراجم اور رسالے شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں-

سوال :-مشرق کی ایک عظیم دانش گاہ الجامعۃ الاشرفیہ کے منصب تدریس کو چھوڑ کر مغرب میں منصب دعوت وتبلیغ سنبھالنے کے بعد آپ نے کیسا محسوس کیا؟

مولانا احمد القادری:-الجامعۃ الاشرفیہ اپنا مادر علمی ہے، وہاں جو سہولتیں حاصل ہیں، یہاں کہاں میسر؟ وہاں طلبہ اور شائقین علم دین کی کثرت ہے-گنجائش نہ ہونے کے سبب کتنے طلبہ اشرفیہ سے واپس ہوتے ہیں، یہاں طالبان دین چراغ لے کر تلاش کرنے سے بھی ضرورت کے مطابق نہیں مل پاتے- وہاں مشفق اساتذہ کرام کی سرپرستی حاصل ہے، پیچیدہ عبارات اور علمی مسائل میں ان کی رہنمائی مل جاتی ہے اور یہاں سب مفقود ہے- وہاں کام کرنے کے لیے بنی بنائی فیلڈ موجود ہے اور یہاں بنانا ہے- وہاں درس وتدریس کا ایک بنا بنایا ماحول ہے، یہاں ماحول سازی کرنی ہے، وہاں جامعہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ذرائع آمدنی پیدا کرنے کی فکر اساتذۂ کرام کو نہیں کرنی ہے، اس کے لیے مخلص انتظامیہ کا پورا عملہ موجود ہے اور یہاں خود ہی سب کچھ کرنا ہے-

یہاں کے لیے یہ مثل صادق آتی ہے-کنواں کھودو، پانی نکالو

گویا پہلے یہاں کنواں تیار کرنا ہے پھر اس سے پانی نکال کر اپنی علمی پیاس بجھانی ہے اور وہاں کنواں موجود ہے، اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں نکالنا ہے-مخلص طلبہ کی ایک قطار پانی لیے کھڑی ہے، بس پینا ہے-بعض لوگ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے، شائقین طلبہ درس گاہ میں اسباق کے لیے حاضر ہیں اور معلم صاحب باہر کہیں گپ شپ میں مصروف ہیں -زمانہ امتحان آگیا، حاضر رہتے ہوئے نصاب تعلیم مکمل نہیں ہوپاتا جبکہ دیگر مخلصین اساتذہ کا نصاب امتحان سے بہت پہلے ہی پورا ہوچکا ہوتا ہے-

ہم نے محسوس کیا کہ کوئی دینی علمی انقلاب لانے کے لیے یہاں خود ہی کچھ کرنا ہوگا- اسی احساس کے پیش نظر ۲۰۰۱ء میں داعی اسلام حضرت مولانا بدر القادری صاحب دامت برکاتہم ہالینڈ کی سرپرستی میں اسلامک اکیڈمی کا قیام کرایہ کے ایک سینٹر میں عمل میں آیا- پھر آگے چل کر ۲۰۰۳ء میں عزیز ملت حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب قبلہ سربراہ اعلی الجامعۃ

الاشرفیہ مبارک پور جن دنوں امریکہ تشریف لائے تھے ان کی دعاؤں کے ساتھ اسلامک اکیڈمک کے زیر اہتمام دارالعلوم عزیزیہ کرایہ کی ایک بلڈنگ میں قائم ہوا- مشرق میں دینی علمی انقلاب برپا کرنے والی عظیم شخصیت الجامعۃ الاشرفیہ کے بانی حافظ ملت مولانا عبدالعزیز محدث مبارکپوری علیہ الرحمہ کے اسم گرامی سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام دارالعلوم عزیزیہ رکھا گیا، پھر حافظ ملت کا فیضان رنگ لایا اور ۲۰۰۳ء میں ایک ایکڑ سے زائد وسیع وعریض زمین لب روڈ خاص درمیان شہر خریدی گئی اور حافظ ملت علیہ الرحمہ ہی کے اول ترین شاگرد حضرت مولانا قاری مصلح الدین علیہ الرحمہ کے داماد وخلیفہ پیر طریقت حضرت علامہ سید شاہ تراب الحق قادری دامت برکاتہم نے ۶؍مئی ۲۰۰۷ء کو اپنے مبارک ہاتھوں سے دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا اور چند ہی ماہ بعد ۱۲؍اگست ۲۰۰۷ء میں حافظ ملت علیہ الرحمہ کے ایک بڑے لائق اور قابل فخر تلمیذ رشید حضرت مولانا قمر الزماں اعظمی دامت برکاتہم جنرل سکریٹری ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ کے مبارک ہاتھوں دارالعلوم کی نئی بلڈنگ کا افتتاح عمل میں آیا- زمین کی خریداری سے بلڈنگ تک انڈین کرنسی سے تقریباً پونے دو کروڑ روپے خرچ ہو چکے ہیں اور دارالعلوم کے منصوبے کے مطابق تقریباً ۸؍کرور روپے کا تعمیری کام ابھی باقی ہے- اللہ کرے جلد اس کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے- آمین-

الحمد للہ! افتتاح کے دن سے اب تک دارالعلوم اپنی خود کی بلڈنگ میں بحسن وخوبی چل رہا ہے- جس سے یہ محسوس ہوا کہ اگر محنت اور خلوص سے کام کیا جائے تو بنجر زمین بھی آباد ہو سکتی ہے-

نہ ہو مایوس اے اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

سوال:- برصغیر ہندو پاک میں اہل سنت وجماعت کو نوزائیدہ فرقوں اور جماعتوں کے ساتھ ہمہ وقت تصادم اور تکرار کی صورت ہے، کیا امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں بھی یہی حال ہے، یا صورت حال کچھ مختلف ہے؟

مولانا احمد القادری:- برصغیر ہی کی طرح یہاں بھی فرق باطلہ سے تصادم رہتا ہے مگر

یہاں کی صورت قدرے مختلف ہے-

وہاں گرم وسرد ہر طرح کی جنگ رہتی ہے، کبھی زبانی تصادم ہوتا ہے کبھی قلمی- کبھی اینٹ پتھر کی نوبت آجاتی ہے اور کبھی کبھی قتل وقتال اور خوں ریز جنگ بھڑک اٹھتی ہے، یہاں زیادہ تر زبانی یا قلمی تصادم ہوتا ہے- ظاہری جنگ وجدال کے بغیر اپنی تحریک مضبوط کرنے کی کوشش میں ہر فرقہ سرگرم عمل ہے، مگر باطل پرست اہل حق سے بغض وعناد اور در پردہ دشمنی ضرور رکھتے ہیں اور اہل حق کی سعی اور ان کی تحریک ناکام بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں- اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے- آمین

سوال:- مغرب میں فتنۂ قادیانیت کا زور کتنا ہے اور کیا اہل حق اس کے مقابل قابل قدر دفاعی جہاد فرما رہے ہیں؟

مولانا احمد القادری:- اہل حق کے لیے قادیانیت سے زیادہ خطرناک وہابیت اور اس سے زیادہ دیوبندیت ہے- قادیانیت کا اثر کم لوگ قبول کرتے ہیں، وہابیت کا زیادہ اور اس سے زیادہ دیوبندیت کا- کیونکہ مسلمانوں کو معلوم ہے کہ ہمارے خاتم پیغمبراں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا اور قادیانی غلام احمد کو نبی مانتے ہیں اس لیے مسلمان ان سے ہوشیار رہتے ہیں-

برخلاف وہابیت اور دیوبندیت کے، یہ لوگ اپنے کو اہل سنت کہتے اور لکھتے ہیں- عام مسلمان جوان کے توہین رسالت کے عقائد سے واقف نہیں ہوتے انہیں بھی حق پرست اور سنی سمجھ کر ان کی تحریک میں شامل ہو کر ان کے دست وبازو بن جاتے ہیں- پھر رفتہ رفتہ ان کی تحریک کا حصہ بن کر اپنے اسلاف، اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے مسلک سے منحرف اور باغی بن کر شدید مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں- اس لیے اہل سنت کو اپنے اس قریبی اور خطرناک حریف سے ہوشیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے-

سوال:- یہ بات کہی جارہی ہے کہ مغرب اب مشرق خصوصاً اسلام کی طرف بڑھ رہا ہے اور آنے والا دور مغرب کا نہیں، مشرق کا ہے، اس رائے سے کہاں تک اتفاق رکھتے ہیں؟

مولانا احمد القادری:- یہ بات تو ظاہر ہے کہ دین پر عمل اور اس کی دعوت- عقائد و

نظریات اہل سنت کی ترویج واشاعت مغرب میں مشرق سے زیادہ آسان ہے- اسلام کی دعوت پیش کرنے، قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی ہے، ہندوستان میں دستور ہند کے مطابق مذہبی آزادی ضرور حاصل ہے مگر عملاً پوری آزادی نہیں، تحریر تک محدود ہے- وہاں اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرے تو اس کا یہ بنیادی حق تسلیم نہیں کیا جاتا، وہ ہر قسم کی اذیت سے دوچار ہوتا ہے، بلکہ جس مسلمان کے ہاتھ پر قبول اسلام کیا ہے اس پر بھی سختی ہوتی ہے- عرب شریف میں عقائد اہل سنت کی ترویج واشاعت تو بڑی بات ہے معمولات اہل سنت پر کڑی نگرانی ہوتی ہے- سعودی حکمران اور ان کے کارندے مسلمانوں کو اپنے نبی کا کھل کر یوم ولادت بھی منانے نہیں دیتے جبکہ پوری دنیا میں اس وقت جشن میلاد منایا جاتا ہے-

یہاں کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں بھی مذہبی آزادی ہے، مسلمان طلبہ اگر اپنا اسلامی لباس استعمال کریں اور طالبات حجاب کے ساتھ حاضر ہوں تو انہیں اس سے روکا نہیں جاتا- انہیں اس کی قانوناً اجازت ہے، نماز پڑھنے کی بھی اجازت مل جاتی ہے-

اسلامی مراکز، مدارس، مساجد وغیرہ کے قیام پر پابندی نہیں- لہٰذا اگر ہم اپنی اسلامی تہذیب وثقافت اور احکام شریعت پر عمل پیرا ہوں اور دوسروں کو بھی خوش اسلوبی اور حکمت و نصیحت سے دامن اسلام کی پناہ میں آنے اور اس سے ہمیشہ وابستہ رہنے کی دعوت دیتے رہیں اور خوب محنت کریں تو مغربی تہذیب کا اسلامی تہذیب میں بدل جانا ناممکن نہیں-

ہے عیاں قصہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

سوال: -آپ کی ویب سائٹ کافی معلوماتی اور سہل الاستعمال ہے، سوال یہ ہے کہ جن امیدوں اور خیالوں کے ساتھ آپ نے اسے شروع کیا تھا، اس کے ناظرین کے ردعمل کے بعد آپ نے اسے کتنا نتیجہ خیز پایا- نیز یہ بھی بتائیں کہ حق کی ترویج واشاعت کے لیے مزید کس قسم کی ویب سائٹوں کی ضرورت آپ محسوس کرتے ہیں؟

مولانا احمد القادری: -الحمدللہ! اپنی ویب سائٹ islamic academy.org کو امید سے زیادہ نتیجہ خیز پایا- یہ چند سال قبل شروع ہوئی اور آج ۳ رمئی کی تازہ ترین

Ranking.com کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا کی سنی ویب سائٹوں میں اول نمبر ہے اور دنیا بھر کی اسلامک ویب سائٹوں میں ٹریکنگ کے اعتبار سے چوتھے نمبر پر اور Trust Gauge میں اول نمبر پر ہے-

دنیا کی 3,593 ویب سائٹوں نے اپنی سائٹ پر اسلامک اکیڈمی کا لنک لگا رکھا ہے، کسی زمانہ میں ہم لوگوں سے درخواست کرتے تھے کہ برائے کرم ہماری سائٹ کا لنک اپنی سائٹ پر ڈال دیں- اب الحمدللہ خود سے یہ مقبولیت حاصل ہوئی-

دنیا کے ہر سرچ انجن میں اسلامک اکیڈمی ٹائپ کر کے اسے دیکھ سکتے ہیں- وہابیوں کی بڑی بڑی تنظیموں کو لاکھوں نمبر پیچھے چھوڑ دیا ہے- ۳ رمئی کی تازہ ترین Alexa.com کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کے اندر وہابیوں کی سب سے بڑی تنظیم (ISNA) 173,664 نمبر اسلامک اکیڈمی سے پیچھے ہے- اور دیوبندیوں کی سب سے بڑی US تنظیم (ICNA) کو 488,654 نمبر پیچھے لائن میں چھوڑ کر اسلامک اکیڈمی آگے نکل چکی ہے-

اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ گزشتہ سال تقریباً ۳۵ ملین (۳ کروڑ پچاس لاکھ) Hits ہوئی تھیں- ایک لاکھ افراد کے قریب ماہانہ آتے ہیں رمضان میں یہ تعداد کئی گنا بڑھ جاتی ہے، دوسو سے زائد ملکوں سے بذریعہ ای میل سوالات آتے ہیں، بے شمار ملکوں سے لوگ فون کر کے اپنے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں- بہت سے ممالک میں اسلامی معلومات کے حوالہ سے ٹی وی پر اسلامک اکیڈمی کا نام دیتے ہیں اور وہاں سے نام سن کر ہمارے پاس لوگ ای میل کرتے ہیں- مذکورہ بالا تازہ رپورٹ ہمارے ویب مانیٹر محترم جناب محمد طاہر شفیع صاحب قادری نے فراہم کی ہے، جن کی پرخلوص محنتوں کا یہ نتیجہ ہے-

حق کی ترویج واشاعت کے لیے ہم تین قسم کی ویب سائٹ کی شدت سے ضرورت محسوس کرتے ہیں-

۱- انٹرنٹ کا مدرسہ: جہاں باضابطہ نصاب تعلیم تیار کر کے اسلامی علوم وفنون کی عقائد اہل سنت کے مطابق تعلیم دی جائے-

٢-انٹرنٹ کا دارالافتاء: جہاں دنیا بھر سے آنے والے سوالوں کے جوابات کے لیے مفتیان کرام کی ایک ماہر ٹیم موجود ہو جو عقائد وعبادات ومعاملات وغیرہ سے متعلق آنے والے ہر قسم کے سوالوں کے جوابات عقائد اہل سنت اور فقہ حنفی کے مطابق انٹرنٹ کے ذریعہ بھیج سکیں- گمراہ کن ویب سائٹ دیکھ کر شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جانے والے ناظرین کے ذہن وفکر میں سنی عقائد ونظریات ان کے دلائل وبراہین کے ساتھ ڈال سکیں اور ان کے وسواس دور کر کے حق وہدایت کی راہ دکھا سکیں-

ہماری ویب سائٹ اس پر کام کر رہی ہے- الحمد للہ! اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے ہدایت پائی اور گمراہی سے نجات حاصل کی- مگر اس پر بڑے پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ہے-

٣-غیر مسلمین اور نو مسلمین کے لیے ویب سائٹ: جس پر انہیں اسلام کے محاسن بتائے جائیں اور اسلام کی دعوت دی جائے- نئے اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں کے لیے تعلیم کا بندوبست ہو- جو غیر مسلمین اسلام سے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر حق کی تلاش میں سوال کرتے ہیں، انہیں شافی جواب دے کر مطمئن کیا جا سکے اور راہ حق دکھائی جا سکے-

الحمد للہ! ہماری ویب سائٹ کے ذریعہ کتنے غیر مسلموں نے راہ ہدایت پائی اور مسلمان ہو کر اسلام کے پر امن دامن سے وابستہ ہو گئے-

سوال:-الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں دوران تدریس آپ علمی وتحقیقی مشاغل میں بھی مصروف تھے، امریکہ جانے کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا یا منقطع ہو گیا؟

مولانا احمد القادری:-الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی علمی وتحقیقی مجلسوں کا جواب کہاں؟ پھر ویسی محفلیں کہاں مل سکیں تاہم حافظ ملت اور اشرفیہ کے فیضان سے دارالعلوم، دارالافتاء اور درس نظامی کی بنیاد ڈال کر علمی مشاغل میں مصروف رہنے کی کوشش جاری ہے-

١٩٩٧ء میں امریکہ آتے ہی سب سے پہلا تحقیقی مسئلہ قبلہ کا درپیش ہوا- شکاگو میں اہل سنت کا ایک گروہ شمال مشرق نماز پڑھتا دوسرا جنوب مشرق، تحقیق وتخریج سے یہ مسئلہ

ثابت ہوا کہ امریکہ کا قبلہ شمال مشرق ہے- جنوب مشرق قبلہ بتانا درست نہیں، اس سلسلے میں سیدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے رسالہ ''**کشف العلۃ عن سمت القبلۃ** جو اس وقت زیور طبع سے آراستہ نہ تھا''، قلمی نسخہ کا عکس حضرت مولانا عبد الستار ہمدانی صاحب گجرات کی عنایت سے حاصل ہوا اور فاضل معقولات ومنقولات حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین کا فتوی جو درحقیقت کشف العلۃ ہی کی روشنی میں تحریر کیا گیا تھا بڑا کام آیا- الحمد للہ! ان کی برکت وفیضان سے یہ اختلاف دور ہوا اور لوگ ایک قبلہ پر متفق ہو گئے-

اعلیٰ حضرت کے خلیفہ حضرت مولانا ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ کی کتاب الجواہر والیواقیت فی علم التوقیت معروف بہ توضیح التوقیت کے فارمولے کے مطابق، امریکہ اور ایشیا کے بے شمار شہروں کے قبلہ کا ڈائرکشن کمپیوٹر کی مدد سے تخریج کر کے ہماری ویب سائٹ پر ڈال دیا گیا ہے-

دوسرا تحقیقی مسئلہ نمازوں کے اوقات کا تھا، اس وقت یہاں جو نماز ٹائم ٹیبل رائج تھا اس میں فجر کا وقت ہو جانے کے بعد لوگ سحری کھا رہے ہوتے، وقت مغرب ہی میں عشاء پڑھ لیتے، ظہر کے وقت میں عصر حنفی ہونے سے پہلے مثل اول پر حنفی حضرات بھی نماز عصر ادا کر لیتے- اس مسئلہ پر تحقیق شروع ہوئی اور حضرت مولانا مفتی سید افضل حسین مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی مرکز اہل سنت منظر الاسلام بریلی شریف کی کتاب **زبدۃ التوقیت** سے نمازوں کے اوقات کی تخریج ہوئی پھر کمپیوٹر کی مدد سے ہزاروں شہروں کے دائمی نظام الاوقات تخریج کر کے ہماری ویب سائٹ پر ڈال دیے گئے ہیں- الحمد للہ! بے شمار سنی مساجد ومدارس اور عوام نے اسے قبول کر کے اپنی نمازوں کی اصلاح کر لی ہے-

سوال:-آپ ایک عظیم الشان ادارے کی تعمیر کا منصوبہ بھی رکھتے ہیں، جس کا علم ہمیں آپ کی ویب سائٹ سے ہوا، اس زیر تعمیر ادارے کا اجمالی خاکہ کیا ہے، یعنی اس کے تحت آپ کس انفرادی نوعیت کی خدمات انجام دینا چاہتے ہیں؟

مولانا احمد القادری:-اسلامک اکیڈمی اسلام وسنت کی نشر واشاعت کے لیے امریکہ میں قائم ہوئی- اس وقت اس کے متعدد شعبے ہیں-

دارالعلوم عزیزیہ: -امریکہ کا پہلا واحد دارالعلوم ہے جہاں درس نظامی کی تعلیم ہوتی ہے-

مدرسۃ البنات: -یہ لڑکیوں اور خواتین کا شعبہ ہے جہاں ان کو علیحدہ معلمات تعلیم دیتی ہیں-

دارالفتوی: -یہاں انٹرنٹ، خط، فون اور ای میل کے ذریعہ دنیا بھر سے آنے والے مذہبی سوالوں کے جوابات دیے جاتے ہیں-

ویکلی اجتماع: -اصلاح معاشرہ کے لیے ہر ہفتہ درس اور ذکر الٰہی کی محفل ہوتی ہے، اس میں شریعت کے ساتھ طریقت کے مسائل بھی سکھائے جاتے ہیں-

یوتھ اجتماع: -نوخیز بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے یہ ماہانہ اجتماع ہوتا ہے- والدین کو اس اجتماع سے بڑی دلچسپی رہتی ہے، وہ اپنے بچوں کے ساتھ خود بھی شریک ہوتے ہیں-

لیڈیس اجتماع: -خواتین اور بچیوں کی اصلاح و تربیت کے لیے دارالعلوم کی معلمات کے زیر نگرانی ہر ماہ پردے کے اہتمام کے ساتھ ان کا یہ مخصوص اجتماع ہوتا ہے جس میں مردوں اور بچوں کی شمولیت کی اجازت نہیں ہوتی-

اسلامک ویب سائٹ: -انٹرنٹ کے ذریعہ جدید طرز پر اسلام کا آفاقی پیغام نشر کرنا، اسلام و سنت کی نشر و اشاعت کرنا، نئی نسل کو قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم دینا، عقائد اہل سنت سے دنیا بھر کو روشناس کرانا، باطل فرقوں اور ان کے خطرناک عقائد و نظریات سے مسلمانوں کو ہوشیار کرنا علمائے اہل سنت کے لٹریچرس فراہم کرنا- اس کے زریں مقاصد ہیں-

پورا قرآن مجید سیدی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے ترجمہ کنز الایمان کے ساتھ بہت ہی اچھی آواز میں ڈالا گیا ہے، اب تک بے شمار لوگ اپنے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کر کے سنتے ہیں- اس کے علاوہ بے شمار چیزیں ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں- پتہ یہ ہے:

WWW.ISLAMICACADEMY.ORG

اسلامک اکیڈمی کے منصوبے

مسجد: -ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر جہاں مسلمانان اہل سنت نماز جمعہ، پنج گانہ اور عیدین وغیرہ اپنے مسلک کے مطابق ادا کرسکیں-

اسلامک اسکول: -ایک شاندار درسگاہ جہاں عصری علوم اور اسکولوں کے بنیادی نصاب کے ساتھ اسلام و سنیت اور عالم کورس کی طلبہ طالبات کو غیر مخلوط تعلیم دی جائے- تاکہ وہ بیک وقت دینی اور دنیوی دونوں تعلیم سے مستفید ہوسکیں- بلفظ دیگر ایک جامعۃ البنین ہو، جہاں لڑکوں کو تعلیم دی جائے اور ایک الگ جامعۃ البنات ہو جو لڑکیوں کے ساتھ مخصوص ہو-

ہاسٹل: -جہاں بیرون شہر کے طلبہ قیام کر کے اطمینان سے تعلیم حاصل کرسکیں-

چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں

زہے وہ پھول جو گلشن بنائے صحرا کو

سوال: -جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا پیغام؟

مولانا احمد القادری: -جام نور جماعت اہل سنت کا ترجمان، فیض العارفین کا فیضان، رئیس القلم کا ملت پر احسان اور ان کی تاریخی یادگار ہے- جام نور مولانا خوشتر نورانی کے علم و عرفان کا عظیم ثمرہ، ان کے رفقا کی کاوشوں کا نتیجہ اور ارباب قلم کا ملی سرمایہ ہے- جام نور خود اپنی تنقید چھاپ دینے والا اور تنقید کا تلخ جام رغبت سے پی جانے والا منفرد ماہنامہ ہے-

اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رکھے، نظر بد سے محفوظ فرمائے اور دن بدن، سال سال ترقی عطا فرمائے، آمین- □□□

(شمارہ جون ۲۰۰۸ء)

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

ولی عہد خانقاہ عالیہ قادریہ، بدایوں (یوپی)

۱۵/ جولائی ۲۰۰۴ء کو مصر سے محبّ محترم مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری نے یہ خبر دی کہ وہ جامعہ ازہر مصر سے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے یکم اگست ۲۰۰۴ء کو اپنے وطن ہندوستان تشریف لا رہے ہیں- مولانا قادری، صاحب علم بھی ہیں اور صاحب نسبت بھی- آپ کی پیدائش بدایوں کے مشہور عثمانی خانوادے میں ۱۹۷۵ء میں ہوئی، جو خانوادہ پچھلی آٹھ صدیوں سے ملت کی علمی و روحانی قیادت کر رہا ہے- آپ تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی اور مفتی اعظم دکن مملکت آصفیہ مولانا عبدالقدیر بدایونی کے پوتے ہیں- موصوف کی ابتدائی تعلیم اپنے موروثی ادارے مدرسہ قادریہ میں ہی اپنے والد حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادہ خانقاہ قادریہ اور دیگر اساتذہ کے ذریعے ہوئی، حفظ قرآن کے بعد آپ نے درس نظامیہ کی تکمیل بھی اسی ادارے سے کی، مزید تحقیق کے لیے چند سال مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی کی درس گاہ میں گزارے اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۹۸ء میں جامعہ ازہر مصر چلے گئے، جہاں اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران علوم تفسیر و قرآن میں تخصص کر کے ''الاجازۃ العالیۃ'' کی سند حاصل کی نیز دارالافتاء المصریہ میں ایک سالہ تربیت افتا کی تکمیل بھی کی- ہندو پاک میں خانقاہوں کے علمی و روحانی انحطاط کے اس دور میں موصوف کی بلند پایہ فکر، علمی اٹھان، تحقیقی مزاج اور قابل تقلید موروثی اوصاف یقیناً آج خانقاہی شہزادوں کے لیے قابل رشک ہیں- آپ کو عرب و عجم کے شیوخ سے حدیث اور مختلف سلاسل کی اجازت بھی حاصل ہے- آپ کی اہم تصانیف میں 'قرآن کریم کی سائنسی تفسیر اور' حدیث افتراق امت' قابل ذکر ہیں-

سوال:- جامعہ ازہر کا قیام کب اور کس کے ہاتھوں ہوا؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- چوتھی صدی ہجری میں فاطمی خلفاء نے قاہرہ میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کی تھی اور اس کا نام جامع الازھر رکھا گیا تھا اس مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا- خلافت فاطمیہ کے زوال کے بعد بھی اس میں درس و تدریس ہوتی رہی آہستہ آہستہ اس کی شہرت ہوتی گئی اور پھر یہ طالبان علوم اسلامیہ کا مرکز نگاہ بن گیا، یہاں طریقۂ تدریس وہی تھا جو آج سے ۷۰/۸۰ سال پہلے تک ہندوستان میں رائج تھا- یعنی نہ جماعت کا کوئی سسٹم تھا نہ امتحانات وغیرہ کا کوئی نظام تھا جس طالب علم کو جو کتاب پڑھنی ہوتی تھی وہ اس کی سماعت کر لیا کرتا تھا، جب اساتذہ یہ محسوس کرنے لگتے تھے کہ طالب علم اب کسی قابل ہو گیا ہے تو اس کو سند فراغ دے دی جاتی تھی- اس وقت مسجد کے حجروں میں طلبہ رہتے تھے اور مسجد کے مختلف گوشوں میں بیٹھ کر اساتذہ درس دیا کرتے تھے، پھر ۲۰/ یا ۳۰/ کی دہائی میں اصلاح و ترقی کا عمل شروع ہوا، امتحان داخلہ، امتحان فراغت، مختلف تعلیمی مراحل، شعبوں اور مختلف کلیات وغیرہ کا نظام رائج کیا گیا، رفتہ رفتہ یہ عمل آگے بڑھا اور آخر کار ۵۰/ کی دہائی میں اس کو باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا، ساتھ ہی جامع الازھر کی بجائے ''جامعة الازهر'' نام رکھا گیا- جامعۃ الازھر سے متصل ہی مختلف کلیات کی عالیشان عمارتیں بنوائی گئیں اور اب علم و فن کا پورا ایک شہر ہے-

سوال:- جامعہ میں کتنی فیکلٹیز (Faculties) اور کتنے شعبے ہیں؟ اور وہ کون کون سے ہیں؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- ازہر شریف میں ۲۶/ فیکلٹیز ہیں، علوم اسلامیہ کے لیے مندرجہ ذیل فیکلٹیز ہے، اصول الدین، کلیۃ الدراسات الاسلامیۃ العربیۃ، کلیۃ الشریعۃ، کلیۃ الدعوۃ، کلیۃ اللغۃ العربیۃ، کلیۃ التربیۃ- پھر ہر فیکلٹی میں تین، چار یا پانچ شعبے ہیں، مثلاً کلیۃ اصول الدین (جس کو ام الکلیات بھی کہا جاتا ہے) میں چار شعبے ہیں، قسم التفسیر و علوم القرآن، قسم الحدیث، قسم العقیدۃ والفلسفۃ، قسم الدعوۃ-

سوال:- جامعہ کا نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس کیا ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- اس کا جواب تفصیل طلب ہے، ویسے اس سلسلے میں جام نور کے ''تحریری مباحثہ'' میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں-(اس کا تفصیلی جواب ماہنامہ جام نور کے شمارہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں ملاحظہ فرمائیں......ادارہ)

سوال:- جامعہ میں طلبہ کی تعداد کتنی ہے اور کن ممالک سے تعلق رکھتے ہیں؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- ازہر شریف کے تمام کلیات و معاہد کے طلبہ کی مجموعی تعداد ایک لاکھ کے آس پاس ہے، جس میں تقریباً ۹۵/ ممالک کے ۱۵/ سے ۲۰/ ہزار طلبہ بھی شامل ہیں-

سوال:-طلبہ کی رہائش اور طعام کی کیا سہولتیں ہیں؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- ازہر شریف میں ۴/ ہاسٹل ہیں، ایک غیر ملکی طلبہ کا، ایک غیر ملکی طالبات کا، ایک مصری طلبہ کا اور ایک مصری طالبات کا- غیر ملکی طلبہ کے ہاسٹل میں تقریباً ۸/ ہزار طلبہ رہائش پذیر ہیں- اس کو مختلف منطقوں (سیکٹرس) میں تقسیم کیا گیا ہے، عام طور پر ایک طالب علم کو ایک کمرہ دیا جاتا ہے جس میں وہ تنہا رہتا ہے-بعض عمارتیں ایسی ہیں جن میں ایک کمرہ میں دو طالب علم رہتے ہیں اور اب جو نئی عمارتیں بن رہی ہیں ان میں کمرے بڑے ہیں لہٰذا ایک کمرہ میں تین طلبہ کو رکھا گیا ہے- کمرے کا مکمل سامان یعنی بیڈ، الماری، میز کرسی، چادریں، گدے، تکیہ وغیرہ سب جامعہ کی طرف سے فراہم کیے جاتے ہیں- کھانے کے لیے ہر منطقہ (سیکٹر) کا الگ ڈائننگ ہال ہے، کھانا اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے، مینو (Menu) بڑا متنوع ہوتا ہے اور ہر دن الگ الگ ڈشیں دی جاتی ہیں-

سوال:-(۶) کیا طلبہ کو وہاں اپنے اخراجات خود اٹھانے پڑتے ہیں یا پھر جامعہ انہیں کچھ ماہانہ وظیفہ دیتا ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- دونوں صورتیں ہیں، طالب علم اپنے ذاتی خرچ پر بھی جا سکتا ہے اور ازہر شریف کی جانب سے وظائف بھی دیئے جاتے ہیں- ازہر شریف کے علاوہ مصری وزارت اوقاف کا ایک ذیلی ادارہ **مجلس الاعلیٰ لشئون الاسلامیہ**

بھی ازہر کے طلبہ کو وظائف دیتا ہے، اس کے علاوہ سعودی اور کویت کے بعض فلاحی ادارے بھی غیر مستطیع طلبہ کو وظائف دیتے ہیں-

سوال:- ہمارے جو طلبہ وہاں جانے کی خواہش رکھتے ہیں وہ کس طرح Apply کریں اور انہیں کس طرح تیاریاں کرنی چاہیے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:-اس میں کافی پیچیدگیاں ہیں، جس کی تفصیل طوالت سے خالی نہیں ہے، ویسے اگر کوئی طالب علم وہاں جانے کا خواہش مند ہے تو وہ مجھ سے براہ راست رابطہ کرسکتا ہے، میں ہر قسم کی رہنمائی کو تیار ہوں، اس سلسلے میں کسی بھی طالب علم کو تعاون کرنے میں مجھے مسرت ہوگی-

سوال:- جامعہ کی لائبریری کا نظام کیا ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں اور اس وقت اس میں کتنی کتابیں ہیں؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- یوں تو ہر فیکلٹی کی اپنی الگ لائبریری ہے جو ہزاروں کتب پر مشتمل ہے، لیکن ازہر شریف کی مرکزی لائبریری عالم اسلام کی چند قدیم اور عظیم لائبریریوں میں سے ایک ہے- یہ آٹھ منزلہ عالی شان عمارت میں واقع ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا شعبۂ مخطوطات ہے، جو ہزاروں قدیم اور نایاب قلمی نسخوں پر مشتمل ہے، اس میں بعض کتب ایسی بھی ہیں جن کا واحد نسخہ یہاں موجود ہے اور سیکڑوں قلمی کتب ایسے ہیں جن کے دنیا میں صرف چند ہی نسخے ہیں- ایک دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ گزشتہ ۳۰/۴۰/ سال میں ازہر شریف کے مختلف کلیات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے جو مقالے لکھے گئے ہیں وہ سب اس لائبریری میں موجود ہیں جو بجائے خود ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ ہے-

سوال:- وہاں کے اساتذہ کی مبلغ علمی کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- ازہر شریف علم وفن کا عالمی مرکز ہے، وہاں پر ہر فن کے ماہر اساتذہ موجود ہیں، اس سلسلے میں زیادہ کچھ کہنا شاید استاذ کے حق میں شاگرد کی نیاز مندی تصور کی جائے- مگر حقیقت یہ ہے کہ ازہر شریف جانے سے پہلے وہاں کے اساتذہ

کے بارے میں میرا جو تصور تھا میں نے ان حضرات کو اس سے بہت بلند پایا- میں اپنے اساتذہ میں جن حضرات کے علم، وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا معترف ہوا ان میں یہاں مختصراً صرف تین حضرات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں- پروفیسر عبدالمعطی قیومی میرے فلسفہ کے استاذ ہیں، یہاں اس بات کا ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ استاذ گرامی امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب قبلہ کی درسگاہ میں معقولات پڑھنے والا کسی اور سے بہت کم ہی مطمئن ہو پاتا ہے، چار سال تک حضرت خواجہ صاحب کی خدمت کرنے پر مجھے فخر ہے مگر اس کے باوجود جب ڈاکٹر قیومی صاحب سے فلسفہ پڑھنا شروع کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، فلسفہ کے وہ دقیق مباحث عالیہ جن کو سمجھنے اور سمجھانے والے حضرت خواجہ صاحب اور ان کے چند مخصوص تلامذہ کے علاوہ ہندوستان میں بھی کمیاب ہیں، ان مسائل ومباحث پر ڈاکٹر قیومی صاحب کا عالمانہ اور محققانہ لکچر سن کر میں دنگ رہ گیا، ہندوستان میں میں نے اتنا منطق و فلسفہ پڑھا تھا جتنا عام طور پر درسگاہوں میں نہیں پڑھایا جاتا پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے نئے سرے سے فلسفہ پڑھنا شروع کیا ہے- ڈاکٹر قیومی صاحب کی معرکۃ الآراء تصنیف " الدراسة النقدية بفلسفة الشرق" میری اس رائے پر شاہد عدل ہے-تربیت افتاء کے دوران ہمارے ایک استاذ ڈاکٹر احمد کمال سے میں بہت متاثر ہوا، یہ ہمیں احوال شخصیہ پڑھاتے تھے، اگر مسالک اربعہ پر ان کی گہری نظر تھی تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیوں کہ چاروں مسالک کے اصول وفروع پر گہری نظر رکھنے والے ازھر شریف میں بہت سے اساتذہ ہیں، حیرت کی بات تو یہ تھی کہ مسالک اربعہ کے علاوہ فقہ جعفریہ، فقہ اباضیہ اور فقہ ظاہریہ پر ان کی بہت گہری نظر تھی، اکثر مسلم ممالک کے عائلی قوانین کا انہوں نے مطالعہ کیا تھا، اس کے علاوہ وہ انگریزی اور فرنچ زبانوں پر عبور رکھتے تھے، جس کی وجہ سے انہوں نے مغربی قانون کا براہ راست مطالعہ کیا تھا، اتنا وسیع مطالعہ بجائے خود ایک حیرت انگیز بات ہے، اس سے بڑی حیرت ان کے استحضار پر ہوتی تھی کہ گویا جو کچھ پڑھا ہے نوک زبان پر ہے-مصر کے موجودہ مفتی اعظم پروفیسر ڈاکٹر علی جمعہ محمد (جو شیخ طریقت بھی ہیں) میری ناقص رائے میں عالم اسلام میں ان کے پائے کا عالم شاید چند ایک ہی

ہوں-آپ کی حدیث، اصول فقہ اور تصوف کے دروس میں مجھے شرکت کی سعادت حاصل ہے، اس کے علاوہ تربیت افتاء کے دوران انہوں نے اصول افتاء پر ہماری جماعت کو چند لکچر بھی دیئے ہیں، ان کی درسگاہ میں بیٹھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی علم کا دریا ہے جو اپنی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہا ہے-

سوال :- جو ادارے اپنے طلبہ کو ازہر بھیجنے کے مجاز ہیں ان سے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب ہمارے کچھ جامعات کا الحاق اور معادلہ ازھر شریف سے ہو گیا ہے، ان اداروں کے ذمہ داران سے میں یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ اپنے طلبہ کو ازھر شریف بھیجتے وقت رشتہ داری اور تعلقات نہ نبھائیں بلکہ اس کے لیے اداروں میں ٹسٹ کا نظام رائج کریں، جو طلبہ ذی صلاحیت، با شعور اور محنتی ہوں صرف ان کا انتخاب کیا جائے، تاکہ یہ لوگ ازھر شریف سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں، ان طلبہ کی کارکردگی سے ازھر کے اندر آپ کے ادارے کا نام بھی روشن ہوگا اور یہاں آکر وہ ازھر کی رسوائی کا ذریعہ بھی نہیں بنیں گے-

سوال:-عام طور پر ہمارے علما کو ہندوستان میں یہ گمان ہے کہ عالم عرب کے جامعات سے بہتر تعلیم ہمارے دینی اداروں میں ہوتی ہے، وہاں کے جامعات میں صرف عربی سیکھنے کے لیے جانا چاہیے، آپ اس گمان کے تعلق سے کیا کہیں گے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:-س خوش گمانی یا بدگمانی پر میں جام نور کے تحریری مباحثہ میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں، اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف اتنا عرض کروں گا کہ

لطف مے تجھ سے کیا کہوں واعظ
ہائے افسوس تو نے پی ہی نہیں

سوال:- جامعہ ازھر میں آپ کو سب سے اچھی چیز کیا لگی؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- اس کا جواب بھی تفصیل طلب ہے، کیوں کہ بہت

سی ایسی چیزیں ہیں جن سے میں متأثر ہوا ہوں، اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں سب سے اچھی چیز کیا ہے، ایک بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ وہاں علما اور اساتذہ میں علم وفن کے علاوہ تقویٰ، انکساری، سادگی اور کشادہ قلبی نے مجھے بہت متأثر کیا-

سوال:-اور سب سے ناپسندیدہ؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- ظاہر ہے کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، ازہر کی خوبیوں کے علاوہ کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے انصاف نہیں کیا جاسکتا، کچھ قوانین ایسے ہیں جو انتہائی عجیب وغریب ہیں، مثال کے طور پر ہاسٹل میں صرف اسی شخص کو رہائش دی جائے گی جس کو ازہر سے وظیفہ ملتا ہو، جس کو وظیفہ نہیں ملتا وہ ہاسٹل میں رہنے کا مجاز نہیں ہے، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ جس کو وظیفہ مل رہا ہے وہ تو کمرہ لے کر باہر بھی رہ سکتا ہے جب کہ جس کو وظیفہ نہیں مل رہا ہے وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو ہاسٹل میں جگہ دی جائے- دوسری بات جس سے ہر طالب علم کو شکایت رہتی ہے وہ یہ ہے کہ ازہر کے اساتذہ اور علما جتنے بااخلاق، خردنواز اور مشفق ہیں ازہر کے کلرک اتنے ہی بدخلق اور اکھڑ مزاج کے ہیں، کسی کام کو ٹالنے اور لٹکانے کے ایسے ایسے گر انہیں آتے ہیں کہ الامان والحفیظ-

سوال:- یہاں مذہبی طبقہ میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ وہاں جانے کے بعد طلبہ میں آزادروی اور آزادخیالی آجاتی ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- آزادروی اور آزادخیالی سے اگر عقیدہ کی آزادروی اور آزادخیالی مراد ہے تو میں اس بات سے متفق نہیں ہوں، میں آپ کو بتاؤں کہ ہندوستان کے ایک مشہور ادارہ کے ایک استاذ نے اپنے ایک شاگرد (جو ازہر میں زیر تعلیم ہیں) کو خط میں لکھا کہ ازہر کے علما پر تصوف غالب ہے لہٰذا تم ان سے صرف علم حاصل کرو ان کی بدعات وخرافات پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور شیخ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی کتب کا مطالعہ کرتے رہو- خط کے ان جملوں سے آپ کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا ہوگا، اس کے باوجود ہمارے لوگ اس غم میں دبلے ہوئے جارہے ہیں کہ ہم وہاں سے آزاد

روی اور آزادخیالی کی سوغات لے کر آتے ہیں.....ع

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

سوال:- جو طلبہ وہاں اس وقت تعلیم حاصل کررہے ہیں ان سے ہم کتنی توقعات وابستہ رکھیں؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- یہ سوال تو آپ ان طلبہ ہی سے پوچھیں تو زیادہ بہتر ہے-

سوال:- جامعہ سے فراغت کے بعد اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟ جماعتی سطح پر جو علمی جمود ہے کیا ہم توقع رکھیں کہ فضلائے ازہر کے ذریعہ اس کا کسی حد تک تدارک ہوگا؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- میں نے مدرسہ میں آٹھ سال گزارے ہیں اور پھر ازہر شریف میں پانچ سال رہا ہوں، میں نے اپنے اس تعلیمی سفر میں بہت تجربات حاصل کیے ہیں ان تجربات کی روشنی میں میں نے اپنے لیے کچھ اہداف اور خطوط متعین کیے ہیں، ان شاءاللہ ان خطوط پر کام کرنے کا ارادہ ہے، مگر فی الحال ان پر کچھ کہنا قبل از وقت بھی ہوگا اور شاید دیوانہ کی بڑ بھی سمجھا جائے، اس لیے انتظار کیجئے یہ تو ابتدائے عشق ہے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے-

سوال:- جام نور کے تعلق سے آپ کی بے باک رائے کیا ہے؟

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری:- حضرت علامہ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ نے جام نور کے ذریعہ جماعت کی تعمیر نو، تنظیم، تشکیل اور علمی وفکری وقار کی بحالی کی طرف جو قدم اٹھایا تھا آپ نے جام نور کا دوبارہ اجراء کر کے اس مشن کی تکمیل کی طرف بڑے حوصلہ سے قدم اٹھایا ہے، میں تو صرف یہی عرض کروں گا کہ

زمانہ مانگ رہا ہے دعا ترقی کی
مگر تجھے تیرا عہد کہن راس آئے

□□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۰۴ء)

مولانا پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

سربراہ مرکزی ''مجلس رضا'' ومدیر اعلیٰ ماہنامہ ''جہان رضا'' لاہور، پاکستان

مولانا پیرزادہ اقبال احمد فاروقی کی شخصیت ''افکار رضا'' کی اشاعت کے حوالے سے ہندو پاک میں تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ولادت پاکستان کے ضلع گجرات کے ایک پسماندہ گاؤں میں ۱۹۲۸ء میں ہوئی، مڈل تک اپنے علاقے میں ہی تعلیم حاصل کی اور پھر لاہور تشریف لے آئے، دینی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور دلچسپی بڑھی تو ''تفسیر نبوی'' کے مولف مولانا نبی بخش حلوائی کے زیر سایہ درس نظامیہ کی منتہی کتابوں کی تکمیل کی، پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور لاء کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ کی ملازمت میں آ گئے۔ ملازمت کے دوران ہی آپ نے اپنی مذہبی اور علمی سرگرمیاں شروع کیں اور ۱۹۶۰ء میں تصنیف وتالیف اور ترجمے کی طرف متوجہ ہوئے اور اہل سنت کی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبہ نبویہ قائم کیا، بہت سی کتابیں تصنیف وتالیف کیں نیز کئی ضخیم کتابوں کے ترجمے بھی کیے جن میں ''معارج النبوۃ'' تین جلدوں میں، ''قصر عارفاں'' اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ''تکمیل الایمان'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اپنے استاذ گرامی کی ''تفسیر نبوی'' کی بھی اپنے رفقاء کی مدد سے ۱۵ جلدوں کا ترجمہ اردو میں کیا۔ آپ ''مرکزی مجلس رضا'' کے بانی رکن ہیں، ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کے دور میں مجلس رضا ٹوٹ گئی تھی تو آپ نے ہی آگے بڑھ کر اس کو سنبھالا اور ان کے انتقال کے بعد ''مرکزی مجلس رضا'' کے پلیٹ فارم سے افکار رضا پر مشتمل تقریباً پانچ لاکھ کتابیں شائع کر کے عوام وخواص کے درمیان مفت تقسیم کیں نیز ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ ''جہان رضا'' جاری کیا جو مسلسل کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

سوال:- آپ کی سرپرستی میں ''مجلس رضا'' لاہور رضویات کی اشاعت میں غیر معمولی اسپرٹ کے ساتھ مصروف ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی موجودہ سرگرمیاں کیا ہیں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- سب سے پہلے تو میں آپ کا ذاتی طور پر ممنون ہوں کہ آپ ''مرکزی مجلس رضا لاہور'' کی کارکردگی اور اس پر میری خدمات سننا چاہتے ہیں، اس تعلق سے کچھ گفتگو کرنے سے قبل میں اپنی اور علمائے لاہور پاکستان کی جانب سے آپ کی یہاں آمد پر پر جوش خیر مقدم کرتا ہوں۔ ۱۹۶۸ء میں محسن اہل سنت حضرت حکیم موسیٰ امرتسری صاحب نے ''رضویات'' کے فروغ کے لیے یہاں لاہور میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھی اور ایک چھوٹی سی کمیٹی قائم کی جس کے تعاون سے اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے افکار اور ان کی کتابوں کی اشاعت کرنے لگے، انہوں نے ۲۰/سال کے عرصے میں اسی لاکھ کتابیں شائع کر کے عالم اسلام اور پڑھے لکھے طبقوں میں پھیلا دیا، یہ وہ دور تھا جب امام احمد رضا کے نظریات اور ان کی کتابوں سے لوگ بہت کم واقف تھے، لیکن انہوں نے شب وروز محنت کر کے گھر گھر میں فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے افکار پہنچا دیے، پہلے پہل تو یہ مجلس اعلیٰ حضرت کے فقہی اور اعتقادی کتابوں کو ہی شائع کر کے مفت تقسیم کرتی رہی مگر اس کے بعد جب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ان کے دیگر گوشوں کو سامنے لایا تو حکیم صاحب نے دیگر حلقوں میں بھی اعلیٰ حضرت کی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پھر لوگ جوق در جوق اہل سنت کے نظریات کے حامی ہوتے چلے گئے۔ آپ نے غالباً یہ بھی سوال کیا ہے کہ ''مرکزی مجلس رضا'' کے پلیٹ فارم سے اعلیٰ حضرت کے افکار کو فروغ دینے پر میری کیا خدمات ہیں۔

سوال:- نہیں، میں نے مجلس کی موجودہ سرگرمیوں کے تعلق سے سوال کیا ہے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- اچھا اچھا، اس سلسلے میں آپ کو بتاؤں کہ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد میں نے مرکزی مجلس رضا کی باگ ڈور سنبھالی اور اس کے بعد افکار رضا پر مشتمل تقریباً پانچ لاکھ کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کیں، اس کے بعد میں نے سوچا کہ اعلیٰ

حضرت کے افکار کو صرف کتابوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ میگزین کی صورت میں بھی ہر ماہ شائع کر کے پھیلانا چاہیے، جس کے نتیجے میں میں نے ۱۹۹۱ء میں ماہنامہ ''جہان رضا'' کا آغاز کیا اور اس میں مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔

سوال:۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے کچھ اہم مستقبل کے منصوبے اور مقاصد ہوں تو انہیں ذرا تفصیل سے بیان کریں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:۔ میرے سامنے اس وقت کئی منصوبے ہیں، مگر میں اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے ان منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بہت زیادہ تگ و دو نہیں کر پا رہا ہوں، ہاں! ''مرکزی مجلس رضا'' کے قیام اور اس کی تحریک کی وجہ سے الحمد للہ! اب پاکستان میں کئی ادارے، بزمیں اور مکتبے قائم ہو چکے ہیں جو افکار رضا کے فروغ میں کوشاں ہیں، میری نظر میں اب بھی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا جو صحیح علمی اور فقہی مقام ہے وہ متعین نہیں ہو سکا ہے، اس کے لیے مزید محنت کی ضرورت ہے۔

سوال:۔ ''جہان رضا''، ''مجلس رضا'' کا ترجمان ہے، لیکن عام رائے یہ ہے کہ جس طرح یہ مجلس علمی ہے اس طرح اس کا ترجمان علمی انداز میں شائع نہیں ہوتا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:۔ دراصل میں محسوس کرتا ہوں کہ ''جہان رضا'' کے قارئین عموماً بہت پڑھے لکھے اور گہری نظر رکھنے والے نہیں ہیں جو افکار رضا پر مشتمل ادق مضامین کو پڑھ کر مستفید ہو سکیں، اسی لیے میں نے اسے عوامی بنا کر رکھا ہے تا کہ وہ علمی گہرائیوں میں نہ کھو جائیں بلکہ سیدھے سادے انداز میں اہل سنت کے نظریات کو سمجھیں، الحمد للہ! وہ اس کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سوال:۔ یہ تو ایک درمیانی طبقے کے لیے ہو گیا، مگر کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ دانشوران اور پڑھے لکھے طبقوں کے لیے بھی کوئی خالص علمی رسالہ ہونا چاہیے تا کہ افکار رضا کی علمی ترجمانی ہو سکے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:۔ جی ہاں! یہ ضرورت تو محسوس ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے

میری نظر میں یہ زیادہ ضروری ہے کہ درمیانی طبقوں میں تبلیغ کی جائے، یہ تو جانے دیجیے کچھ لوگ تو مجھے یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ ''جہان رضا'' کو مزید سہل کیا جائے اور بالکل پرائمری سطح پر لایا جائے، مگر میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یہ معیار اعلیٰ حضرت کے علمی مقام کے لیے بہتر نہیں ہے۔

سوال:۔ ہند و پاک کے کئی ایک ادارے ''رضویات'' کی اشاعت میں مصروف ہیں، مگر کیا آپ کو نہیں لگتا کہ فاضل بریلوی کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی ایک پہلو مثلاً ان کا سائنسی مقام اور سیاسی تدبر وغیرہ اب بھی تشنہ کام ہیں، آپ کی نظر میں رضویات کے وہ کون سے ابواب ہیں جن پر اس وقت کام کرنا نہایت ضروری ہے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:۔ یہ آپ نے بہت اچھا سوال کیا، اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل سے بتا دیتا کہ اس وقت پاک و ہند میں کون کون سے ادارے یا لوگ کام کر رہے ہیں، ہمارے یہاں اعلیٰ حضرت پر بے شمار لوگ اس وقت کام کر رہے ہیں، مگر وہ سب کے سب انفرادی طور پر ہی کر رہے ہیں، ہمارے یہاں اجتماعی طور پر ابھی کام کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوا ہے، اگر ہم متحد ہو کر منصوبے اور مقاصد کے تحت کام کریں اور کاموں کو بانٹ لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ رضویات کے ہر گوشے پر اطمینان بخش کام ہو سکے گا۔

سوال:۔ اچھا یہ بتایئے کہ ''رضویات'' کے تشنہ ابواب پر کام کرنے کے لیے اس دور میں کون کون سے طریقے ہو سکتے ہیں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:۔ میں نے تو اب تک تحریری طریقے کو ہی اپنایا ہے، دوسرے ذرائع کو نہیں اپنا سکا، کیونکہ کسی بھی نظریہ کے فروغ کے لیے اسی کو سب سے مضبوط ذریعہ مانتا ہوں، ہاں! دیگر بہت سے ذرائع اور طریق کار ہیں جن کو اپنانے کے لیے مختلف بزمیں اور انجمنیں کام کریں تو اچھا ہو گا تا کہ اعلیٰ حضرت کا صحیح علمی اور فقہی مقام متعین ہو سکے، ابھی تو ہم ابتدائی دور سے ہی گزر رہے ہیں، افکار رضا کی ترویج کے لیے ابھی بہت سے کام کرنا باقی ہیں۔ اب ''فتاویٰ رضویہ'' کو ہی لے لیں، اس پر اب تک Systematical کام نہیں ہو سکا، اس سے مسائل بیان کر دینا ایک الگ چیز ہے، مگر ارباب علم و فن کے سامنے اس کو

احسن طریقے سے پیش کرنا ایک الگ چیز ہے- اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کو ہی لے لیں تو اس کے بھی ابھی فنی، علمی اور ادبی محاسن پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے- ''نعت رنگ'' نے ارباب ادب کے تعاون سے اس کے مختلف گوشوں پر کام کیا ہے اور اب اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری پر وہ ایک منفرد اور ضخیم نمبر بھی نکال رہے ہیں جو نہایت مستحسن قدم ہے، لیکن یہ اپنی نوعیت کا پہلا قدم ہے، اس جہت میں مزید کام کی ضرورت ہے-

سوال:-یعنی آپ یہ چاہ رہے ہیں کہ تحریری طور پر ہی زیادہ کام ہو؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- جی ہاں! تحریری طور پر نظریات اور تحریک کے فروغ میں جو استحکام آتا ہے وہ کسی اور میڈیم کے ذریعے نہیں ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ہی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ دوسرے مکاتب فکر موجودہ جدید ذرائع ابلاغ کو عالمی سطح پر استعمال کر کے اپنے گمراہ کن نظریات کو فروغ دے رہے ہیں تو میرے اندر بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں بھی اسی انداز میں کام کروں، مگر افسوس کہ میں اپنے آپ کو اس کام کا متحمل نہیں پاتا، کیونکہ میرے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ اس میدان کو اپناؤں-

سوال:- فاضل بریلوی کی عبقری شخصیت کا جو بین الاقوامی سطح پر تعارف ہونا چاہیے تھا اس میں ''مجلس رضا'' اور دوسرے ادارے کس حد تک کامیاب ہیں اور ابھی اس راہ کے کتنے مراحل طے کرنا باقی ہیں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- یہ ایک ایسا بحر بیکراں ہے جس کو عبور کرنے کے لیے جگر بھی چاہیے، وقت بھی اور حوصلہ وعزم بھی، مگر اس کے باوجود میں کہنا چاہوں گا کہ جن لوگوں نے بھی اخلاص اور عزم کے ساتھ اس راہ میں کام کیا ہے، وہ بہت کامیاب ہیں، ان کے نتائج مایوس کن نہیں ہیں بلکہ نہایت حوصلہ افزا ہیں- یہاں لاہور میں مرکزی ''مجلس رضا'' نے اس کی بنیاد رکھی ہے، جس کو دیکھتے ہوئے اب دوسرے حضرات کام کے نئے نئے اور مختلف زاویے سامنے لا رہے ہیں، جنہیں دیکھ کر مسرت ہوتی ہے- آج ہی ہندوستان سے ''رضویات'' کے موضوعات پر چند کتابوں کا مجھے ایک بنڈل ملا ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہم ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیادوں پر ہی کام کرنا چاہتے ہیں، اس لیے میں اس پر فخر

کرتا ہوں کہ مجلس کا کام دوسروں کے لیے رہنمائی کا سبب بنا ہے-

سوال:- آج ہند و پاک کے روابط کافی اچھے ہو رہے ہیں، ہر معاملے میں اشتراک اور ایک دوسرے سے قربت بڑھتی جا رہی ہے، ایسے میں آپ کے نزدیک وہ کون سی تدبیر ہے یا کون سا نقطہ اجتماع ہے جس پر ہندوستان اور پاکستان کے سنی علما جمع ہو کر اتحاد و اشتراک کے ساتھ ''فروغ رضویات'' کے کام کو آگے بڑھائیں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- اب تک تو پاک و ہند کے درمیان اچھے روابط پیدا کرنے کے لیے سیاسی، فلمی اور کھیل سے تعلق رکھنے والے افراد ہی پیش قدمی کرتے رہے ہیں، مذہبی سطح پر آپسی تال میل کے لیے ابھی ہم لوگوں نے کچھ نہیں کیا ہے، لیکن اگر فضا ہموار ہو گئی تو پاک و ہند کے علما کو رضویات اور سنیت کے حوالے سے کام کرنے کے لیے یکجا ہونا پڑے گا، میں نے محسوس کیا ہے کہ پاکستان میں رضویات کے حوالے سے جتنا کام ہوا، اتنا ہندوستان میں نہیں ہو سکا، مگر اب وہاں بھی بیداری آ رہی ہے، بعض ادارے اور افراد اعلیٰ حضرت کے کاموں کو مختلف زاویے سے سامنے لا رہے ہیں، لیکن اگر یکجا ہو گئے تو یقیناً ایک دوسرے سے بہت استفادہ کریں گے-

سوال:- آپ نے ذاتی طور پر اب تک ''رضویات'' پر کون کون سے کام کیے ہیں، قارئین جام نور کے استفادے کے لیے براہ کرم اسے بھی بتائیں کریں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- میری زندگی کا جو کچھ بھی حاصل ہے وہ ''مرکزی مجلس رضا'' کی شکل میں ہے یا پھر ''جہان رضا'' کے صفحات پر ہے، ان دونوں کاموں سے ہٹ کر میں خود کوئی بہت زیادہ کتابیں نہ لکھ سکا ہوں اور نہ ترتیب دے سکا ہوں، مگر پھر بھی ''رضویات'' کے تعلق سے کوئی بھی انوکھا کام جو اب تک نہیں ہو سکا وہ مجھے نظر آتا ہے تو میں اسے کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مثلاً پچھلے ۷۰ر برسوں سے ''حیات اعلیٰ حضرت''، مکمل نہیں چھپ سکی تھی جب کہ چند علمائے ہندوستان کے مابین اس نایاب کتاب کا مسودہ پچھلے ۳۰ر برسوں سے گھوم رہا تھا، میں نے الحمدللہ! اسے بڑھ کر ترتیب دیا، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق میں نے اسے سجایا اور اسے شائع کر کے دنیائے سنیت کے سامنے پیش کیا، میں اس

پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے ایک عظیم کام کرنے کا موقع ملا جو مدتوں سے گمنامی میں پڑا ہوا تھا- اب الحمدللہ! میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اسی کتاب کو ہندوستان کے علما نے بھی ترتیب دے کر شائع کیا، جس کا انداز اور ترتیب بالکل مجھ سے مختلف ہے، مگر میری ترتیب دی ہوئی ''حیات اعلیٰ حضرت'' پر کام زیادہ اچھا ہوا ہے-

سوال:- غالباً آپ نے ہندوستان میں مفتی مطیع الرحمٰن مضطر کی ترتیب دی ہوئی ''حیات اعلیٰ حضرت'' بھی پڑھی ہوگی، اب آپ بلاتکلف نہایت یہ بتائیں کہ کون سی ترتیب زیادہ اچھی اور موثر ہے؟ آپ کی مرتب کردہ یا ہندوستانی ایڈیشن؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- ایک بات تو میں آپ کو بتادوں کے جس وقت میں اپنی کتاب ترتیب دے رہا تھا تو اس وقت ہندوستانی ایڈیشن میرے پیش نظر نہیں تھا، میری کتاب شائع ہونے کے بعد میں نے ہندوستانی ایڈیشن دیکھا ہے، اس لیے اب میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ میری کاوش ان بزرگوں سے بہتر ہے جنہوں نے ہندوستان میں اسے ترتیب دی ہے- اس کے علاوہ انہوں نے ایک جلد بھی کم چھاپی وہ مکمل نہیں ہے-

سوال:- لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے بھی ایک جلد کم چھاپی ہے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- الحمدللہ! ایسا نہیں ہے، آپ میری کتاب ملاحظہ فرمائیں، ہم نے چار حصوں کو مکمل ایک جلد میں کر دیا ہے مگر کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے- انہوں نے ایک حصہ نہیں شائع کیا، اب ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ مجھے نہیں معلوم، انہیں وہ حصہ نہیں ملا یا پھر دیدہ ودانستہ ایسا کیا گیا ہے، لیکن محسوس تو یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ہی اپنے ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے ایسا کیا ہے، کیونکہ اس میں ترک موالات وغیرہ کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت نے ہندوؤں کو خوب لتاڑا ہے اور اس میں قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی طرح فطرتی طور پر دو قومی نظریہ پیش کیا ہے، اگر وہ اس کو شائع کر دیتے تو ممکن ہے انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا-

سوال:- نہیں، میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے، میں وہاں کے سیاسی حالات سے واقف ہوں، میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:-:- ہوسکتا ہے کہ ان کو وہ چیز نہ ملی ہو لیکن مجھے ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب نے بتایا کہ ''حیات اعلیٰ حضرت'' کا سارا مسودہ مولانا محمود احمد رفاقتی صاحب لے گئے تھے، اب ان سے یہ مسودہ گم ہوگیا یا انہوں نے دیدہ ودانستہ ایک حصہ الگ کر دیا مجھے نہیں معلوم-

سوال:- ''رضویات'' کے فروغ میں کتابوں کے علاوہ اخبارات ورسائل کا کیا کردار رہا ہے اور خاص طور پر اس وقت رسائل کے کیا فوائد سامنے آ رہے ہیں؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- میں سمجھتا ہوں ''رضویات'' کے حوالے سے پاکستان میں مختلف اداروں اور انجمنوں کے ذریعے تقریباً ہزاروں رسائل وجرائد منظر عام پر آئے ہیں جنہوں نے علمی اور عوامی دونوں طبقوں میں ہی سنیت کی فضا ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور یہ بڑی بات ہے- مرکزی مجلس رضا اور رسائل وجرائد کا سنیت کے لیے فضا سازگار کرنے کا ہی یہ اثر ہے کہ کل تک کنزالایمان ترجمہ قرآن کو شائع کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا، ہم وفد لے لے کر تاج کمپنی والے کے پاس جاتے تھے کہ اسے آپ شائع کریں، مگر وہ تیار نہیں ہوتا تھا کہ اسے کون خریدے گا؟ الحمدللہ! آج چار سو تاجران صرف پاکستان کے اندر کنزالایمان شائع کر رہے ہیں جن میں سنی، دیوبندی، جماعت اسلامی اور اہل حدیث سبھی طبقے شامل ہیں-

سوال:- ماہنامہ ''جام نور'' اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:- ماہنامہ جام نور نے پچھلے دو سالوں میں بڑی تیزی کے ساتھ پاک وہند کے پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے، میں بھی اس کا مستقل قاری ہوں، مجھے اس میں بڑے ہی اچھوتے اور علمی مضامین ملتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ یہ رسالہ پرانی لکیریں نہیں پیٹ رہا ہے بلکہ جدید طرز پر جماعتی وملی مسائل کو حل کرنے کے لیے نہایت جدوجہد کر رہا ہے- اس کی اہمیت کا اندازہ ہمارے قارئین اس طور پر بھی لگائیں گے کہ میں یہاں لاہور میں ''جام نور'' کی سو سو کاپیاں منگواتا ہوں اور چند دنوں میں ہی لوگ خرید لے جاتے ہیں اور مطالعہ کے بعد مجھ سے اور دیگر مجلسوں میں اس کے

دلچسپ مضامین، مباحث اور خاص طور پر اداریوں پر ہدیہ تحسین پیش کرتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ آپ (ایڈیٹر) کے پاس لوگ اپنے دلی تاثرات روانہ کرتے ہیں کہ نہیں لیکن یہاں مجھ سے تحریری، زبانی اور فون پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہیں- میری دعا ہے کہ اس وقت معاشرے میں جو اعتقادی اور فکری بے راہ روی ہے اس کی اصلاح کے لیے ''جام نور'' یونہی کامیابی کے ساتھ ملت کا ترجمان بن کر شائع ہوتا رہا ہے- میں آپ کی خدمات کو بھی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کیونکہ آپ نے جماعت اہل سنت کو ایک نئی جہت اور فکر دی ہے-

□□□

(شمارہ اپریل ۲۰۰۵ء)

امام زید شاکر

ڈائرکٹر زیتونہ انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا، امریکہ

امام زید شاکر African Amrican ہیں- امریکہ کے صوبہ کیلی فورنیا میں پیدا ہوئے، امریکی فوج میں ملازمت کے دوران ۱۹۷۷ء میں اسلام قبول کیا- امریکی یونیورسٹی واشنگٹن سے International Relation میں گریجویشن اور Rutgers University سے Political Science میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی- اسلام لانے کے بعد دین حق کی روح کو سمجھنے اور عربی سیکھنے کی غرض سے مصر، شام اور غرب وغیرہ عرب ممالک کا سفر کیا، انگلش ان کی مادری زبان ہے، عربی میں بھی بلا تکلف بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہیں- جدید علوم کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، فقہ پر بھی کامل عبور ہے- فقہ میں امام شافعی کے مقلد ہیں، صوفیہ ومشائخ سے گہری وابستگی رکھتے ہیں- امام زید شاکر نومسلم امریکی صوفی اسکالر ہونے کی حیثیت سے امریکی سیاست پر کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں، زبان و بیان پر قدرت کی وجہ سے امریکہ کے علاوہ اکثر یورپی ممالک کے سفر پر رہتے ہیں- امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ''برکلے'' میں عربی زبان کے استاذ بھی ہیں- اسلامی تراث کی نصف درجن کتابیں تقریباً عربی سے انگلش میں ترجمہ کر چکے ہیں- ۹/۱۱ کے بعد امریکہ میں مسلمانوں کے حالات پر ان کی ایک اہم کتاب Scattered Pictures منظر عام پر آ کر یورپ و امریکہ میں بے حد مقبول ہوئی- ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے مختلف صوبوں اور شہروں میں مختلف ذرائع سے اسلام کی درست تعبیر پیش کرنے اور غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کرنے میں مصروف ہیں- موصوف کا ماننا ہے کہ اگر صحیح اسلامی نظریات کی عصری ترسیل کی جائے تو اسلام کا دائرہ وسیع کرنے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی-

سوال :-کیا آپ اپنے اسلام قبول کرنے کے واقعے کے بارے میں ہمیں بتا سکتے ہیں؟

امام زید شاکر :-بسم اللہ الرحمٰن الرحیم -میں نے اسلام دو سال کی تلاش کے بعد ۱۹۷۷ء کی بہار میں قبول کیا، دو سال تک میں دین حق کی تلاش میں رہا، میری اس تلاش کی وجہ ایسے نظام کی جستجو تھی جو معاشرے میں غربت اور بھوک اور روحانیت کے فقدان کا علاج مہیا کر سکے- ہم بچپن میں ایک حکومت کی طرف سے مہیا کیے گئے فلاحی گھر میں رہتے تھے، ہم سات بچے تھے جنہیں صرف ان کی ماں نے پال پوس کر بڑا کیا، ہمارے والد کا ہمارے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا، میری والدہ (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) بہت ہی باہمت خاتون تھیں، ان کی محنت اور مستقل مزاجی کی وجہ سے ہم سب بچوں نے اچھی تعلیم پائی - البتہ ہمارے اردگرد معاشرتی برائیوں کی ریل پیل تھی، نشے کی حالت میں بیوی بچوں کو مارنا پیٹنا کوئی نئی بات نہیں تھی، جب میں بارہویں جماعت میں تھا تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ ان حالات کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، ایسے میں میں نے مذہب کے بارے میں ریسرچ شروع کیا، ظاہر ہے پہلا مذہب جس کا میں نے مطالعہ کیا وہ عیسائیت تھا کیونکہ میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا-لیکن جیسے جیسے میری تحقیق گہری ہوتی گئی مجھے عیسائی عقیدے میں نقص نظر آنے لگے اور میں عیسائیت سے دور ہوتا چلا گیا، میں اس بات پر یقین کرنے سے قاصر تھا کہ انجیل جیسے کہ ہم جانتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی کتاب نہیں بلکہ وہ ایک ایسی کتاب اور عیسائیت ایک ایسا مذہب ہے جسے چرچ کی اجارہ داری کے لیے تبدیل کیا جا چکا ہے-

آخر کار میں نے مشرقی مذاہب کا مطالعہ شروع کیا، میں نے بدھ مت کا مطالعہ کیا اور جوگیوں کے انداز پر بھی غور کیا لیکن میرے لیے یہ سب مذاہب صرف انسان کی شخصیت تک محدود نظر آئے، وہ میری روحانیت تو بڑھا سکتے تھے لیکن ان میں معاشرے کی برائیوں کے لیے کوئی حل موجود نہیں تھا-

آخر کار میں نے ایک کتاب ''اسلام ان فوکس'' پڑھی جو کہ محمود العاطی نے لکھی تھی، وہ کتاب پڑھتے ہی مجھ پر حق افشاں ہو گیا اور الحمدللہ! اب ۳۱ سال گزر چکے ہیں اور میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل سے ابھی بھی مسلمان ہوں اور میں نے کبھی بھی اپنے فیصلہ پر شک نہیں کیا-

سوال :-ہم نے سنا ہے کہ آپ اہل سنت وجماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور مسلک میں امام شافعی کے مقلد ہیں، کیا شروع سے ہی آپ امام شافعی کے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں یا یہ تبدیلی بعد میں آئی؟

امام زید شاکر :-جب میں نے اسلام قبول کیا میں اس وقت امریکی ائیر فورس میں ملازمت کر رہا تھا، میں نے ائیر فورس میں ملازمت معاشی تنگی کی حالت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کی تھی، جب میں کالج کے پہلے سال میں تھا تو میری والدہ انتقال کر گئیں اور ان کے انتقال کے بعد میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کر رہا تھا لیکن اس سے آمدنی اتنی نہیں تھی کہ میں گھر اور اپنی پڑھائی کا خرچہ برداشت کر سکتا، ان حالات کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ میں ائیر فورس میں بھرتی ہوں گا، یہ ویت نام کی جنگ کے بعد کا زمانہ تھا، میں نے ائیر فورس سے مستعفی ہونے کی کوشش کی کیونکہ میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا، میری یہ عرضی اس بنا پر رد کر دی گئی کہ اس وقت کوئی جنگ جاری نہیں تھی، اس عرضی کے رد ہونے پر میں نے ترکی کے ائیر فورس بیس میں داخل ہونے کی درخواست کی تاکہ میں ایک مسلم معاشرے میں رہ سکوں، میری یہ عرضی قبول کر لی گئی - ترکی میں میں نے مقامی علما سے اسلام کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، جو کہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، اس موقع پر مجھے چار اماموں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، میری ائیر فورس کی ملازمت کے اختتام پر جو صرف چند سال رہی میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا- ایسے میں میری ملاقات ایک ایسے حضرت سے ہوئی جو کہ سلفی تھے، انہوں نے کہا کہ مقلد ہونا اور امام ابوحنیفہ کی پیروی کرنا بدعت ہے- اس دوران میں نے فقہ، فقہ سنہ سے پڑھنا شروع کی جو کہ سید سابق کی لکھی ہوئی ہے اور عقیدہ بھی سلفی تصنیفات سے پڑھنا شروع کیا، آٹھ سال کے لیے میں

نے ایسے ماحول میں تعلیم حاصل کی، میں نے اس دوران دو مسجدوں کا آغاز کیا، ان میں سے ایک مسجد الاسلام کا میں بذات خود امام تھا، یہ مسجد نیو ہیون، کنیٹیکٹ میں ہے- اپنی فقہ کلاسیں جو میں پڑھاتا تھا، ان میں مجھے احساس ہوتا تھا کہ سلفی فقہ میں ایسے خلا تھے جو مجھے خود اپنی طرف سے بھرنے پڑتے تھے، مجھے یہ بات اکثر پریشان کرتی رہتی تھی، اسی دوران ایک ملیشیا سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھائی نے مجھے شیخ نوہا میم کیلر کی ایک شافعی فقہ کی کتاب پڑھنے کو دی-

اس کتاب کو پڑھ کر مجھے اس چیز کا احساس ہوا کہ اس کتاب میں دی گئی فقہ میں کوئی خلا موجود نہیں تھا اور مجھے اپنی طرف سے چیزیں بنانے کی ضرورت نہیں تھی، اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے مسجد میں امام شافعی کے مسلک کی کتاب سے فقہ پڑھانا شروع کر دی، اس کتاب کا نام عمدۃ السالک تھا، اس کے بعد میں نے چار اماموں کے بارے میں تحقیق کرنا شروع کی، مجھے فوراً ہی اس بات کا پتہ چل گیا کہ چاروں میں کسی بھی مسلک میں کسی ایک انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ ہزاروں علما کے ہاتھوں صدیوں کے گزرنے کے بعد مسائل کا حل اور اسلام کے اصول قائم کیے گئے ہیں-

ایک اور بات جس کا مجھ پر انکشاف ہوا وہ یہ ہے کہ سلفی فقہ ایک ایسا مسلک ہے جو کچھ تو شافعی مسلک جیسا ہے اور باقی داؤد الظاہری کے ظاہری مسلک جیسا ہے- سوال یہ ہے کہ آپ کس کے اصولوں پر چلنا چاہتے ہیں، البانی اور نئے علما جن کو سلفی صحیح مانتے ہیں ان کے اصولوں پر راضی ہیں تو وہ ان کی مرضی، میں تو امام شافعی اور ان کے شاگردوں امام موزانی، امام ظافرانی، امام بغوی، امام جونی، امام الحرمین، امام غزالی، امام نواوی، ابن حجر ھیتمی، امام رمدی اور بعد میں آنے والے اماموں اور ان کے وضع کردہ اصولوں کی پیروی میں زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہوں-

ہمیں البتہ دوسرے مسلکوں کے پیروکار مسلمانوں کی عزت کرنی چاہیے اور بھائی چارے سے زندگی گزارنی چاہیے، ہم ایسے معاملات میں پڑ کر امت مسلمہ کو تقسیم ہونے نہیں دے سکتے، ہمیں اس بات کا خیال کرنا چاہیے کہ ہم میں سے ہر کوئی مجتہد یا مجتہد مطلق نہیں اور

ہم قرآن اور سنت سے اپنی طرف سے حکم نہیں نکال سکتے، وہ صرف علما کا کام ہے جو اس فیلڈ کے ماہر ہیں، جس طرح ہم کسی ایسے شخص کو کسی کا آپریشن نہیں کرنے دیتے جس نے طب کی کوئی ایک معمولی سی کتاب پڑھ رکھی ہو یا کسی ایسے مکینک کو اپنی گاڑی نہیں دیتے جس نے گھر بیٹھ کر ٹویوٹا گاڑی کا مینول پڑھ رکھا ہو یا کسی ایسے دندان ساز کے پاس نہیں جاتے جس نے کوئی دندان سازی کی تعلیم نہ حاصل کر رکھی ہو تو ہم دین کے معاملے میں کسی ایسے شخص کے پاس کیسے جا سکتے ہیں جو اپنے فیلڈ کا ماہر نہ ہو- کسی غلط ڈاکٹر کے پاس جا کر ہم اپنے جسم کو خطرے میں ڈالتے ہیں اور کسی غیر عالم کے پاس جا کر ہم اپنی روح کو ابدی خطرے میں ڈال دیتے ہیں، اب آپ خود ہی بتائیے کہ اس عارضی دنیا کے معاملات میں ہم صرف ماہرین کی خدمت حاصل کرتے ہیں اور روحانی معاملات جو ابدی ہیں ان کے لیے نہیں، ایسے لوگ جو دین کے مقاصد اور اصولوں سے ناآشنا ہوں، جو احادیث کے بارے میں علم نہ رکھتے ہوں، جو علوم القرآن سے ناواقف اور اسباب النزول سے ناآشنا ہوں اور جنہیں نسخ کا علم نہ ہو جن کے بغیر قرآن سے کسی حکم کو لینا کتاب الٰہی کی شان میں گستاخی اور ایمان کے ساتھ زیادتی ہے، جس شخص کو قرآن کی قرأت کا علم نہیں اور جو عربی زبان کا ماہر نہیں ہم ایسے شخص کے حوالے اپنے ایمان کی حفاظت کی ذمہ داری دے دیں یہ سراسر نادانی ہے-

سوال:- آپ کا تصوف سے کیا تعلق ہے اور لوگوں کا امریکہ میں تصوف کے بارے میں کیا تصور ہے؟

امام زید شاکر:- امریکی معاشرے میں بہت عرصہ تک صرف اخوان المسلمون یا سلفی مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کا اثر رہا ہے لیکن پچھلے کچھ سالوں میں یہ رجحان تبدیل ہو چکا ہے اور دعویٰ میں ان کی آواز خاصی بلند ہو چکی ہے-

جہاں تک علم تصوف کا تعلق ہے یقیناً یہ علم ایک بدعت ہے لیکن ہمیں اس بات کو جان لینا چاہیے کہ ہر بدعت بری نہیں ہوتی، جیسے کہ اگر ہم علم النحو کی مثال لیں، تو ہم جانیں گے کہ صحابہ کے زمانہ میں ایسے کسی علم کا نام ونشان بھی موجود نہیں تھا، اگر ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کسی عربی کے جملہ میں مبتدا خبر کو واضح کرنے کو کہتے تو وہ خیال کرتے کے

شائد ہمارا دماغ اپنی صحیح حالت میں نہیں ہے، اگر ہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھیں کہ یہ کلمہ مرفوع ہے یا منصوب تو شائد ہمیں مار ہی پڑ جائے، جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عربی زبان کے تحفظ کے لیے علم النحو کا آغاز کیا گیا جو کہ بدعہ حسنہ ہے اسی طرح فقہ میں اگر آپ صحابہ کے پاس جاتے اور پوچھتے کہ اس مسئلہ پر کیا فتوی ہے کہ یہ باب طہارہ میں آیا ہے کہ باب نکاح میں تو آپ کو مایوسی ہوگی صحابہ کے لیے فقہ ان کا فہم تھا، ان کے لیے یہ سب اصول نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عقل وفہم سے سمجھے ہوئے مسئلے تھے نہ کہ ایک مخصوص علم تو جس طرح علم فقہ کا آغاز ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے اصولوں کی حفاظت کی جا سکے اور جس طرح علم النحو کا آغاز ہوا کہ عربی زبان کو محفوظ کیا جائے، اسی طرح تصوف کے علم کا آغاز کیا گیا تا کہ مسلمانوں کی روحانیت کو بحال کرنے کے علم کی حفاظت کی جا سکی-علم عقیدہ کا آغاز بھی اسی طرح مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کے لیے کیا گیا-صحابہ کو علوم اسما اور صفات کی تفصیلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ لفظ عقیدہ ان کے لیے کوئی معنی رکھتا تھا- اگر ہم سلفی اصطلاحات کا استعمال کریں تو ان کے لیے الوہیت اللہ اور ربوبیت اللہ کچھ معنی نہ رکھتے تھے، یہ سب اصطلاحات اس لیے شروع کی گئیں تا کہ اسلام کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جا سکے-

تو اگر ہم تصوف کو اس بنیاد پر ٹھکرا دیں کہ اس طرح کا کوئی علم نبی پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود نہیں تھا تو ہمیں علم النحو، علم الفقہ اور علم عقیدہ کو بھی ٹھکرانا پڑے گا-

اس بحث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تصوف کا نام لے کر ہر وہ چیز جس کو تصوف کے دائرے میں شامل کیا جاتا ہے، مان لیا جائے-

ہم اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے کہ لوگ یونانی یا ہندو فلسفے کو پڑھ کر اس پر تصوف کا لیبل لگا کر ایسے پیش کریں کہ اس کا آغاز نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا-تصوف کا استعمال اس لیے ہے کہ انسان اپنے اندر موجود روحانی خامیوں کو دور کر سکے، اپنے باطن میں موجود برے کردار کو اچھے کردار میں تبدیل کر سکے، اپنی زبان کو ذکر میں

مشغول رکھ سکے، اپنے آپ میں اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور جیسے ان کا ادب کیا جانا چاہیے کر سکے، یہ اسلام کی وہ بنیاد ہے جس پر علم تصوف کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اور مجھے فخر ہے کہ جس حد تک ہو سکتا ہے میں اس کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہوں-

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر سب لوگ تصوف کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاریں تو لوگ نہیں چاہیں گے کہ انہیں کوئی صوفی کہے، کیونکہ پرانے زمانے میں صوفی کہلانے کا مطلب تھا کہ آپ ایک ایسے شخص ہیں جس نے اپنے باطن کو روحانی طور پر بالکل پاک کر دیا ہے اور ایک ایسے شخص ہیں جو کہ ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول ہوتا ہے اور اس کے تمام اعمال شریعت کے مطابق ہیں، جو کہ تمام سنتوں کو اپنے آپ میں زندہ رکھے ہوئے ہے، ایسے شخص کو صوفی کہا جاتا تھا، تو اگر آج کل لوگ صحیح طرح سے علم تصوف پر زندہ رہیں تو انہیں صوفی کہلانے پر شرمندگی ہوگی کیونکہ ان میں وہ تمام اوصاف موجود نہیں جو ایک صوفی کی ذات میں ہونے چاہیے، آج کل کے حالات میں البتہ صوفی کہلانے کا مطلب ہے کہ یہ شخص بدعت کرتا ہے یا کسی سر پھرے گروہ کا مرید ہے-

ابھی تو میں چاہتا ہوں کہ میں اصل معنوں میں صوفی بن سکوں پر میں ابھی نہیں ہوں کیونکہ میں ہر وقت ذکر اور یاد الٰہی میں مشغول نہیں ہوتا، کبھی کبھی میرے نفس کی منفی سائڈ مجھ پر حاوی ہوتی ہے- اگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے اصل معنوں میں صوفی بننے کی توفیق دی تو میں صوفی ہونے پر فخر محسوس کروں گا، ان شاء اللہ-

سوال :-۹/۱۱ کے سانحے کے بعد امریکی عوام اور حکومت مسلمانوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

امام زید شاکر:- امریکی عوام کو مسلمانوں کو جانچنے کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن امریکیوں کا مسلمانوں سے کام پر یا ہمسائے کے طور پر میل جول ہے، ان کا مسلمانوں کے بارے میں بہت اچھا نظریہ ہے، البتہ جن امریکیوں کا کسی طرح بھی مسلمانوں سے میل جول نہیں وہ حکومتی پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے خلاف

تعصب زدہ ہو چکے ہیں۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے کچھ حکومتی حضرات بہت انصاف پسند ہیں اور وہ صرف قانون کی بالا دستی چاہتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کے لیے کوئی مخصوص برتاؤ، البتہ کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو کہ ۹/۱۱ کے سانحے کو استعمال کر کے مسلمانوں کو آج کل کا نیا امریکی دشمن (ماضی میں کمیونزم کی طرح) بنا کر پیش کرتے ہیں، ایک ایسی تیسری طاقت جو کہ دنیا پر قبضہ چاہتی ہے اور مسلمانوں کو اس ڈھنگ سے پیش کر کے وہ اپنی فوجی محاذ آرائی کو جائز قرار دینا چاہتی ہے، تا کہ وہ اور زیادہ پیسہ اسلحہ سازی میں جھونک سکے، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلحہ سازی ایک بہت منافع بخش کاروبار ہے اور امریکی امراء اور حکومتی ارکان جنگ کو ایک کاروبار بنا چکے ہیں، امریکہ کا معاشی نظام تتر بتر ہو رہا ہے لیکن عراق کی جنگ میں اربوں بلکہ کھربوں ڈالر جھونکے جا رہے ہیں، جیسے کہ امریکی کہاوت ہے کہ ''جنگ کاروبار کے لیے تباہی ہے ماسوائے اس جنگ کے جو کاروبار میں ہو'' اسی وجہ سے کچھ امریکی کمپنیاں پچھلے کچھ سالوں میں کئی اربوں ڈالر کا منافع بنا چکی ہیں، عام طور پر اس طرح سے کسی حریف کے ساتھ جنگ چھیڑنا ممکن نہیں ہوتا، اگر کوئی اچھا جواز عوام کو نہ مہیا کیا جا سکے، البتہ مسلمانوں سے جنگ کے لیے حکومت دہشت گردی مٹانے کے بہانے اپنی من مانی کر رہی ہے۔

سوال:- کہا جاتا ہے کہ امریکی حکومت دہشت گردی کی آڑ میں مسلمانوں سے جنگ لڑ رہی ہے، آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

امام زید شاکر:- جی ہاں! حکومت مسلمانوں سے لڑائی انسداد دہشت گردی کے نام پر کر رہی ہے، اصل صورت حال یہ ہے کہ امریکی حکومت دہشت گردی کا خاتمہ نہیں کر رہی، عراق اور افغانستان میں جنگ لوگوں کے دلوں میں غم و غصے کے شعلے اور بھڑکا رہی ہے، یہ صورت حال دہشت گردی کی افزائش میں اضافے کا باعث تو بن سکتی ہے کمی کا نہیں۔ میرے خیال میں حکومت کو دہشت گردی کو ختم کرنے کا کوئی شوق نہیں، اسے مسلمانوں کے زمینی اثاثوں پر قبضہ کر کے پیسہ بنانے سے مطلب ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلم ممالک میں اپنی فوجی موجودگی بھی چاہتے ہیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ اس جنگ سے مسلمانوں

کے دلوں میں صرف نفرت کا اضافہ ہو رہا ہے، دہشت گردی کا خاتمہ نہیں۔

کچھ مسلمان ملکوں میں عوام کے خلاف جو دہشت گردی کی جا رہی ہے جیسا کہ پاکستان، جس کو امریکی میڈیا میں یہ کہہ کر اچھالا جاتا ہے کہ اس وجہ سے ہمیں یہ جنگ کرنی ہے تا کہ ان دہشت پسند عناصر کا خاتمہ کیا جا سکے، یہ موقف بالکل درست نہیں، اگر آپ حالیہ پاکستان الیکشن رزلٹ کا معائنہ کریں تو ظاہر ہو جائے گا کہ مذہبی جماعتوں کو کوئی ووٹ نہیں پڑے تو آپ خود اندازہ لگائیں کہ جو لوگ چند ارکان اسمبلی منتخب نہیں کر سکتے وہ حکومت پر قبضہ کر کے کیا کسی کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں؟ بالکل نہیں۔

سوال:- نوجوانوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

امام زید شاکر:- نوجوانی کے دور میں انسان اکثر جذباتی ہوتا ہے، اس موقع پر سب سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو رکھے اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں نہ چڑھ جائے جن کا ایجنڈا کچھ اور ہی ہو، آج کل جو لوگ اپنی طرف سے جہادی مہموں میں مصروف ہیں ان کی وجہ سے ان گنت مسلمانوں کی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

آپ بے نظیر بھٹو کی مثال لے لیں، جس شخص نے ان کی جان لینے کے لیے اپنی جان بھی دے دی اس شخص نے نہ صرف ایک بے گناہ عورت پر قاتلانہ حملہ کیا بلکہ ارد گرد کے غریب عوام کو بھی قتل کر دیا، کئی لوگ امریکی سی آئی اے یا اسرائیلی موساد پر الزام دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس شخص نے اصل حملہ کیا وہ مسلمان تھا، ایسے میں اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں جو کہتی ہیں کہ جس کسی نے کسی مسلمان کے قتل میں مدد بھی کی وہ آخرت میں اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا یا اس حدیث کی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی آدمی مشرق میں زبان سے ایسی بات کرے جس کی وجہ سے مغرب میں کسی بھی مسلمان کی جان لی جائے تو وہ شخص ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ تو پھر ہم شریعت کی روشنی میں ایسی حرکتوں کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔

میرا نوجوانوں کو پیغام یہ ہے کہ اسلام متوازن دین ہے، اس میں جہاد کا حکم یقیناً ہے، لڑائی کا بھی حکم ہے لیکن اللہ کے واسطے اسلام کی حفاظت کے لیے نہ کہ بے گناہ لوگوں کا خون

بہانے کے لیے، چاہے وہ بے گناہ لوگ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسلام نے بے گناہ غیر مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔

نوجوانوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے اردگرد کے معاشرے کو بہتر کیسے بنا سکتے ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنے دین کا علم حاصل کریں اور اپنے عقائد اور حرکات وسکنات میں تضاد نہ آنے دیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے بزرگ تاج محل اور بادشاہی مسجد جیسی عمارتیں ہمارے لیے کیسے چھوڑ گئے، جن کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ملتا، ہمیں تو ایسی باکمال چیزیں ورثے میں ملیں پر ہم چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ دین اور روحانیت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم اور سائنس کے ماہر بننے کا شوق اپنے اندر پیدا کریں تاکہ تمام لوگوں کی زندگی پر اچھے طور پر اثر انداز ہوسکیں۔□□□

(شمارہ مئی ۲۰۰۸ء)

پروفیسر سید محمد امین قادری

زیب سجادہ آستانۂ عالیہ برکاتیہ، مارہرہ مطہرہ، ضلع ایٹہ (یوپی)

مشائخ مارہرہ کی روحانی فیض رسانیوں کا ذکر کیے بغیر برصغیر میں دین کے تحفظ وتبلیغ کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی (ولادت ۱۵/اگست ۱۹۵۲ء) اسی سلسلۂ روحانیت کے امین ووارث ہیں، قدیم صالح کے محافظ اور مبلغ بھی ہیں اور جدید نافع سے آراستہ اور اس کے موید بھی۔ خانقاہ مارہرہ کی مسند نشینی پر متمکن ہونے (۱۹۹۵ء) کے بعد اپنی فکر، عمل اور جدوجہد سے آپ نے تعلیمی، دینی، روحانی اور تعمیری مشن کے فروغ میں جو نمایاں خدمات پیش کی ہیں وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ برصغیر کا عظیم ادارہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سمیت ملک کے سیکڑوں مدارس ومکاتب آپ کی توجہات سے رو بہ ارتقا ہیں۔ قائم چاند پوری، ادب ادیب اصناف، شاہ برکت اللہ کی حیات اور علمی کارنامے اور شاہ حقانی کا اردو ترجمہ اور تفسیر کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ کے مصنف، سراج العوارف والوصایا والمعارف، چہار انواع اور آداب السالکین کے مترجم، درجنوں مدارس اور تنظیموں کے سرپرست، البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے بانی وصدر اور شعبہ اردو علی گڑھ کے پروفیسر ہیں۔ اب جبکہ انٹرویوز کا یہ مجموعہ زیر ترتیب ہے، موصوف کے تعلق سے یہ اضافہ کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ۲۰۰۹ء کے اخیر میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی امریکہ کا دی پرنس الولید بن طلال سینٹر فار مسلم کرسچین انڈراسٹینڈنگ اور دی رؤئل اسلامک اسٹراٹجک اسٹیڈیز سینٹر جورڈن نے پوری دنیا کے مسلمانوں کا سروے کیا اور ان کروڑوں مسلمانوں میں سے پانچ سو ایسے مسلمانوں کی ایک فہرست تیار کی جو عام مسلمانوں پر اپنے گہرے اثرات رکھتے ہیں۔ اس فہرست میں پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری کا نام ۴۴ ویں نمبر پر ہے۔

سوال :-ایک یونیورسٹی کا پروفیسر، ایک عظیم خانقاہ کا متولی و سجادہ نشیں اور ایک معیاری عصری درس گاہ کا سربراہ، تینوں ذمہ داریوں کو کیسے Maintain کرتا ہے اور ان تینوں میں اس کے لیے سب سے زیادہ مشکل اور مشقت طلب کون سی ذمہ داری ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:-میرے لیے یہ تینوں چیزیں باعث برکت ورحمت وتقویت ہیں- میں یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں جو میرا منصبی فریضہ ہے اور میرا ذریعہ معاش بھی اس لیے باعث برکت ہے- خانقاہِ برکاتیہ کا خادم ہوں یہ میرا موروثی وتیرہ ہے، رب تبارک وتعالیٰ کی عنایت ہے، اس لیے میرے لیے باعث رحمت ہے- ''البرکات'' قوم کی فلاح وبہبود کے لیے چھیڑا گیا مشن ہے اس لیے میرے لیے باعث تقویت ہے اور جہاں تک maintain کرنے کی بات ہے تو جس نے یہ عہدے اور اعزاز عطا فرمائے ہیں وہ ان کو سنبھالنے کی صلاحیت اور طاقت بھی عطا فرماتا ہے- میں خود کو بہت خوش نصیب تصور کرتا ہوں کہ رب کریم نے مجھ کو دین اور دنیا دونوں کی خدمت کرنے کا موقع دیا-

جہاں تک آپ نے پوچھا کہ مشکل اور مشقت طلب کیا ہے تو بھائی کام کرنے کا جذبہ رکھنے والے کے لیے کوئی کام مشقت طلب نہیں ہوتا اور نہ کرنے والے کے لیے ایک تنکا ادھر سے اُدھر کرنا مشقت طلب ہے- ہمارا تو ماننا یہ ہے کہ

قدم چوم لیتی ہے خود آ کے منزل
مسافر اگر اپنی ہمت نہ ہارے

اگر ذمہ داریاں زیادہ ہیں تو Times of Management بہت ضروری ہے اور میں خدا کے فضل سے اپنے اوقات کو منضبط کرنے کی کوشش کرتا ہوں- صبح سے 1:30 تک یونیورسٹی اور پھر البرکات اور رات میں دوسرے روز پڑھانے کے لیے مطالعہ، احباب اور متوسلین کے فون، ان کی باتیں اور ان کے لیے دعا تعویذ غرض کہ سب کچھ بخیر وخوبی جاری ہے-اس میں بہت سی چیزوں کی قربانیاں دینا ہوتی ہیں جو بتائی نہیں جاتی بلکہ محسوس کی جاسکتی ہیں- میں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا کہ Times of Management بہت

اہم چیز ہے اگر وقت کی پابندی ہے اور رویہ مثبت ہے تو کوئی بھی کام بہ آسانی کیا جاسکتا ہے- دراصل ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی بھی کام کے متعلق آپ کا concept clear ہے، آپ کو کام کی بنیادی سمجھ ہے، منفی اور مثبت دونوں پہلو اُجاگر ہیں تبھی آپ چیزوں پہ قابو پا سکتے ہیں اور کام کو بخیر وخوبی کر سکتے ہیں-

سوال :-آج جبکہ ہماری اکابر ہستیاں راہی ملک عدم ہوچکی ہیں اور جماعت اہل سنت مخلص، ذی علم وذی استعداد اور بلند فکر افراد سے محروم ہوتی جا رہی ہے، ایسے میں علمی فکری، تبلیغی، تعمیری اور تنظیمی سطح پر آپ جماعت کو کس حال میں پاتے ہیں؟ یعنی جماعت کے ارتقائی مراحل سے آپ کتنا مطمئن ہیں؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:-یہ بات صحیح ہے خوشتر صاحب کہ ہماری اکابر ہستیاں ہم سے رخصت ہوچکی ہیں اور یہ قانونِ قدرت ہے، مشیت ایزدی کا تقاضا ہے ''**کل من علیہا فان**''، لیکن اس بات سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے کہ مخلص، ذی علم وذی استعداد اور بلند فکر افراد سے جماعت محروم ہے- ایسا نہیں ہے بلکہ یہ کہئے کہ ہم ان کو تلاش نہیں کر پا رہے ہیں، ہم جستجو نہیں کر رہے ہیں- مخلص افراد خود نہیں ہوتے ہیں بنانا پڑتے ہیں-

جماعتِ اہلِ سنّت میں ذی علم بھی ہیں، ذی استعداد بھی اور بلند فکر بھی- بس کہیں کہیں بکھراؤ ہوگیا collective efforts نہیں ہیں- کہیں باہمی تعاون کی کمی ہے، کہیں آپسی سمجھ کا فقدان ہے، کہیں وسائل کی کمی ترقی کی راہ میں آڑے آتی دکھائی دیتی ہے-

جماعت کی تشکیل افراد سے ہوتی ہے، اگر جماعتی سطح پر کوئی کمی ہے، فکری، تعلیمی، تبلیغی معاملات اگر کمزور ہیں تو اس میں ساری ذمہ داری ہم علمائے کرام، مشائخ عظام اور دوسرے ذمہ داران پر پوری طور سے نہیں ڈال سکتے- ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عوام تک ہم اصلاحی پیغام پہنچانے میں کامیاب ہیں کہ نہیں- لوگوں کو جماعت کے ذمہ داران کے کس رویہ سے زیادہ بیزاری ہے- افرادِ امّت ہم سے کیا توقعات رکھتے ہیں- ہم نے اس دور کے بارے میں بھی سنا ہے اور کچھ کچھ دیکھا بھی ہے کہ اکابر علمانے جماعت کی شیرازہ بندی کیسے کی- ان حضرات میں عوام کو convince کرنے کی بڑی صلاحیت تھی- آپ کسی بھی مشن یا

تحریک کی طرف عوام الناس کو کسی عہدے، نسبی فضیلت، یا زور وزر کے ذریعے راغب نہیں کرسکتے- اس کے لیے آپ کے پاس کردار، نیک نیت اور ذاتی مفاد سے بیزاری ہونا چاہیے- مجھے یاد ہے میرے بڑے ابا حضور سید العلما کسی مدرسے یا جماعت کی مدد کرنے کے لیے اگر ایک مرغ یا ایک انڈا ہاتھ میں لے کر نیلام کرنے کھڑے ہوجاتے تھے تو عورتیں اپنے زیورات تک نذر کردیا کرتی تھیں- تو یہ انڈے اور مرغے کی قیمت نہیں تھی بلکہ حضور سید العلما کی زبان کی اہمیت تھی- ایسی ہزاروں نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں اس ضمن میں-

میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں ہمارے سامنے بہتر مواقع ہیں Science & Technology کے اس زمانے میں ترسیل کی بہتر سہولتیں Print & Electronic میڈیا نے پیدا کی ہیں- اگر ہمارے نوجوان علما، دانشور، متحرک ہوجائیں اور اپنے بزرگوں کی سرپرستی اور ان کے گراں قدر مشوروں کی روشنی میں کام کریں تو یقیناً صورتِ حال بہتر ہوگی اور وہ سب کچھ جماعت اہلِ سنّت میں ممکن ہوگا جس طرف آپ نے نشان دہی فرمائی ہے- جہاں تک آپ نے اطمینان کی بات پوچھی تو میں عرض کروں کہ جس جماعت کا بنیادی مقصد عشقِ رسول کی ترویج واشاعت ہے، جس مسلک کا نصب العین تحفظ ناموسِ رسالت ہے، اُس تحریک، اُس مشن اور ان افراد کو مایوس ہونے کی کیا ضرورت- ہاں! کبھی کبھی چیزیں بے ترتیب دکھائی دیتی ہیں تو فکر ہوتی ہے- ہمیشہ optimistic یعنی آشاوادی رہنا چاہیے- خوشتر صاحب! ہم سب کو over confidence سے پرہیز کرنا چاہیے- سارے معاملات اپنا صحیح محاسبہ کرنے سے بہتر ہوجاتے ہیں- ہماری جماعت کا مستقبل آنے والے کل میں بہت تابناک ہوگا- ہمیں اپنی نئی نسل سے بڑی امیدیں ہیں اور وہ نئی نسل آپ سب حضرات ہیں- رب کریم ہماری فکر کو بلند کرے گا- تبلیغ کا دور دورہ ہوگا، تنظیمی مضبوطی ہوگی، تعمیری حسن پیدا ہوگا- (اِن شاءاللہ)

سوال:- موجودہ صورت حال اور عصر حاضر کے متنوع مطالبات کے پیش نظر جماعت کی ارتقا کے لیے ہمیں کس طرح کی جدوجہد کرنی چاہیے، بالخصوص کن شعبوں پر

زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- بڑا اہم سوال آپ نے کیا ہے- ہمیں سب سے پہلے یہ غور کرنا ہوگا کہ ہماری جماعت کے بارے میں وہ لوگ کیا تاثرات رکھتے ہیں جن کا ہم سے نظریاتی اختلاف ہے اور ان لوگوں کا نظریہ بھی جانیں جو بالفاظ دگر Neutral تصور کیے جاتے ہیں- تقریباً ایک صدی گزرنے کو ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ اب تک ہم عوام تک اپنی جماعت کا صحیح تعارف نہیں پیش کرسکے- کچھ حضرات نے بڑا معلوماتی لٹریچر شائع بھی کیا لیکن وہ کچھ خاص نظروں تک محدود رہا- اس سے یہ نقصان ہوا کہ ہم سوادِ اعظم تک اہلِ سنّت و جماعت کی صحیح تصویر پیش نہیں کر پائے- بڑے پیمانے پر Compaign programme چلانا ہوگا، لٹریچر کے ذریعہ، تبلیغ کے ذریعہ، Conferences اور اِجلاس منعقد کرکے- آج جو پڑھا لکھا طبقہ تصور کیا جاتا ہے ان کے ذہن تک یہ بات پہنچانا ہوگی کہ حق وہی ہے جو جماعتِ اہلِ سنّت کا موقف ہے- ہم لوگوں کے اور ہمارے مسلک کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کا ازالہ بہت ضروری ہے-

مدارس اسلامیہ کو جدید سہولتیں فراہم کرانا بھی ارتقائی مراحل کا ایک اہم حصّہ ہے- ہمارے علمائے کرام، مفتیانِ عظام کو علوم دین کے علاوہ General awareness ہونا بہت ضروری ہے- ملی، سماجی، سیاسی منظرنامے پر ان کی نگاہ ہونا ضروری، انگریزی زبان سے ضرورت کی حد تک واقفیت ہونا لازمی ہے- اِن شاءاللہ جامعہ البرکات میں علمائے کرام کے لیے ایک ایسا کورس جاری کرنے کا منصوبہ ہے جس کے تحت ان کو انگریزی، کمپیوٹر اور جدید عربی کی تعلیمات فراہم کی جاسکیں، ساتھ ہی ان کے orientation کے لیے معلوماتی لکچر بھی منعقد کرانے کا سوسائٹی کا ارادہ ہے- اللہ تعالیٰ جلد ان منصوبوں کو عملی جامے کی شکل عطا فرمائے- (آمین)

اس وقت خانقاہوں اور مدارس کے ذمہ داران اور اُمت کے بارسوخ افراد کو چاہیے کہ وہ اصلاحِ اُمّت کے لیے کمربستہ ہوں، تعلیم کو عام کرنے کا مشن جاری کریں، لوگوں کے دلوں میں مذہب اور مسلک کے لیے محبت اور کچھ مثبت کرنے کا جذبہ پیدا کریں- وہ

تمام غلط رسومات اور دین میں رخنہ پیدا کرنے والی چیزیں جن کو کم علمی کی وجہ سے لوگوں نے دین کا حصّہ سمجھ لیا ہے اُن کی حقیقت کو سمجھانے اور اُمت کو صراطِ مستقیم کی درخشاں منزلوں سے ہمکنار کرنے کے لیے ہم سب کو پیش قدمی کرنا ہوگی، تبھی صحیح معنیٰ میں جماعت اہلِ سنّت کی خدمت کا حق ادا ہو سکے گا-

سوال:- خانقاہ مارہرہ مشربی اختلافات سے الگ رہ کر تعمیری کاموں میں مصروف رہتی ہے، لیکن کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسی تجویز ہے جس سے بعض دوسری خانقاہوں میں موجود مشربی اختلافات کا خاتمہ ہو اور پوری جماعت متحد و متفق ہو کر تعمیر کی طرف پیش قدمی کر سکے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- ہم اختلافات سے کیوں دور رہتے ہیں اور کیوں رہنا چاہیے اس کا بڑا شافی جواب میرے برادرِ عزیز سید محمد اشرف آپ کو دے چکے ہیں— جب ہمارا مذہب ایک، مسلک ایک، مشرب ایک، ہمارا بنیادی مقصد ایک تو پھر اختلاف کیوں ہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے اور آپ نے یہ کہہ کر میرے جواب کو آسان کر دیا بلکہ ایک طرح سے جواب دے ہی دیا کہ افرادِ خانقاہ برکاتیہ تعمیری کاموں میں لگے ہیں تو بات بالکل صاف ہے کہ جب کوئی آدمی Positive Attitude کے ساتھ تعمیری معاملات میں لگ جاتا ہے تو اسے اختلافات پیدا کرنے یا ان میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی- ہمارے پاس تو وقت ہی کی بڑی قلّت رہتی ہے- یہاں پر کام ہی اتنے ہیں کہ دوسرے معاملات کی طرف رخ کرنے کی فرصت ہی نہیں ہے-

ہاں اگر کبھی کچھ باتیں کہیں ناپسندیدہ لگتی ہیں تو وہاں سے تنکا توڑ کر الگ ہو جاتے ہیں- ہماری خانقاہ کی یہ تاریخ رہی ہے کہ معاملاتِ دنیا میں تو ہر سطح پر Compromise کر لیتے ہیں لیکن دین اور سنّیت کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے- دینی معاملات ہر رشتے ناطے، ہر واسطے سے مقدم ہیں- ہم نے اور ہمارے اکابر نے ہمیشہ اس موقف کی تائید کی ہے جس میں مذہب و مسلک کا مفاد شامل رہا ہے-

کون نہیں چاہتا ہوگا کہ جماعت میں اتحاد و اتفاق ہو- سب متحد ہو کر دین متین کی

خدمات انجام دیں- مسلک اہلِ سنّت کا بول بالا ہو، ایک ممبر ہو، علما و مشائخ آپس میں ایک دوسرے کے معاون ہوں، خانقاہوں میں ایک دوسرے کا احترام کیا جائے- میرے بڑے ابّا اپنی تقاریر میں اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ دودھ میں پانی ملا کر کام چلایا جا سکتا ہے لیکن پانی میں تیل کبھی نہیں مل پاتا، تو کوشش یہ ہونا چاہیے کہ معاملات پانی تک محدود رہیں تو حالات قابو میں رہ سکتے ہیں-

دیکھئے جناب! ہر چیز کا اپنا ایک دائرہ ہوتا ہے ہم کو ایک حدِ امتیاز تو متعین کرنا ہوگی دین و سنّت میں کوئی باہری آمیزش نہیں ہوگی- دینی و ملی مسائل میں ذاتی مفاد نہیں ہوں گے- ہر چیز کا ایک الگ میدان ہے- دین کا میدان الگ ہے، سیاست کی فیلڈ الگ ہے، ذاتی مفاد کو پورے کرنے کے مواقع دوسرے ہوتے ہیں- ہمارا Concept clear ہونا چاہیے کہ ہمیں کس جانب ٹھہرنا ہے-

آپ تعمیری پیش قدمی کی بات کر رہے ہیں تو اس کا تو بہت سیدھا اور سچا جواب یہ ہے کہ فراخ دلی پیدا کی جائے، ایک دوسرے کے لیے دل میں جگہ پیدا کی جائے- کون ایسا قادری ہے جسے سرکار خواجہ کی بزرگی سے اختلاف ہوگا، کون اس بارگاہِ عالی سے نسبتِ غلامی کا دم نہ بھرتا ہوگا اور کون ایسا چشتی ہے جسے سرکار غوث اعظم کی عظمت اور ان کی عقیدت سے انحراف ہوگا- جب بزرگوں سے کوئی اختلاف نہیں تو نسبت اپنانے والوں کے بیچ اختلاف کیوں ہے- ہمیں اخلاص کے ساتھ سوچنا چاہیے، وسیع النظری کے ساتھ دوسروں کی طرف دیکھنا چاہیے- سارے ذمہ داران خانقاہ، علما و مشائخ سنجیدگی سے سوچا کریں، معاملات کے منفی پہلوؤں پر غور کریں، ہم سب اپنی اپنی کمیوں پر نظرِ ثانی کریں، دل مضبوط کر کے پکا عزم کریں کہ تمام اختلافی امور، ساری کڑوی باتیں، سارے ذاتی مفادات مذہب و مسلک کے نام پر ترک کر دیے جائیں گے جن کی وجہ سے اتحادِ اُمت وملت بری طرح متاثر ہے- پھر دیکھئے کہ کھویا ہوا ماضی اور جماعت کا وقار واپس آتا ہے کہ نہیں- مجھے قوی امید ہے کہ ضرور ایسا ہوگا لیکن ایک ایک قدم سب کو آگے بڑھنا ہوگا- تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجے گی- ملک زادہ منظور کا شعر ہے کہ

میکدے کا اسی ساقی سے بھرم ہے منظور
تشنہ لب رہ کے جو اوروں کو پلا دیتا ہے

اگر یہ جذبہ پیدا ہوگیا تو کچھ بھی ممکن ہے- ہم نے تو اپنی جماعت کا وہ تاریخ ساز دور بھی دیکھا ہے جس میں تمام علما و مشائخ ایک پلیٹ فارم پر تھے اور وہ بھی جید علمائے کرام اور مشائخ عظام مثلاً حضور مفتیِ اعظم، حضور مجاہدِ ملت، برہان ملت، شیر بیشہ اہلِ سنّت، حضور حافظِ ملّت، حضور محدث اعظم، حضور سید العلما، حضور احسن العلما رحمۃ اللہ علیہم اجمعین- آل انڈیا جمعیۃ العلما کا قیام کوئی معمولی بات نہیں تھی لیکن میرے بڑے ابا اور تمام اکابر علما نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ دنیا نے دیکھا تھا کہ پورے ہندوستان میں صدرِ سنی جمعیۃ العلما کی ایک آواز پر حکومت کے ماتھے پر پسینہ آتا تھا- مجال تھی کہ کسی ملّی مسئلے پر سنی جمعیۃ العلما کو اعتماد میں لیے بغیر ہاتھ ڈال دیا جائے- میری دعا ہے کہ ایک بار پھر ایسے حالات پیدا ہوں کہ ہم سب تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہوکر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور تحفظِ ناموس رسالت کے لیے اپنی پُرخلوص خدمات انجام دیں-

سوال:- خانقاہ مارہرہ کا وہ کون سا فارمولہ ہے جسے اپنا کر وہ علمی و تعمیری کاموں میں مصروف اور ملک و بیرون ملک عوام و خواص میں محبوب و مقبول ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- اپنے محبین اور متوسلین کے تئیں ایمان داری، خلوص کا جذبہ، ان کی دل جوئی اور ان کے معاملات کی پوری خبر گیری اور حسبِ توفیق اس میں تعاون- سچ پوچھئے تو بات یہ ہے کہ ہم لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ہم سے- یہ One way traffic نہیں ہے- یہاں دونوں طرف سے آوا گمن ہوتا ہے- ہم خود کو بڑا خوش نصیب تصور کرتے ہیں کہ ہمیں بڑے چاہنے والے احباب ملے ہیں اور جن سے ہم لوگوں کا تعلق ہے وہ بھی اس بات کو اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کمی ادھر سے بھی کوئی نہیں ہوتی ہے- آپ کسی سے سچے دل اور صاف نیت سے معاملات رکھ کر دیکھئے- اِن شاء اللہ نتائج اچھے ہی برآمد ہوں گے- (Exception ہر جگہ ہوتا ہے) تو بھائی ہمارے یہاں تو معاملہ سیدھا سچا ہے- ہم دوسروں سے بہت زیادہ توقعات نہیں رکھتے ہیں- اپنی توفیق بھر کرنے

میں کوئی گریز نہیں کرتے- اللہ علیم و خبیر ہے وہ جانتا ہے کہ ہمارے دل میں ملّت کی فلاح و بہبود کے لیے تعمیری کام کرنے کی کتنی امنگ اور خواہش رہتی ہے- تو بھائی خانقاہِ برکاتیہ نے کوئی ایسا Diplomatic formula تیار نہیں کیا ہے جس کے ذریعہ عوام کے درمیان مقبول اور محبوب ہونے کی تمنّا رکھتے ہوں- عزت اور ذلّت معبودِ برحق کے ہاتھ میں ہے- یہ اس کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے دل میں ہماری محبت پیدا کی اور ہم کو انھوں نے صحیح سمجھا ہے- بس اسی کو ہم اپنی کمائی تصور کرتے ہیں- اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں بندگانِ خدا کی خدمت کرنے کا جذبہ عطا فرمائے- (آمین)

سوال:- جامعہ البرکات کا قیام جماعتی سطح پر فرض کفایہ کی ادائیگی ہے، لیکن ملک میں مسلمانوں کی تعداد کے پیش نظر اس طرح کے مزید اداروں کی ضرورت باقی رہتی ہے، ایسے میں آپ دیگر بارسوخ خانقاہوں کے سجادگان، قائدین اور اہل ثروت کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- پیغام دینے کے حق دار تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کام کا حق ادا کر چکے ہوں اور اپنی ذمہ داریوں سے پوری طرح مطمئن ہوکر سبک دوش ہو چکے ہوں- ہم جامعہ البرکات کے قیام کو پہلا پڑاؤ تصور کرتے ہیں اور بفضلہ تعالیٰ ابھی ہمت ٹوٹی نہیں ہے-

جامعہ البرکات کے قیام کے بعد ہمارے حوصلے بڑھے، لوگوں نے ہمارے کام کو سراہا، دستِ تعاون دراز کیا، ہمارے مشن، کو اپنا مشن اپنی تحریک تصور کیا تو اس سے حوصلوں میں اور اضافہ ہوا- خدا توفیق دے تو کرنے کو بہت کچھ ہے- کام بہت باقی ہے، ابھی تو کارواں تیار ہوا ہے، ابھی بہت کچھ کرنا ہے ذرا نظر اٹھا کر دیکھئے بہت ٹوٹے ہوئے دل ملیں گے، بڑی تاریک راہیں نظر آئیں گی- محروم آنکھیں اور مایوس چہرے دیکھنے کو ملیں گے- دردمند دل اور مضطرب نگاہوں کے ساتھ زمانے کو دیکھئے، کیے ہوئے سارے کام بہت چھوٹے نظر آئیں گے-

ہمیں امت کے محروم طبقے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے- میں جامِ نور کے توسط سے نہ

صرف بارسوخ سجادگان، قائدین اور اہلِ ثروت بلکہ ملّت کے ہر عقلِ سلیم رکھنے والے اور
خود کو ذمہ دار محسوس کرنے والے فرد سے یہ گزارش کرتا ہوں آپ حضرات جہاں بھی ہیں
جس معاشرے میں ہیں، جس منصب پر ہیں، اپنی اپنی سطح پر اپنے اپنے طریقے سے حسبِ
توفیق ان لوگوں کے رفیق بن جائیں جن کو حالات نے پسماندہ کر دیا ہے- اگر ایک بچے کو
تعلیم دلا سکتے ہیں، دلائیں- ایک بھوکے کو کھانا کھلا سکتے ہیں، کھلائیں- کسی مدرسے کی
خدمت کر سکتے ہیں کریں- ایک بیوہ کو سلائی مشین دلا سکتے ہیں دلائیں- کسی مدرسے میں
ایک کمرہ تعمیر کر سکتے ہیں کریں- کسی ایک فرد کو نوکری دلا سکتے ہیں دلوا دیں- یا صرف کسی
وقت کے مارے سے مسکرا کر خیریت دریافت کر سکتے ہیں تو وہ ہی کر دیں لیکن کچھ نہ کچھ
کریں ضرور- رب العزت تو دلوں کے حال دیکھتا ہے- کیا پتہ کون سی ادا آپ کی اس کی
بارگاہ میں مقبول ہو جائے- میرا تو بس یہی پیغام اور گزارش ہے-

سوال:- کیا جامعہ البرکات کی طرح جدید سہولتوں سے آراستہ کسی دینی مدرسے کا
قیام بھی آپ کے منصوبے میں شامل ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- اہلِ سنت و جماعت کے جو مدارس موجود ہیں وہ بہت
معیاری تعلیم فراہم کر رہے ہیں- مدارس اسلامیہ اپنی عمارت سے نہیں اپنے تعلیمی معیار اور
طلبہ کی صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور اور مقبول ہوتے ہیں- اور آپ اگر عمارات کے حوالے
سے دیکھیں تو ہماری جماعت کے مدارس کے پاس عالیشان عمارتیں بھی ہیں، جدید سہولتوں
سے مزین کتب خانے بھی ہیں، ڈائننگ ہال بھی ہیں- کمپیوٹرس کی سہولتیں بھی علما کرام کو
مدارس میں فراہم کی جا رہی ہیں- میرا ماننا ہے کہ ابھی جتنے مدارس موجود ہیں اُن پر محنت کی
جائے، ان کے ساتھ عوام تعاون کر کے ان کو شاہکار دینی اداروں کی شکل تا کہ اُن مدارس
سے باصلاحیت و باوقار علمائے حق فارغ ہو کر دین وسنّیت کی خدمات انجام دیں سکیں-

جامعہ البرکات میں بھی فارغ علما اور حفاظ کے لیے کورس چلایا جائے گا جس کا میں
پہلے آپ سے ذکر کر چکا ہوں- جہاں تک دینی مدرسہ کھولنے کی بات ہے تو میں عرض کروں
کہ میرے بڑے بیٹے سید محمد امان سلمہ کی دلی خواہش ہے کہ خانقاہِ برکاتیہ کی سرپرستی میں

ایک مدرسہ علی گڑھ میں کھولا جائے جو اپنے تعلیمی معیار، سہولتوں کی فراہمی، طلبہ کی
Quality کے حوالے سے ایک امتیازی شان کا حامل ہو- اس مدرسے میں دینی تعلیم کے
ساتھ ساتھ علمائے کرام کے لیے چھوٹے چھوٹے Vocational courses کھولنے کی
بھی تمنا ہے- آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے جامعہ
البرکات سے ملحق زمین حاصل کی جا چکی ہے- آپ سب دعا کریں کہ اس خواہش کی تکمیل
بخیر و خوبی ہو جائے- (آمین)

سوال:- اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی علیہ الرحمہ نے اپنے دس نکاتی
پروگرام میں جماعت کی جانب سے معیاری اخبارات کا اجراء بھی شامل رکھا تھا، مگر پچھلے سو
سالوں میں اب تک ملک گیر سطح کا کوئی نمائندہ اخبار نہیں نکل سکا، آپ کی نظر میں موجودہ
برقی دور میں اس اہم نکتے کی اہمیت و ضرورت کس قدر دوچند ہوگئی ہے اور اس کی تکمیل آج
کس طرح ممکن ہو سکتی ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- بڑا ضروری اور اہم سوال آپ نے پوچھا- یہ حقیقت
ہے کہ جماعت اہل سنت میں معیاری اخبارات، رسائل اور جرائد کی کمی شدت کے ساتھ
محسوس کی جا رہی ہے- میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا
کہ اخبارات اور رسائل کسی بھی جماعت یا تنظیم کے معیار کو قائم رکھنے اور اس کو شہرت دوام
بخشنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں- اگر آپ مسلک کی ترویج و اشاعت بڑے پیمانے
پر کرنا چاہتے ہیں، دعوت و تبلیغ کے پیغام کو گھر گھر پہنچانا چاہتے ہیں تو عوام سے
communication gap ختم کرنا ہوگا- المیہ یہ ہے کہ ہماری پوری جماعت کے پاس
ایک بھی اخبار نہیں حتیٰ کہ Fortnightly خبر نامہ تک نہیں ہے- آپ نے بہت صحت مند
پہلو کی طرف نشان دہی فرمائی، میرا دل خوش ہوا کہ ہماری نوجوان نسل کی فکر کا دائرہ بہت وسیع
ہے- اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے- ایک ایسا اخبار منصۂ شہود پر آئے جس
میں عالمی اور عوامی خبروں کے علاوہ وہ تمام لوازمات ہوں جن کی قوم کو، جماعت کو اشد
ضرورت ہے- ہماری جماعت کے موقف کی بہترین ترجمانی ہو- ہمارے جائز مطالبات کی

بھرپور عکاسی ہو اور یہ کام کوئی بہت مشکل نہیں ہے کوئی بلند ہمت عزم کی شمشیر لے کر اٹھ جائے اور اسے ملت کے مخلص افراد کا بھرپور تعاون حاصل ہو جائے- اِن شاءاللہ یہ معاملہ بھی بخیر وخوبی سر ہو جائے گا بلکہ میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ کی پوری ٹیم بہت بلند ہمت، باعزم اور Dynamic ہے، پڑھے لکھے نوجوان ہیں، کام کرنے کی صلاحیت ہے- زمانے پر نظر ہے، فکر میں گہرائی اور گیرائی ہے- آپ حضرات اس کام کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں- ہم آپ کے لیے دعائیں بھی کریں گے اور جس قابل ہیں تعاون بھی کریں گے-

جہاں تک رسائل اور جرائد کا سوال ہے وہاں حالات تقریباً اطمینان بخش ہیں- پچھلے کچھ عرصے میں ہمارے رسائل اور جرائد کی تعداد بھی بڑھی اور معیار میں بھی کافی خوش گوار اضافے ہوئے ہیں-

سوال :- ملت کا ترجمان ماہنامہ جام نور پچھلے ۵؍سالوں سے تحریک کی شکل میں اپنے علمی، فکری، تحقیقی، تحریکی اور صحافتی مشن میں مصروف ہے، آپ کی نظر میں اس مشن کی اہمیت ومعنویت کیا ہے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- کسی بھی مشن یا تحریک کی کامیابی کا اندازہ جلدی نہیں لگایا جا سکتا- چاہے وہ صحافتی تحریک ومشن ہو یا ثقافتی، بڑی سعی کرنی ہوتی ہے عوام تک پہنچنے کے لیے، عوام کے دل میں گھر کرنے کے لیے- آپ حضرات نے پچھلے سالوں میں بڑی جانفشانی کے ساتھ کام کیا اور حضرت علاّمہ ارشد القادری صاحب علیہ الرحمۃ کی اس علمی وراثت کی بہت خوب حفاظت کی-

جام نور کے بارے میں میرے والد ماجد حضور احسن العلما علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ جام نور ''کفر وگمراہی کو تڑپا تڑپا کر مارتا ہے'' آپ نے بڑی صلاحیتوں کے ساتھ اس رسالہ کا احیاء کیا اور رسالے کو تمام جدید تقاضوں کے ساتھ منظرِ عام پر لائے- جام نور کی اہمیت اس بات سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ اس رسالے سے بڑے بڑے باصلاحیت نوجوان عالم اور صاحب نسبت افراد وابستہ ہیں جن کو اپنی دیرینہ روایات کا بھی اعتراف ہے اور موجودہ دور کے تقاضوں کا علم بھی اور یہ بڑا حسین اور صحت مند امتزاج ہے کسی بھی صحافتی کام کے لیے-

آپ مزید سے مزید تر جستجو کیجیے، پھل کا انتظار مت کیجیے- جزا رب تعالیٰ کی بارگاہ میں محفوظ ہے- ایک بات ضرور کہوں گا کہ یہ کوشش جاری رہے کہ مضامین کا انتخاب کرتے وقت بہت باریک بینی سے کام لیجیے- کوئی بھی ایسی بات نہ ہو جس سے خلفشار یا اختلاف کا معمولی سا بھی امکان ہو- یہ اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ اکثر اچھی چیزیں بھی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بری طرح متاثر ہو جاتی ہیں- صحافت بے باک ہو لیکن دل شکنی اور دل آزاری سے پاک ہو- آپ غیر جانب دارانہ رویہ کے ساتھ کام جاری رکھیں- مجھے پوری امید ہے اِن شاءاللہ ایک دن ''جام نور'' صحافت کی دنیا میں سنگ میل ثابت ہوگا-

سوال:- آخر میں عوام اہل سنت اور خصوصاً خانقاہ مارہرہ کے متوسلین اور عقیدت مندوں کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

پروفیسر سید محمد امین قادری:- میں خانقاہِ برکاتیہ کے متوسلین، معتقدین، عوام اہل سنت کی خدمت میں بس یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ اس وقت جماعتِ اہلِ سنّت کی شیرازہ بندی کے لیے کمر بستہ ہوں- شریعت پر مضبوطی سے قائم رہیں- میرے جدِ اعلیٰ حضرت سید شاہ میر عبدالواحد بلگرامی نے ارشاد فرمایا کہ شریعت بال ہے اور طریقت مانگ- تو جتنے اچھے بال ہوں گے مانگ بھی اتنی اچھی نکلے گی- بس اسی قول کو نظروں میں رکھیں- شریعت کو مضبوط کر کے ہی معرفت کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں- مذہب پر مضبوطی سے قائم رہیں، مسلک حق کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیں- حق کہیں، حق سنیں، حق پر چلیں- دین میں، عشقِ رسول میں کوئی سمجھوتہ نہیں، کوئی compromise نہیں- اختلاف اور منفی کاموں سے مکمل پرہیز- کسی سے بلا وجہ الجھنے کی ضرورت نہیں- لیکن ناجائز اور باطل طاقتوں سے دبنے کا کوئی سوال نہیں- جہاں اور جس جگہ رہتے ہیں وہاں حسبِ ضرورت لوگوں کی مدد کریں- اپنے بچوں کی صحیح پرورش کریں- اچھی تعلیم دیں اور اس سے اچھی تربیت دیں- نئی نسل کو اسلامی اقدار کا پاسدار بنائیں- تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں رہیں- روٹی چاہے آدھی کھائیں لیکن بچوں کو ضرور پڑھائیں -□□□

(شمارہ دسمبر ۲۰۰۷ء)

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی

شیخ الحدیث: دارالعلوم نورالحق، چرہ، محمد پور، فیض آباد (یوپی)

لمبا قد، وجیہ صورت، پرکشش آنکھیں، گورا رنگ اور اس پر مستزاد خوبصورت داڑھی، یہ ہیں امام علم وفن مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی، جو غیر منقسم ہندوستان کے مذہبی حلقے میں ہیئت و ہندسہ، توقیت و مساحت، جبر و مقابلہ، اثماطیقی، علم الاسطرلاب، علم الربع المجیب، علم الحساب، علم لوگارثم، علم جفر، زیچ، رمل و تکسیر، مثلث کروی اور علم الابعاد جیسے نایاب اور کمیاب علوم وفنون پر بیک وقت تنہا دسترس رکھتے ہیں- آپ کی پیدائش بہار کے ایک پسماندہ علاقے بائسی ضلع پورنیہ میں غالباً ۱۹۳۴ء میں ہوئی - ابتدائی تعلیم قاعدہ بغدادی سے شرح جامی تک اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور پھر جامعہ مظہر اسلام مسجد بی بی جی بریلی پہنچ گئے، جہاں آپ کو ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاری اور مولانا سلیمان بھاگل پوری علیہما الرحمہ کی صحبت میسر آئی اور آپ نے درس نظامیہ کی تکمیل کی- آپ کی ذہانت اور علمی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر مولانا ثناء اللہ مئوی شیخ الحدیث جامعہ مظہر اسلام نے آپ کو اسی ادارے میں بحیثیت مدرس رکھ لیا، یہاں آپ نے پانچ سال گزارے- اس کے بعد ہندوستان کے مختلف اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے دارالعلوم نورالحق، چرہ، محمد پور، فیض آباد تشریف لے گئے جہاں پچھلے پندرہ برسوں سے آپ طالبان علوم اسلامیہ کو علوم عقلیہ ونقلیہ کی تعلیم دے رہے ہیں- اپنے پچاس سالہ دور تدریس میں آپ نے ہزاروں تلامذہ پیدا کیے- تدریس کے ساتھ آپ نے لوح وقلم سے بھی رشتہ رکھا، جس کے نتیجے میں ہیئت وفلکیات سے متعلق بے شمار مضامین ہندو پاک کے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے- آپ کی مختصر تصانیف کی فہرست میں ''ٹی وی ویڈیو کی تحقیق'' قابل ذکر ہے-

سوال:- دعوت وتبلیغ کے دیگر علوم نقلیہ کے ساتھ منطق وفلسفہ کی کیا اہمیت ہے اور ان کو سیکھنا کتنا ضروری ہے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- دعوت وتبلیغ فقط یہ نہیں ہے کہ عوامی ہجوم کے سامنے پورے گھن گرج کے ساتھ اپنی لچھے دار تقریر سنا کر نعرۂ تکبیر کی گونج میں داد وتحسین حاصل کیے جائیں- بلکہ دعوت وتبلیغ کے دائرہ کار میں مناظرانہ داؤ پیچ اور علم کلام کے پیچیدہ مسائل بھی داخل وشامل ہیں- اور حقیقی دعوت وتبلیغ اپنے ہم نواؤں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر خوش کرنے کا نام نہیں بلکہ مختلف الخیال اقوام کے مابین ایک سچی حقیقت کو منوانے کا نام ہے، اس لیے جب تک دعوت وتبلیغ میں منطقیانہ استدلال اور فلسفیانہ توجہ وتنقیح نہ شامل ہو ایسی دعوت وتبلیغ ہرگز مؤثر نہیں ہوسکتی- رہی محض تقریر وخطابت تو اس کے لیے علوم نقلیہ کی بھی حاجت نہیں، اس میں فقط زبان زوری اور فرضی کہانی ہی کافی ہے-

سوال:- تعلیم وتعلم میں آج نئی نسل کی طبعیتیں سہل پسندی کی طرف مائل ہیں، یہی وجہ ہے کہ طلبۂ مدارس علم منطق وفلسفہ سے بیزاری ظاہر کررہے ہیں، ایسے میں ان علوم وفنون کا مستقبل کیا ہے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- آج کل حصول علم نہ تو برائے دین ہوتا اور نہ برائے افزائش ہوش وخرد بلکہ یہ (باستثناء بعض) فقط اور فقط برائے تحصیل معاش ہوتا- اور یہ بات چونکہ ان زیرہ گداز علوم وفنون پڑھے بغیر ہی حاصل ہوجاتی اس لیے آج نئی نسل کی طبیعت صعوبت انگاری کے بجائے سہل پسندی کی طرف مائل ہیں- لیکن اس کساد بازاری کے باوجود کچھ ایسے جفاکش طلبہ بھی نکل آتے ہیں جو ہر قسم کی جدوجہد کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں- خود میری درسگاہ کا یہ حال ہے کہ کبھی بھی معقولات اعلیٰ اور ہیئت وہندسہ کے طلبہ سے خالی نہ رہی-

سوال:- یونیورسٹیز کے ماہرین تعلیمات اور دانشوران کہتے ہیں کہ مدارس میں آج تک منطق وفلسفہ اور ہیت وفلکیات کی جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ خالص قدیم

نظریات پر مبنی ہیں اور مدارس کے اساتذہ وطلبہ ان علوم سے متعلق جونئی تحقیقات اور جدید نظریات سامنے آرہے ہیں ان سے واقف نہیں ہوتے، تو یہ ایک طرح سے تضیع اوقات ہے، یہ الزام کہاں تک درست ہے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی: - آپ کا یہ سوال، وقت کا ایک اہم سوال ہے، اس انداز فکر میں نہ صرف یونیورسٹیوں کے ماہرین تعلیمات منفرد ہیں بلکہ علما کا وہ طبقہ جس کا فلسفہ قدیم سے تعلق نہیں رہا وہ بھی ان لوگوں کے ہم خیال ہیں۔مگر دراصل بات یہ ہے کہ یہ حضرات اس امر سے ناواقف ہوتے ہیں کہ مدارس میں منطق وفلسفہ اور ہیئت وہندسہ کا کونسا باب اور کونسا چیپٹر (chapter) پڑھایا جاتا ہے اور اس کے پڑھانے کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے۔ یہ حضرات تو یہ سمجھتے ہیں کہ قدیم فلسفے کی نظریات کو سمجھا کر طلبہ کو وقت کا سقراط اور بقراط بنایا جاتا ہے۔ جس کی اس دور میں قطعاً ضرورت نہیں۔ اس لیے یہ حضرات منطق وفلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ کاش اگر یہ حضرات یہ سمجھ لیتے کہ مدارس میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہاں قدیم فلسفہ کے کسی خاص نظریہ کو سامنے رکھ کر اس کی توضیح کی جاتی ہے اور پھر اس پر مکمل بحث وتمحیص فقط اس لیے ہوتی کہ کس طرح باطل نظریات کا رد کیا جاتا ہے اور کس طرح کسی کے غلط اعتراض کی دھجیاں بکھیری جاتی ہے۔ کس طرح کسی کمزور بات کو ٹھوس بنایا جاتا ہے اور کس طرح بظاہر ٹھوس باتوں کے پرخچے اڑائے جاتے ہیں۔ اس طرح کی تعلیم سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کے ذہن میں ایک پائیدار بالیدگی اور صاف ستھری نکھار پیدا کی جائے تاکہ موقع اور محل کے مطابق طلبہ اس ذہن کو استعمال کرسکے۔

طریقہ تعلیم کے اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد پھر کسی دانشور کو یہ گلہ نہ ہونا چاہیے کہ فلسفہ قدیم کی مروجہ تعلیم قطعاً بے سود اور بے کار اور سراسر تضیع اوقات ہے۔ رہی بات ہیئت وفلکیات کی تو نہ ان میں کوئی خاص بنیادی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ قابل توجہ نئے نظریات سامنے آئے ہیں بلکہ اس میں دور ایجاد سے آج تک بتسلسل وہی نظریات پیش کیے جارہے ہیں جو بطلیموس کے دور سے چلے آرہے ہیں شاید کسی کے ذہن میں یہ بات پیدا ہو کہ

نظریات میں خاصی تبدیلی ایک امر متحقق ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ بطلیموس نے کرۂ ارض کو ساکن اور دیگر سیارات بشمول شمس کو متحرک قرار دیا تھا لیکن اب قرص خورشید کو ساکن اور دیگر سیارات بشمول کرۂ ارض کو متحرک مانا جاتا ہے۔ ہاں یہ سوال صحیح ہے لیکن میری گذراش یہاں یہ ہے کہ ان سیاروں کے ذریعہ ہمیں لیل ونہار کے بڑھنے گھٹنے، روزہ ونماز کے اوقات، تعدیل ایام، میول، اوساط سیارات اور تقویات اور دیگر لوازمات کو معلوم کرنے کی ضرورت وحاجت پڑتی ہے۔ ان چیزوں کو معلوم کرنے کے لیے آپ خواہ اوقات کو گردش کناں مانئے، خواہ زمین کو متحرک فرض کیجیے، اس سے حساب میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم رصدگاہوں کی مدد سے ترتیب دیئے ہوئے زیجات اور آج گرینچ (Greenwich) میں تالیف کیے المنک میں درج شدہ حساب میں کوئی معتد بہ فرق نہیں ہوتا۔ اس کا عملی مظاہرہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ بندۂ ناچیز نہ تو کسی اسکول میں پڑھا ہے اور نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں جاکر ایسا علم حاصل کیا ہے جسے آج لوگ عصری علوم کہتے ہیں بلکہ فقط مدرسہ کی چہار دیواری میں رہ کر عربی، فارسی کی کتابوں سے ان علوم وفنون کا مطالعہ کیا جسے لوگ علوم قدیمہ یا فلسفہ قدیمہ کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود جب یہ مسئلہ چھڑا کہ ۲۰۰۰ء کی ماہ فروری ۲۹؍کی ہوگی یا ۳۰ کی یا یہ بحث اٹھی کہ بے کٹی پٹی ۱۷؍اونٹ کی تقسیم کے مفروضہ واقعہ کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب کرنا صحیح ہے یا نہیں یا جب سیدنا حضور مفتی اعظم کی طرف منسوب پاکستانی جعلی فتویٰ کو اچھالا گیا یا جب یہ سوال اٹھا کہ قمری ماہ کی ۲۷؍تاریخ کو بوقت غروب آفتاب افق کے نیچے جہاں چاند ہوتا ہے وہاں تک نگاہ پہنچنے کے لیے ناظر کو سطح ارض کتنی بلندی پر ہونا چاہیے یا جب یہ سوال اٹھا کہ قمری ماہ کی ۱۰؍تاریخ کو سورج گہن ہوسکتا ہے یا نہیں یا جب ہیوسٹن (امریکہ) کی سمت قبلہ علما کے مابین موضوع بحث بنی یا جب ہالینڈ اور بلیک برن (Black Burn) کے تعلق سے یہ سوال اٹھا کہ وہاں سال کے کن کن تاریخوں میں عشاء کا وقت نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ تو ان ساری باتوں کا تسلی بخش مدلل صحیح صحیح جواب اس بندۂ ناچیز نے ان ہی علوم سے دیا جسے لوگ علوم قدیمہ کہتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہوسٹن کی سمت قبلہ معلوم کرنے کے لیے جب یہی علما جوفلسفۂ قدیمہ سے بے زاری کا اظہار کرتے ہیں، عصری علوم سمجھ کر اپنے سامنے گلوب کو رکھ کر حل کرنا چاہا تو اور الجھ گئے اور جب اس کو سامنے رکھ کر مسئلہ کو سلجھانا چاہا تو نتیجہ غلط نکلا اور جب قطب نما کی سوئی گھما کر مسئلہ کو حل کرنا چاہا تو نتیجہ صفر نکلا- لیکن جب ہیئت کے ایک دائرہ کو سمجھایا گیا اور مثلث کروی کے اصول کو بتایا گیا تو ساری گتھیاں ایک دم سلجھ گئی-

البتہ یونیورسٹیوں کے ماہرین تعلیمات کا یہ فرمان صحیح ہے کہ جو نئی تحقیقات اور جدید نظریات سامنے آرہے ہیں ان سے ہمارے اہل مدارس کو واقف ہونا ضرور چاہیے کہ علم شئ بہ از جہل شئ-

سوال:- اگر ایسا ہے تو کیوں مدارس میں آپ لوگ اس قدیم نصاب کو پڑھا رہے ہیں؟ اگر پڑھانا ہی ہے تو جدید نظریات پر مشتمل کتابیں کیوں نہیں لکھی جاتیں؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- ابھی ابھی آپ کے سوال نمبر۳ کے جواب میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ اس چوتھے سوال کے لیے بھی کافی ہے تاہم تھوڑی گفتگو اس سوال پر بھی کر لینا بہتر ہے- بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے مدارس کا بنیادی مقصود مذہبی تعلیم اور اس کا عروج وفروغ ہے- اس غرض وغایت کی تکمیل کے لیے وہ نصاب تعلیم جو صدیوں پیشتر ترتیب دیئے گئے ہیں وہ نہایت ہی محکم، جامع اور ٹھوس ہیں- ہمارے مذہب میں نہ تو کوئی نیا نظریہ جنم لیتا ہے اور نہ کوئی جدید خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس کے لیے نئے نصاب اور نئی تصنیف کو وجود میں لانے کی ضرورت ہو ہمارے اسلاف کا عطا کردہ اثاثہ ہمارے لیے کافی ہے- ہاں یہ صحیح ہے کہ کچھ نئے ایجادات بھی ایسے عالم وجود میں آئے ہیں کہ جس کا تعلق خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ ہمارے معتقدات سے تو نہیں ہمارے عملیات سے ہے- اس کے لیے ہمیں نئی کتابیں لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ ان اختراعات کے اصول ایجاد سے واقف ہونا ہی کافی ہے- اور یہ حاجت تھوڑی بہت توجہ کر کے یا ان ایجادات کے ماہرین سے رابطہ پیدا کرنے سے پوری ہو جاتی ہے-

سوال:- کہاں جاتا ہے کہ علوم عقلیہ میں ایسے بہت سے قدیم علوم ہیں، برصغیر

میں جن کا تنہا علم آپ کو ہی ہے، وہ کون سے علوم ہیں؟ آپ نے ان کو کس سے سیکھا؟ اور دور جدید میں ان کی کیا اہمیت ہے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- اس سوال نمبر۵ میں آپ نے جو یہ فرمایا کہ ''کہا جاتا ہے کہ علوم عقلیہ میں ایسے بہت سے علوم قدیمہ ہیں، جن کا تنہا علم برصغیر میں آپ کو ہی ہے وہ کون سے علوم ہیں''؟ میرا خیال ہے کہ ایسا کہا جانا غلط فہمی پر بھی مبنی ہوسکتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اس بات کے کہنے والوں کے سامنے ایک ایسا شخص نہیں آتا جو ان علوم سے واقف ہوں- ساتھ ہی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ سارے علوم قدیم (بہ معنی متعارف) ہیں- یہ علوم تو اپنی ایجادات سے آج تک ہر قوم میں، ہر میدان میں سکہ رائج الوقت کی طرح ٹھنا ٹھن اور کھنا کھن رواں دواں ہیں- رہا اصل سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ مختلف علوم وفنون کا حاصل کرنا شخصی مزاج اور پائیدار ذوق وشوق پر منحصر ہوتا ہے-

ہم سنتے آرہے تھے کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان ایسے ایسے فلاں فلاں علوم کے ماہر تھے ان علوم میں ان کی ایسی ایسی فلاں فلاں تصنیفات ہیں اور جب میں مدرس ہوا تو اچانک میرے ذہن میں یہ بات پیدا ہوئی کہ ان علوم وفنون کے موجدین تو ہمارے ہی طرح انسان تھے انہوں نے ان علوم کو ایجاد کیا اور بعد میں آنے والے حضرات نے اس کی تنقیح کی اور جس زبان میں ان علوم وفنون کو مدون کیا گیا ہے اس زبانی کو قدر معتد بہ ہم جانتے ہیں، تو کیا سچ مچ ہم اتنے نادان ہیں کہ محنت کرنے کے باوجود بھی ہم انہیں نہیں سمجھ سکتے؟ نہیں نہیں ہرگز ایسا نہیں-

یہ خیال آتے ہی ان فنون سے تعلق رکھنے والی کتابوں کی ہم نے تلاش جاری رکھی، بالخصوص امام احمد رضا کی تصنیفات کا جستجو کامل رہا- بحمدہٖ تعالیٰ مجھے کتابیں ملتی گئیں اور ہم محنت کرتے رہے- نتیجے میں ہم نے بہت کچھ پایا اور اسے موقع پر استعمال کرتا رہا- اس طرح میری ہمت بڑھتی رہی اور ہم آگے بڑھ کر دوسرے فن کی طرف مائل ہوتے رہے- اس طرح بحمدہٖ تعالیٰ مجھے رب قدیر نے امام احمد رضا اور مرشد برحق غوث العالم سیدنا سرکار حضور مفتی اعظم ہند کے وسیلے سے غوثِ پاک کا صدقہ عطا فرماتا رہا- اور پھر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ

ہیچمداں درسگاہوں میں چلنے والی معیاری کتابوں کے علاوہ، ہیئت وہندسہ، توقیت ومسافت، جبر ومقابلہ، اثما طیقی، مثلث مسطح، مثلث کروی، زیج، اعمال ستنیہ، عمل بالخطائین، علم الاسطرلاب، علم الربع المجیب، علم الحساب، علم لوگارثم، علم جفر، مناظر ومرایا، رمل وتکسیر، علم الابعاد وغیرہ وغیرہ علوم وفنون کا مطالعہ جاری رکھا- ان علوم وفنون میں ظاہراً میرا کوئی استاذ نہیں-

ان علوم وفنون کی افادیت کا تعلق کسی بھی دور یا کسی بھی عصر سے مربوط نہیں بلکہ ہر زمانہ خواہ ماضی ہو یا حال یا مستقبل خواہ قدیم ہو یا جدید ہر دور میں یہ علوم یکساں نافع، البتہ وہ حضرات جوان علوم وفنون سے ناواقف ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ اب ان علوم کا زمانہ نہ رہا- لیکن فتاویٰ رضویہ کے مطالعہ کرنے والوں پر قطعاً یہ مخفی نہیں کہ امام احمد رضا نے فرمایا ہے کہ ان میں سے اکثر علوم دینی امور میں نافع ومعاون اور بہت سے مسائل میں ان کے بغیر مفتیان کرام کو چارہ کار نہیں-

سوال:- عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ آپ بہت دنوں تک کسی ایک ادارے سے وابستہ نہیں رہ سکتے، ایسا کیوں؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- علما کرام خواہ وہ کسی ادارہ کے استاذ ہوں یا کسی دارالافتاء کے مفتی، کبھی انہیں انتقال مکانی ناگزیر ہو جاتا ہے- اس کا دراصل سبب یہ ہے کہ رزق انسانی کو وہیں کھینچ کر لے جاتی ہے جہاں کی رزق اس کے مقدر میں ہوتی ہے- لیکن ظاہراً بھی اس کے کچھ اسباب ہوتے ہیں، مثلاً کہیں کا ماحول موافق نہیں، کہیں کو آب وہوا مساعد نہیں، کہیں شریک کار مناسب نہیں اور کہیں عزت نفس کا مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ- میرے لیے بھی بظاہر ایسے حالات واسباب پیدا ہوتے رہے جس کی وجہ سے مجھے بھی انتقال مکانی کرنا پڑا یہ تو میرے احباب واعزہ کی کرم فرمائی ہے کہ انہوں نے ان حالات کا جائزہ لیے بغیر مجھے تنک تابی اور سیماب پائی کی صفت سے مشہور کر دیا- لیکن اگر تھوڑی دیر میرے انتقال مکانی کے ڈاٹا کو دیکھا جائے تو وہ ایسا نہیں مثلاً، ۱۵/سال مظہر اسلام بریلی شریف، ۳/سال دارالعلوم پورنیہ بہار اور پھر ۳/سال منظر اسلام بریلی شریف،

۸/سال سلطانپور اور پھر ۸/سال بھاگلپور اور ۶/سال بدایوں شریف اور آج تقریباً ۱۱/سال سے فیض آباد میں زندگی گزار رہا ہوں- البتہ درمیان میں ایسا بھی ہوا کہ ایک سال کچھوچھہ شریف، ایک سال دارالعلوم غریب نواز الہ اباد اور ۲/۳/سال براؤں شریف میں بھی رہنا ہوا- اس ڈاٹا پر اگر گہری نگاہ ڈالی جائے تو میری طرف منسوب تنگ تابی اور سیماب پائی کوئی ایسی خبر نہیں کہ جس سے منہ میں بھونپو لگا کر پورے جگ کو بیدار کیا جائے-

کچھ لوگ انتقال مکانی میں یہ نکتہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح بستہ پانی بہت جلد خراب اور چشمہ جاری ہمیشہ صاف اور شفاف رہتا ہے، اسی طرح علما کرام کا بھی حال ہے کہ اگر وہ ایک جگہ جم کر رہ جائیں تو لوگ ان کی قدر نہیں کرتے بلکہ وہ گدلا معلوم ہوتے ہیں اور جب برابر **سیروا فی الارض** کی تفسیر بن کر انتقال مکانی کرتے رہے تو ماء جاری کی طرح وہ ہمیشہ پاک وصاف رہتے ہیں-

سوال:- اشرفی ورضوی نزاع میں آپ کی حیثیت ایک فریق کی رہی ہے، مگر اب یہ جنگ سرد خانے میں پہنچ گئی ہے لیکن دلوں میں جو دوریاں پیدا ہوئیں اس کے نتیجے میں اہل سنت میں ایک زبردست انتشار برپا ہوا، کیا مصالحت کی کوئی صورت ہے؟ اگر ہے تو آپ حضرات پیش قدمی کیوں نہیں کرتے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی:- کچھ علما کے مابین ایک علمی اختلاف پیدا ہوا لیکن ان علما کے ماننے والوں نے اسے شرعی اختلاف سمجھ کر ایک نزاع کی صورت پیدا کر دی اور پھر جو کچھ ہوا دنیا اس سے اچھی طرح واقف ہے- ہر جنگ اپنی انتہا کو پہنچ کر سرد ہو جاتی ہے اس جنگ کا بھی یہی حال ہوا- اس جنگ کے اثرات اگرچہ آج بھی کچھ دلوں میں موجود ہیں لیکن ہم ان لوگوں سے کچھ الگ تھلگ مزاج رکھتے ہیں- ہم نے اس جنگ کو تا قیامت بھڑکنے کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ ہم نے حالات استوار کرنے کی کوششیں کیں- آج آپ کے جد کریم ہوتے تو وہ اس بات کی گواہی دیتے- اس لیے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے ہمنواؤں سے سمجھے بوجھے میرا کچھوچھہ تشریف آنا جانا شروع ہوا- اور آج بھی ہم کچھوچھہ شریف پہنچتے رہتے ہیں، وہاں کے علما ومشائخ سے ملاقات کرتے رہتے ہیں- اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصالحت

کے لیے ہم نہ صرف کوشاں ہیں بلکہ اس جادہ میں کئی منزل ہم آگے بڑھ گئے ہیں۔

سوال: ۔ (۸) شہادت رویت ہلال کے بارے میں آلات جدیدہ کے تعلق سے آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اسلاف کے موقف اور ان کے نظریات سے ہٹ کر اس سلسلے میں کچھ فیصلے کیے جاسکتے ہیں؟ کیوں کہ شہادت کے لیے آلات جدیدہ کے استعمال کو لے کر مسلمانان عالم میں انتشار برپا ہے؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی: ۔ ثبوت ہلال کے لیے جہاں تک آلات جدیدہ ہمارے مذہب کا ساتھ دے سکتے ہیں اس حد تک اس سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ اس استفادہ میں العیاذ باللہ ہمیں اپنے اسلاف کے موقف سے قطعاً انحراف کی جرأت نہیں۔ جب اسلاف کے بتائے ہوئے اصول پر چل کر بھی ہم اپنے مقصود تک پہنچ سکتے ہیں تو ہمیں انحراف کی کیا حاجت؟ ہم نے کچھ اپنے مواد فراہم کر لیے ہیں کہ ان کی روشنی میں مسلمانان عالم کے انتشار کو دور کیا جاسکتا ہے، انشاء اللہ فرصت ملتے ہی ان مواد سے برآمد نتیجہ کو لے کر جلد ہی بصورت قرطاس جام نور کے دفتر میں ہم پہنچ رہے ہیں۔

سوال: ۔ قارئین اور مجلس ادارت کے لیے آپ کا کوئی پیغام یا تاثر؟

مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی: ۔ جام نور ہماری جماعت کا مؤقر جریدہ اور محبوب ماہنامہ ہے جو عصر حاضر کے بیشتر تقاضوں اور اس کے حل کو اپنے دامن میں سمیٹ کر ہم تک پہنچتا رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں جہاں کہیں چمن چمن کے بوٹے ہیں وہیں کہیں کہیں کانٹوں کی چبھن بھی محسوس ہوتی ہے مگر اس چبھن کی لذت تو وہی محسوس کرسکتا ہے جسے پھول سے محبت ہو۔

گلوں سے ان کو کیا ہو گی محبت
جنہیں نفرت ہو کانٹوں کی چبھن سے

□□□

(شمارہ جون ۲۰۰۴ء)

مولانا قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی

خطیب: نیومیمن مسجد، کراچی، پاکستان

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کیا ہوئی کہ غم، فراق، ہجرت، خانہ بدوشی، مفلسی، جدوجہد اور شکست وریخت کا ایک نیا دور شروع ہوگیا، خاک وخون کی ہولیاں بھی کھیلی گئیں اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ عیدیں بھی منائی گئیں، لیکن اس کے باوجود زمین پر کھینچی ہوئی لکیریں دلوں میں دوریاں پیدا کرنے میں ناکام رہیں، یہی وجہ ہے کہ دونوں ملکوں میں آج بھی دینی، ملی، صنعتی، تجارتی اور خونی رشتے برقرار ہیں، شہزادۂ صدر شریعت مولانا قاری رضاء المصطفیٰ صاحب خطیب نیومیمن مسجد کراچی، حال ہی میں انڈیا کے دورے پر تشریف لائے تھے، ہمیں ان کی ضیافت کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا، موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہم نے موصوف سے دونوں ملکوں کے باہمی دینی، علمی، سیاسی، سماجی حالات پر ایک تفصیلی گفتگو کی۔ قاری صاحب کی ولادت ۱۹۲۴ء میں اجمیر میں ہوئی جب صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ مدرسہ معینیہ کے صدر المدرسین تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے مدرسہ معینیہ میں ہی حاصل کی، پھر جب نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور ان کے احباب نے حضرت صدر الشریعہ کو اپنے قائم کردہ ادارہ مدرسہ حافظیہ سعیدیہ ریاست دادوں علی گڑھ بلا لیا تو قاری صاحب بھی اپنے والد کے ہمراہ علی گڑھ چلے آئے اور وہیں درس نظامیہ کی تکمیل فرمائی، پھر درس حدیث کے لیے خصوصی طور پر امام النحو مولانا غلام جیلانی میرٹھی سے میرٹھ میں سال بھر استفادہ کیا۔ تقسیم کے بعد کئی بار آپ کا پاکستان آنا جانا رہا، بالآخر ۱۹۵۷ء سے مستقل طور پر وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔ آپ اس وقت صوبہ سندھ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی کے ممبر ہیں اور حکومت کی جانب سے بحیثیت نمائندہ مختلف ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔

سوال:- ہندوستان سے آپ نے کب ہجرت کی اور کیوں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- ہندوستان سے میں ۱۹۵۰ء میں اپنے بڑے بھائی علامہ (عبدالمصطفیٰ) ازہری صاحب سے ملنے پاکستان گیا تھا، پھر اس کے بعد جاتا رہا، اس بیچ وہاں کی مشہور و معروف مسجد نیو میمن مسجد کراچی کی امامت و خطابت کے لیے مفتی ظفر علی نعمانی اور دوسرے علما نے مجھے منتخب کر لیا، چوں کہ اس مسجد میں امامت و خطابت سے پہلے دو سال تک میں پاکستان کی دوسری مساجد میں تراویح پڑھا چکا تھا، تو اس طرح سے سفر پاکستان کا آغاز تو ۴۹/۱۹۵۰ء سے ہی ہو چکا تھا، لیکن ۵۷/ ۱۹۵۶ سے میں وہاں مستقل مقیم ہو گیا اور مجھے وہاں کی شہریت بھی مل گئی- اس زمانے میں B. Catagery کا ویزا جسے ملتا تھا، اسے سال میں ۵/ ۶ بار پاکستان آنے جانے کی اجازت ہوتی تھی-

سوال:- آپ نے پاکستان ہجرت کیوں کی؟ کوئی خاص وجہ؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- میں نے پاکستان ہجرت نہیں کی، ۱۹۴۷ء کا سال بڑا ہی خطرناک تھا، وہ گزر گیا، اسی طرح ۱۹۴۸ء کا سال بھی گزر گیا، میں نے بار بار ہجرت کا ارادہ کیا لیکن ہجرت نہیں کر سکا، ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل کا سانحہ پیش آیا، جس کے بعد ملک بھر میں شدید فسادات ہوئے، تین چار مہینے تک حالات نہایت نازک رہے، پھر وہ وقت بھی گزر گیا، مجھے کسی چیز نے ہجرت کرنے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ نیو میمن مسجد کی امامت و خطابت کے لیے وہاں ٹھہرنا پڑا، میں نے یہاں ملازمت بھی شروع کر دی تھی، پھر ۱۹۵۰ء میں ایک سال مزید دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے امام النحو علامہ غلام جیلانی میرٹھی کی خدمت میں مدرسہ اسلامیہ میرٹھ میں رہا، اس لیے ہجرت کا مجھے ایسا کوئی تصور نہیں ہوا-

سوال:- پاکستان کا قیام جس مقصد کے تحت کیا گیا تھا، یعنی مملکت خداداد کا قیام، وہ پورا ہوا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کون لوگ اس کے ذمہ دار ہیں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- قیام پاکستان خالص اسلامی مملکت بنانے کے لیے کیا گیا تھا، قائداعظم محمد علی جناح جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لاتے تو میں وہ منظر دیکھتا

تھا، میں نے ان کی تقریریں بھی سنیں، اس وقت تصور یہ ہوتا تھا کہ پاکستان بن جانے سے عالم اسلام کے لیے ایک متحدہ حکومت قائم ہو جائے گی، چوں کہ پاکستان کے بعد ایران پھر عراق پھر دوسرے عرب ممالک تھے، تو تصور یہ بنتا تھا کہ قیام پاکستان سے عالم اسلام کے اتحاد کا دروازہ کھل جائے گا- جس طرح یوروپین یونین ہے یا دوسرے اتحاد ہیں اسی طرح گمان تھا کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم ممالک کا بھی کوئی مستحکم اتحاد قائم ہو جائے گا- خصوصاً یہی سب باتیں ہجرت پاکستان کا سبب بنیں، ورنہ خواہ مخواہ کوئی اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان نہیں جانا چاہتا تھا- لیکن افسوس کہ قائداعظم محمد علی جناح بہت ہی جلد اللہ کو پیارے ہو گئے اور بہت زیادہ اچھے نتائج سامنے نہیں آ سکے- آج پاکستان میں ایک افراتفری کا ماحول ہے، ۱۹۵۶ء میں آئین اسلام کا نفاذ ہونے والا تھا، لیکن جنرل ایوب صاحب نے مارشل لاء نافذ کر کے اسے نہیں ہونے دیا- اس کے بعد آج تک پاکستان کا ہر دور انقلاب اور مارشل لاء کا دور رہا- اسلامی ریاست کی تشکیل کا جو تصور تھا وہ آج تک وجود میں نہیں آ سکا- آج بھی مسلمان اس کی کوشش میں مصروف ہیں، لیکن اس کوشش کی کامیابی کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں، من جانب اللہ ان کی کوشش بار آور ہو جائے تو ہو جائے لیکن وہاں کے ۸۰/۷۰ فیصد لوگ وہاں کی عام پارٹیوں کے نظریات ہی سے وابستہ ہیں- مشکل سے ۲۵/ ۳۰ فیصدی لوگ ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہو-

سوال:- اس ناکامی کے ذمہ دار کون ہیں؟ عوام یا سیاست دان؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- عوام تو اس کے ذمے دار ہو نہیں سکتے، انہیں کی کوشش سے پاکستان کا وجود عمل میں آیا ہے اور جو کچھ ہوا انہوں نے ہی کیا، ہم عوام کو کچھ نہیں کہہ سکتے اور سیاستدانوں میں بھی بہت سے لوگوں نے کوشش کی لیکن وہ کوشش بھی ناکام رہی- دراصل اس کا ذمہ دار میں فوجی حکومتوں کو سمجھتا ہوں جنہوں نے نہ وہاں پر جمہوریت قائم ہونے دی اور نہ اسلامی حکومت- لہٰذا صرف کہنے کے لیے جمہوریہ اسلامی پاکستان ہے لیکن حقیقت میں نہ تو پاکستان میں اسلامی جمہوریہ ہے اور نہ وہاں اسلامی آئین، کتابوں میں ہے، وہاں کے آئین میں ہے، لیکن وہ آئین عملی سطح پر ناکام ہے-

سوال:-کراچی کو دنیا کے بدامن شہروں میں سرفہرست شمار کیا جاتا ہے، آخر کیوں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:-اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو افغانستان میں روس کے خلاف جہادی بنایا گیا اور جس طاقت نے ہم کو جہادی بنایا وہ ساری دنیا کے سامنے ہے اور پاکستان کے تمام عوام بلکہ پوری دنیا میں اسلام ذہن رکھنے والے جو لوگ ہیں، انہوں نے مل کر افغانستان میں روس کا مقابلہ کیا، جس کے بعد روس کو شکست ہوئی اور وہ ٹوٹ کر بکھر گیا-

جب روس شکست کھا کر واپس ہو گیا اس کے بعد انہی مجاہدین کو پوری دنیا میں دہشت گرد اور Terrorist کہہ کر متعارف کرایا گیا- روس کے خلاف افغانستان میں جو جہادی شریک ہوئے تھے وہ پاکستان کے علاوہ مصر، سعودی عربیہ اور دوسرے عرب ممالک کے افراد بھی تھے، لیکن ۹/۱۱ کے بعد جب افغانستان پر مصیبت نازل ہوئی تو پاکستان چوں کہ جغرافیائی طور پر بھی افغانستان سے متصل تھا اس لیے پوری دنیا میں اسے دہشت گرد ملک کہا جانے لگا- اس پوری تفصیل پر نظر ڈالیے تو کہنا پڑے گا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تو اس طرح ہمارے ساتھ ایک بہت بڑا حادثہ ہوا ہے اور آج بھی القاعدہ، لشکر جھنگوی، لشکر طیبہ، لشکر محمدی وغیرہ وغیرہ جو نام ہیں، یہ ساری تنظیمیں افغانستان میں روس کے خلاف پیدا ہوئی تھیں-

سوال:-لیکن خصوصاً کراچی کی بدامنی کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر آئے دن وہاں چلتی سڑکوں پر بندوق دکھا کر موبائل چھین لینا، چوری ڈکیتی، شادیوں میں افراتفری، مہاجرین اور حکومت میں ٹکراؤ وغیرہ- اس طرح کے بیشتر واقعات پاکستان میں ہی کیوں ہوتے ہیں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:-مہاجرین اور حکومت میں اب تو کوئی جھڑپ نہیں ہو رہی ہے لیکن آپ نے شہری زندگی کے تعلق سے جو کچھ کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی سیاسی جماعتیں ہیں، وہ سب کی سب شکست و ریخت کا شکار ہو چکی ہیں اور عوام کالانعام میں جو

نوجوان ہیں ان کو سنبھالنے والا کوئی بھی نہیں- وہ باہر سڑکوں پر آ کر جو کچھ بھی کر رہے ہیں، لوٹ، مار، ڈاکہ، گاڑیاں چھیننا، موبائل چھیننا وغیرہ وغیرہ ان میں کراچی ہی کی کوئی تخصیص نہیں، پورے پاکستان میں اس طرح کے واقعات ہو رہے ہیں- اس کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں جو نمایاں فرق ہے، اس کو بھی آپ کو مدنظر رکھنا چاہیے، ہندوستان میں ۱۹۴۷ء میں ہی زمیندارانہ نظام، نوابی نظام، جاگیردارانہ نظام سب کا خاتمہ کر دیا گیا، غرض زمین داروں کا جو دباؤ تھا عوام کے اوپر اسے ہندوستان میں ۱۹۴۷ء میں ہی ختم کر دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ پورے ہندوستان میں عوام جمہوریت کی تشکیل میں آزاد ہیں، جب کہ پاکستان میں آج تک سرداری نظام بھی باقی ہے، زمینداری نظام بھی باقی ہے، قبائلی جھگڑے الگ ہیں، اس لیے پاکستانی عوام صرف شہروں میں آزاد ہیں اور باقی شہر سے باہر جائیں تو عوام اپنے قبائلی سرداروں یا زمین داروں کے پابند ہیں، بغیر ان کی اجازت کے وہ اپنا ووٹ نہیں دے سکتے- اگر سرداروں کی مرضی کے خلاف کسی نے ووٹ دیا تو یا تو اس کا گھر جلا دیا جائے گا یا اس کے گھر سے خواتین کو اٹھا لیا جائے گا یا ان کے سر قلم کر دیے جائیں گے- تو اس طرح ہمارے یہاں آزادی صرف شہروں میں ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ۸۰/ فیصد آبادی شہر سے باہر ہے، تو ہماری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ وہاں پر اب تک صحیح معنوں میں جمہوریت قائم ہی نہیں ہو سکی جس کی وجہ سے وہاں افراتفری ہے- نواز صاحب یا بے نظیر صاحبہ یا ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جو جمہوریت آئی تو اس میں بھی سرداری نظام کا خاتمہ نہیں ہو سکا-

بھٹو صاحب نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں، بڑے بڑے کام کیے، چاند کے مسئلے کے تعلق سے بھی انہوں نے بڑی اچھی پیش رفت کی، اس مسئلے کو حکومت سے آزاد کر کے اس کی الگ سے ایک کمیٹی ''رویت ہلال کمیٹی'' کے نام سے تشکیل کر دی- یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے- لیکن سرداری نظام کے خاتمے میں وہ بھی ناکام رہے-

سوال:-متحدہ مجلس عمل کا قیام کیوں کیا گیا تھا اور کون لوگ اس میں شریک تھے؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- ماشاء اللہ آپ کا یہ سوال بہت اچھا اور اہم ہے- قصہ یہ

ہے کہ آج سے تقریباً ۱۰/۱۵ سال قبل جب الیکشن ہوتا تھا تو اس وقت عوام کو یہ سوال بہت ہی پریشان کرتا تھا کہ وہ کس پارٹی کو ووٹ دیں جس سے نظام مصطفیٰ کا نفاذ عمل میں آئے- چونکہ پاکستان میں جمعیۃ علمائے پاکستان، جمعیۃ علمائے اسلام، جماعت اسلامی، اس طرح سے پندرہ جماعتیں تھیں تو عوام نے یہ پوچھنا شروع کیا کہ جب آپ لوگ خود ہی الگ الگ بٹے ہوئے ہیں تو کس کو ووٹ دیا جائے جس سے نظام مصطفیٰ اور نظام شریعت کا نفاذ عمل میں آئے؟ آپ میں سے ہر ایک اسلام کا نام لے رہا ہے جبکہ آپ میں سے ہر جماعت دوسری جماعت کی مخالف ہے-

جب یہ بات جماعتوں کے قائدین کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی بہت پریشان ہوئے اور انہیں ماننا پڑا کہ عوام کا یہ سوال اپنے اندر بہت ہی اہمیت کا حامل ہے- انہوں نے آپس میں میٹنگ کر کے یہ طے کیا کہ ہم لوگوں کو کسی نہ کسی طرح آپس میں متفق ومتحد ہو جانا چاہیے تو انہوں نے پہلے پہل ''ملی یک جہتی کونسل'' قائم کی اس کو سال دو سال تک چلایا، یہ تقریباً ۷/۶ سال پہلے کی بات ہے- اب پھر سوال یہ ہوا کہ اس کونسل کا سربراہ کس کو بنایا جائے تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں وہاں پر جتنی جماعتیں ہیں ان میں سب سے بڑی جماعت بریلوی اہل سنت وجماعت ہے جو میلاد شریف اور نذر ونیاز کے حوالے سے معروف ہے، لہٰذا سب نے یہ طے کیا کہ اکثریت اسی جماعت کی ہے، اس لیے اسی کے کسی فرد کو قائد وسربراہ بنایا جائے- چنانچہ قائد انقلاب، حق وصداقت کی نشانی علامہ شاہ احمد نورانی کو باتفاق قائد منتخب کرلیا گیا- جب وہ قائد منتخب ہو گئے تو اسی ''ملی یک جہتی کونسل'' کا نام بدل کر ''متحدہ مجلس عمل'' رکھ دیا گیا- تاحیات حضرت اس کی قیادت فرماتے رہے، اب خالص اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے، خواہ وہ نظام قرآن کے نام سے ہو، نظام مصطفیٰ کے نام سے ہو یا نظام شریعت کے نام سے ''مجلس متحدہ عمل'' تمام مسلمانوں کے اتفاق سے واحد جماعت کی حیثیت سے سامنے آئی جس کو سب کی حتیٰ کہ اہل تشیع حضرات کی بھی تائید حاصل ہے-

سوال:- اس کے اہم قائدین کون لوگ تھے یا کون ہیں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- اپنی اپنی جماعتوں کے سارے قائدین جمع ہو گئے تھے،

مثال کے طور پر جماعت اسلامی کی طرف سے اس زمانے میں میاں محمد طفیل صاحب تھے، مگر آپ جانتے ہیں کہ جماعت اسلامی میں جب کوئی ایک قائد ہٹ جاتا ہے تو اس کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے، اس طرح ہر جماعت کا نمائندہ مجلس عمل میں شریک رہا- مفتی ظفر علی نعمانی اور دوسرے علمائے اہل سنت بھی اس میں شریک تھے، پنجاب میں تو مجلس کی حکومت بھی قائم ہو گئی-

سوال:- مجلس متحدہ عمل کی کچھ مخالفت بھی کی گئی؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- ہندوستان کے کچھ علما نے اس کی مخالفت کی تھی، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تمام مکاتب فکر کا اجتماع نہیں ہونا چاہیے، اپنے طور پر کوشش کر کے کچھ آگے بڑھنا چاہیے، یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، مختلف علما کی مختلف رائے ہے- یہاں میں ایک بات بتادوں کہ اختلاف رائے ایک الگ چیز ہے، مخالفت الگ چیز ہے، عموماً لوگ دونوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں جس سے افہام وتفہیم میں کافی دشواری ہوتی ہے- میرے خیال میں اختلاف رائے ہونا چاہیے، اس سے مزید سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا ہے، فکر ملتی ہے، دوسرے پہلو سامنے آتے ہیں، اس کے برخلاف مخالفت نہیں ہونی چاہیے، یعنی ایک ہی مسلک کے لوگوں کو آپس میں اختلاف رائے کرنا چاہیے، مخالفت نہیں کرنی چاہیے، مخالفت کرنے سے سارا مقصد ہی فوت ہو جائے گا- یہ بہت بڑا عیب ہے ہمارے اندر کہ ہم اختلاف رائے کو مخالفت بنا لیتے ہیں- حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب مقصد ایک ہے اس کے حصول کے لیے دو شخص کے سامنے دو طریقے ہیں تو ہر شخص دوسرے سے اختلاف رائے تو رکھے، وہ اپنی رائے کو مفید سمجھے، لیکن دوسرے کی مخالفت پر آمادہ نہ ہو-

سوال:- پاکستان میں آج ثبوت رویت ہلال کے کون سے طریقے رائج ہیں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- پاکستانی حکومت نے حکومت وسیاست کی مداخلت سے بالکل آزاد ایک ''رویت ہلال کمیٹی'' کی تشکیل کر دی ہے، اس کی چار صوبائی شاخیں ہیں اور ایک مرکزی کمیٹی ہے، اگر ۲۹/ تاریخ کو مرکزی کمیٹی کو براہ راست شہادت مل جاتی ہے یا صوبائی کمیٹیوں کو شہادت ملتی ہے تو وہ مرکز کو مطلع کر دیتے ہیں، اس کے لیے فون کا سہارا بھی

لیا جاتا ہے، پھر مرکزی کمیٹی رویت کا اعلان کرتی ہے اور پاکستانی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے خبر نشر ہو جاتی ہے اور اجتماعی عید ہوتی ہے- اس کمیٹی کے بارے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ اس میں صرف کسی خاص مسلک یا جماعت کے لوگ نہیں ہیں، ہر مکتب فکر کے لوگ اس میں شامل ہیں اور اس لیے اس کا اعلان سب کے لیے معتبر ہے-

علما کی جماعت کے علاوہ پاکستان میں سائنس سے بھی استفادہ اس طور پر کیا جاتا ہے کہ موسمیات والے بتاتے ہیں کہ آج رویت ممکن ہے یا نہیں، لیکن چونکہ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ **صوموا لرؤیتکم وأفطروا لرؤیتکم فان غُمّ علیکم فاکملوا العدۃ ثلٰثین**، اس لیے موسمیات والوں کے یہ بتانے کے بعد بھی کہ آج چاند کی رویت ممکن ہے، جب تک چاند نظر نہیں آجاتا رویت کا اعلان نہیں ہوتا- اس طرح کا واقعہ امسال بھی پیش آیا، سرحد میں کچھ لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی بھی کوشش کی لیکن وہیں کے مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو اور اگر ابر وغبار میں چاند گم ہو جائے، تو تیس کی تاریخ پوری کر لو- اس سے صاف واضح ہے کہ رؤیت کے امکان کے باوجود گرد وغبار یا اور کسی وجہ سے رؤیت جب تک نہیں ہوتی چاند کا اعلان نہیں کیا جائے گا- تو خلاصہ یہ کہ چاند کے مسئلہ میں پاکستان میں نہایت سکون ہے، آپ کے یہاں ہندوستان میں یہ مسئلہ ہر سال الجھن کا باعث بنتا رہتا ہے، میرے خیال میں سنی، دیوبندی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور اہل تشیع سب ہی مل کر اس طرح کی کمیٹی یہاں بھی تشکیل دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہر سال جو ایک عجیب سا ماحول بن جاتا ہے وہ ختم ہو جائے گا- اس کے علاوہ نکاح وطلاق اور دیگر مسائل میں بھی علما کا موقف اجتماعی طور پر واضح رہنا چاہیے، علما کو ان مسائل کے حل کے لیے بھی مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے، چونکہ یہ میڈیا کا دور ہے اس لیے آپ کو بہت ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ کوئی اچھی بات بھی میڈیا میں جا کر مذاق نہ بننے پائے-

سوال:- آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں جن مسائل شرعیہ میں سختی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، پاکستان میں ان مسائل میں شدت نہیں برتی جاتی؟ جیسے فوٹو گرافی، لاؤڈ اسپیکر پر

اقتداء اور رویت ہلال کے مسائل وغیرہ-

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- اس طرح کے جو جدید مسائل آتے ہیں ان میں شروع میں الجھن اور اختلاف تو ہوتا ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اختلاف رائے کو مخالفت کا رنگ نہیں دینا چاہیے، مثلاً لاؤڈ اسپیکر پر اقتداء کے تعلق سے سب سے پہلے پاکستان میں حضرت مفتی نور اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد حضرت مولانا ابوالبرکات شاہ رحمۃ اللہ علیہ پھر علامہ سعید احمد کاظمی نے فتویٰ دیا اور اسی طرح ہندوستان میں سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی شاہ اجمل صاحب نے جواز کا فتویٰ دیا اور یہ فتویٰ بھی دیا کہ زیارت حرمین طیبین کے لیے فوٹو کھنچوانا جائز ہے- اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ عرض کروں، حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی حضرت مولانا محمد حسین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو تقسیم کے بعد پاکستان آگئیں، انہوں نے دو تین سال کے بعد علامہ جیلانی میرٹھی کے خلاف خلع کا مقدمہ دائر کر دیا، مقدمہ مہینوں چلتا رہا، میں نے اس کی پیروی بھی کی، کورٹ نے کہا کہ اگر آپ ایک بار بھی میرٹھی صاحب کو کورٹ میں لا کر بیان دلوا دیں تو ان کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا- لیکن میرٹھی صاحب فوٹو کھنچوانے کے خوف سے پاکستان نہیں آئے اور صرف فوٹو کی وجہ سے ان کی بیوی ان سے الگ ہو گئیں، پھر کچھ ہی دنوں کے بعد جب وہ پاکستان آئے اور میں نے ان سے سوال کیا تو کہنے لگے کہ میرے استاذ علامہ مفتی اجمل صاحب نے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے، میں نے سفر حرمین کے لیے فوٹو کھنچوائے تھے تو میں نے سوچا کہ پاکستان کا بھی سفر کر لوں- تو آپ غور کریں کہ ایک ہی مسئلہ جب تک کے اس پر عدم جواز کا فتویٰ رہا سختی سے اس پر عمل کرتے رہے، جب کہ علامہ جیلانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود بھی بڑے جید عالم تھے اور جونہی جواز کا حکم صادر ہوا اس پر عمل کرنے لگے- چونکہ ہم لوگ امام اعظم کے پھر ان کے خلفاء کے پھر ان کے خلفاء کے خلفا کے تقلید در تقلید کرتے چلے آرہے ہیں اور اسی میں ہمارے لیے خیر بھی ہے- لیکن ان سب کے باوجود جو جدید مسائل ہیں ان میں علما کو غور وفکر تو کرنا ہی چاہیے- اور اگر اس میں اختلاف رائے بھی ہوتا ہے تو اس اختلاف رائے سے

امت کو فائدہ پہنچانا چاہیے- اسی طرح ٹیلی ویژن کا مسئلہ لیجیے اس میں پاکستان کے علما نے غور وفکر کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو چیزیں باہر دیکھنا ناجائز وحرام ہیں وہ ٹیلی ویژن پر دیکھنا بھی حرام ہیں اور جو چیزیں باہر دیکھنا جائز ہے وہ ٹیلی ویژن پر دیکھنا بھی جائز- تو میرا کہنا یہ ہے کہ اس طرح کے اختلافات ہوتے رہے ہیں اور علما ان اختلافات کے ساتھ ساتھ عوام کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، جن کے نزدیک جو درست ہوتا ہے وہ اس پر عمل کرتے ہیں-

سوال:- ہندو پاک کے تعلقات دن بدن خراب ہو رہے ہیں، اس کا ذمہ دار آپ کن لوگوں کو مانتے ہیں؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- دونوں طرف سے جو شدت پسند مذہبی رہنما ہیں وہی اس کے ذمہ دار ہیں، ان میں اگر اعتدال آجائے اور احترام انسانیت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو یہ ساری انتہا پسندی آپ سے آپ ختم ہو جائے گی، احترام انسانیت تمام انبیاء ومرسلین کی تعلیمات کا خلاصہ ہے اور چوں کہ ہمارے پیغمبر آخرالانبیاء وسیدالانبیاء ہیں، اس لیے سب سے زیادہ آپ نے ہی اس پر زور دیا- آپ نے ہی فرمایا **خیر الناس من ینفع الناس** قرآن نے کہا **من قتل نفساً بغیر نفس فکانّما قتل الناس جمیعاً**- آج ہم میں اور ترقی یافتہ دنیا میں جو سب سے بڑا فرق ہے وہ احترام انسانیت کا ہے، ہم سے کہا جارہا ہے کہ جہاد مت کرو اور ادھر دیکھیے تو یورپین یونین، ناٹو اور ساٹو جہاد نہیں کر رہے ہیں تو اور کیا کر رہے ہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارا جہاد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہے، عدل وانصاف کے قیام کے لیے ہے اور ان کا جہاد صرف اپنی ذاتی تعلی اور حکمرانی کے لیے ہے، جہاد کا مطلب تو یہی ہے نا کہ آدمی اپنے مخالف کو قتل کر دے، تو ان سے بڑا مجاہد تو دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں، عراق میں یہ جہاد کر رہے ہیں، افغانستان میں یہ جہاد کر رہے ہیں، چیچنیا میں یہ جہاد کر رہے ہیں، کشمیر میں یہ جہاد کر رہے ہیں، ہر جگہ جہاد چھیڑے ہوئے ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ جہاد مت کرو، اور بات صرف آج کی نہیں، آپ پوری مسلم تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، مسلمان کہیں جہاد کرنے نہیں گیا ہے، حالات نے اسے مجبور کیا ہے ہتھیار اٹھانے پر تو اس نے ہتھیار اٹھایا ہے، تمام جنگیں صرف دفاع میں لڑی گئیں، سب دفاعی جنگیں تھیں-

خلاصہ یہ کہ مسلمان اس وقت تک سر بلند رہے جب تک وہ حق وصداقت کے لیے سرشار رہے، عدل وانصاف قائم کرتے رہے اور احترام انسانیت بجالاتے رہے، جب انہوں نے اس عمل سے اپنا منہ پھیر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ دوسری قوم جسے آپ امریکہ کہہ سکتے ہیں کو مسلط کر دیا- آج برصغیر ہندو پاک کے اندر اسی احترام انسانیت کا فقدان ہے اگر دونوں ملکوں میں احترام انسانیت پر کام شروع ہو جائے، بندگان خدا کی راحت رسانی کی فکر ہو جائے تو سارے مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے-

سوال:- کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مہاجرین کو اب تک پاکستان میں نمبر دو کا شہری سمجھا جاتا ہے؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، آج سے دس پندرہ سال پہلے اس طرح کی صورت حال تھی، جب مہاجرین وغیر مہاجرین میں فسادات ہوتے تھے، اب جبکہ عقل وشعور میں بیداری آئی ہے اس طرح کے خیالات ختم ہوتے جارہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مہاجرین نے اپنے آپ کو اب مہاجر کہنا چھوڑ دیا ہے-

اصل میں قصہ یہ ہوا کہ پاکستان میں کوئی پنجابی تھا، کوئی سرحدی تھا، کوئی بلوچی تھا، کوئی پٹھان تھا، وغیرہ وغیرہ تو جو لوگ ہندوستان سے پاکستان گئے تھے وہ اپنے آپ کو کیا کہیں؟ ان کو جو پرانے پاکستانی تھے وہ مہاجر کہنے لگے انہوں نے بھی اس نام کو قبول کر لیا کہ چلو اس میں کوئی برائی نہیں ہے- پھر ان لوگوں نے اپنی تنظیم اور جمعیت بھی بنالی، تاکہ رفتہ رفتہ مہاجرین کو ترقی کی راہ پر لائیں، اس سلسلے میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں، ان کے یہاں دہشت گرد اور Terrorist بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے پولیس سے، انتظامیہ سے اور حکومت سے نبرد آزمائی کی اور پنجابیوں، سرحدیوں، بلوچیوں اور پٹھانوں کو اپنا دشمن بنا لیا- پھر رفتہ رفتہ جب ان کا شعور بیدار ہوا تب انہوں نے اپنا نام تبدیل کیا اور اب اپنی تنظیم کا نام مہاجر قومی موومینٹ سے ''متحدہ قومی موومینٹ'' رکھ لیا-

سوال:- حضرت صدرالشریعہ علیہ الرحمہ کے حالات زندگی پر مختصر روشنی ڈالیں، جن کا آپ نے خود مشاہدہ کیا؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی :- جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری پیدائش ۱۹۲۴ء میں ہوئی، ۱۹۳۴ء میں میں کافی باشعور ہو گیا تھا، میں ان دس سالوں میں والد گرامی حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبح و مسا انتہائی قریب سے دیکھا، بریلی میں بھی دیکھا، اس وقت جب میں نے ۳/۴ پارے ناظرے پڑھ لیے تھے اور میرے اندر حفظ قرآن کا شوق بیدار ہوا، میں ابا جی سے زیادہ تو بول نہیں سکتا تھا، امی جی سے کہا: کہ مدرسے میں قرآن پڑھنے والوں کی دو صف ہے، ایک وہ جس میں بچے قرآن دیکھ کر پڑھتے ہیں اور دوسری وہ جس میں چھت اور دیوار دیکھ کر پڑھتے ہیں، میں نے کہا کہ مجھے بھی آپ انہی میں بٹھا دیں کہ میں بھی چھت اور دیوار دیکھ کر پڑھوں، اپنی کم سنی کی وجہ سے میں لفظ حفظ نہیں بول پا رہا تھا، بس شوق تھا کہ دوسرے بچوں کی طرح میں بھی چھت اور دیوار دیکھ کر قرآن پڑھوں- اس طرح میں نے حفظ شروع کیا اور مکمل کیا، اور اپنے خاندان میں پہلا حافظ قرآن بنا، چوں کہ میرے خاندان میں ۱۰/۸ پشتوں سے مولوی، حکیم چلے آ رہے تھے، کوئی حافظ نہیں تھا، ابا جی نے سب سے پہلے مجھ کو حافظ بنایا اور یہ بھی ان کا فیض ہی ہے کہ میرا حفظ قرآن پوری دنیا میں مشہور ہو گیا، میں نیو میمن مسجد میں تین رات شبینہ سناتا ہوں جو پوری دنیا میں ٹیلی ویژن کے ذریعے نشر ہوتا ہے اور پوری دنیا سے مبارکباد اور تعریف کے فون آتے ہیں-

میں نے ۱۹۳۴ء سے پورے ہوش و حواس سے حضرت صدر الشریعہ کو دیکھا، میں نے ان کا وہ دور بھی دیکھا جب وہ اجمیر شریف میں تھے، وہاں نواب حیدر آباد دکن نے جو مدرسہ قائم کیا تھا اس کے وہ صدر المدرسین بھی تھے، نوابوں کی صحبت کی وجہ سے ان کے ذہن میں اور طور طریقے میں نوابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہاں سے وہ بریلی شریف آ گئے، بریلی شریف سے پھر علی گڑھ چلے گئے، علی گڑھ میں بھی نوابوں کا ماحول تھا، اس زمانے میں لندن سے ایک خاص قسم کا کپڑا آتا تھا، جس کا وہ پائجامہ پہنتے تھے، سوئزرلینڈ سے چکن آتی تھی، اور نواب واجد علی شاہ والی پھالداری ٹوپی ہوتی تھی، اسی طرح ان کی سلیم شاہی جوتی بھی کہیں باہر سے آتی تھی، ہاتھ میں نہایت ہی خوب صورت چھڑی ہوا کرتی تھی، شیروانی کے

لیے کشمیر سے کشمیرا کپڑا آیا کرتا تھا، شالیں وغیرہ بھی کشمیر سے آتی تھیں، غرض یہ کہ ان کے اندر تمام تر نوابی آن بان تھی- علی گڑھ میں محمد علی جناح آتے تھے تو ان کے ساتھ بھی ان کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں، ابا جی ۱۹۴۴ء/۱۹۴۵ء کی اس اہم میٹنگ میں بھی علی گڑھ میں شریک تھے، جس میں لیگ والوں نے انگریزوں سے پورے طور پر ملک کے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا- اس وقت مولانا شاہد خاں شیروانی تھے جو ہمارے یہاں نائب صدر المدرسین تھے اور کانگریسی تھے، اتنے بڑے کانگریسی کے گھڑی کا پٹا بھی کھدر کا بنوایا تھا- چپل کی پٹیاں بھی کھدر کی بنوائی تھیں- اس وقت جب یہ بات آئی تو ابا جی نے کہا کہ انگریزوں کا بائیکاٹ ہی کرنا ہے تو کیا ضروری ہے کہ کھدر ہی پہنا جائے جو گاندھی آشرم میں بنا ہو، ہندوستان کے دوسرے کپڑے بھی پہن سکتے ہیں- آخر مسلمان بھی تو مراد آباد وغیرہ میں کپڑے تیار کر رہے ہیں، دھاگے کات رہے ہیں، جب ہمارا مقصد انگریزی کپڑوں کا بائیکاٹ ہے تو آخر ہم مسلمانوں میں یہ جذبہ کیوں نہیں پیدا کرتے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنیں- صرف گاندھی آشرم کے تیار کیے ہوئے کھدر پہننے پر زور دینے میں تو ایک طرح کا نقصان ہی ہے- اس کے بعد پھر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے تمام دوسرے کپڑے پہننے چھوڑ دیے اور گھر میں بتا دیا کہ ہمارا کپڑا اور ہماری ٹوپی بھی گاڑھے کی ہوگی- اس کے بعد پھر بٹن پر غور کیا تو کہنے لگے کہ یہ بھی تو انگریزوں کا ہی بنایا ہوا ہے- لہٰذا انہوں نے بٹن لگانا بھی چھوڑ دیا- اور گھنڈی لگانا شروع کر دیا- جوتا اسپیشل دہلی سے آیا کرتا تھا- ناشتے کے لیے بسکٹ ہمیشہ علی گڑھ شہر سے آیا کرتا تھا، گو حاصل یہ کہ ابا جی کھانے پینے میں اور اوڑھنے پہننے میں بڑے باذوق اور نفاست پسند واقع ہوئے تھے، لیکن ترک موالات کے سلسلے میں جب انہوں نے اپنے قیمتی کپڑے پہننا چھوڑ دیے تو ہم نے دیکھا کہ قیمتی کھانے بھی آہستہ آہستہ چھوڑتے چلے گئے- آخر کے دنوں میں صرف روٹی اور کدو کی سبزی ہلکے شوربے کے ساتھ کھانے لگے تھے- کئی رمضانوں میں میں نے دیکھا کہ ان کے لیے دو روٹی کی ثرید بن کر جاتی تھی، افطار کی دوسری چیزیں بھی کھاتے تھے ہلکی پھلکی، مگر خاص طور پر وہی ثرید کھایا کرتے، ابا جی کی زندگی کا یہ انقلاب ہے جسے میں نے سنا نہیں ہے اور نہ کسی کی

روایت بیان کررہا ہوں، بلکہ سب میرے مشاہدات ہیں-ایک طرف میں نے ان کی شاہی دیکھی اور دوسری طرف ان کی درویشی بھی دیکھی-انہیں کے تلامذہ میں سے مولانا منتخب الحق صاحب استاذ دینیات کراچی یونیورسٹی، ہمارے یہاں کچھ دنوں شیخ الحدیث رہے، یہ اجمیر شریف کے تلامذہ میں سے ہیں، ایک دن والد صاحب کا ذکر ہو رہا تھا اور جب انہوں نے سنا کہ والد صاحب شاہی چھوڑ کر درویشی کی طرف کس طرح واپس آئے تو کہنے لگے کہ '' مولوی اگر درویش نہیں ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ دس میں سے ایک نکال دیا گیا- شیخ سعدی بھی یہی کہتے ہیں......ع......درویش صفت باش وکلاہ تاتاری دار

۱۹۴۴ میں والد صاحب کا سیتاپور میں آنکھوں کا علاج ہوا، یہ برصغیر کا واحد آنکھوں کا بڑا ہسپتال تھا جسے انگریزوں نے تیار کرایا تھا، آپریشن ناکام رہا، پھر دوسری آنکھ کا بھی آپریشن کرایا تو وہ بھی ناکام ہوگیا-اوراس کے بعد اباجی لکھنے، پڑھنے سے معذور ہوگئے- اس کے بعد وہ خطوط وغیرہ یا تو مجھ سے لکھواتے تھے، یا مفتی شریف الحق صاحب سے-تمام فتوؤں کا جواب مفتی شریف الحق سے ہی لکھواتے تھے-قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ روزانہ ۷/۸ بجے مفتی صاحب کو جواب لکھنے کے لیے بلوالیتے، ایک مرتبہ میں تقریباً ۶/۷/۸ خطوط پڑھواتے اوراس کے بعد ایک طرف سے نمبروار جواب لکھواتے چلے جاتے-تدریس کے زمانے میں وہ اتنے پابند تھے کہ ہمیشہ ۱۰/منٹ پہلے مدرسہ پہنچتے تھے، اور جب سارے اساتذہ اٹھ جاتے تھے تب آپ اپنی درسگاہ سے نکلتے تھے، درس وتدریس کے زمانے میں آپ نے کچھ لکھا بھی نہیں- دیگر خالی اوقات میں بہار شریعت لکھی اور طحاوی شریف پر حاشیہ لکھا، ۱۹۴۴ء میں جب آپ کی آنکھ کا آپریشن ہوا اس کے بعد فتاویٰ املا کرایا- میں نے والد صاحب کے ساتھ کئی سفر بھی کیے، دو تین بار ان کے ساتھ کاٹھیاواڑ گیا، ۱۹۴۵ء میں اور پھر ۱۹۴۶ء میں، غالباً آخر میں ۱۹۴۷ء میں بھی گیا تھا، شعبان کے مہینے میں اور رمضان پاکستان میں گزرا-کبھی بھی میں نے ان کو بے جماعت نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا-نہ اجمیر میں، نہ علی گڑھ میں اور نہ گھر پہ-والد صاحب کے ساتھ خدمت کے لیے سفر میں سبحان اللہ بھی ہوا کرتے تھے، گاڑی جب ۱۵/منٹ کے لیے کسی اسٹیشن پر رکتی تھی تو والد صاحب

کہتے کہ دیکھو اگر کسی نل پر لوگ وضو بنارہے ہیں تو ان کے پاس چٹائی بچھاؤ اور ان سے کہو کہ جو لوگ ان میں بھی نماز پڑھنا چاہتے ہیں نماز پڑھ لیں، پھر والد صاحب اترتے اور کسی کھمبے کو سترہ بنا کر نماز پڑھاتے تھے، یہ اہتمام تھا ان کا سفری نمازوں میں-

والد صاحب میں احترام انسانیت، پابندی شریعت اور مذہبی رواداری بھی بہت تھی، آج گھوسی میں جہاں جامعہ امجدیہ رضویہ ہے (اللہ اسے ترقی دے) وہاں پر چھوٹی سی ایک مسجد ہے، یہ ہماری خاندانی مسجد ہے، آپ جانتے ہیں کہ خاندانی مسجد سے لوگوں کا کتنا لگاؤ ہوتا تھا، والد صاحب اس کو آباد کرنے کے لیے اپنے بچوں کو اس میں بھیجتے تھے کہ جاؤ اس میں نمازیں پڑھو، تاکہ وہ آباد رہے، لیکن خود وہ ایک قریبی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، اعتکاف بھی اسی میں کرتے تھے اور اسی مسجد میں آپ کے دادا حضرت علامہ ارشد القادری ۱۹۴۴ء کے بعد ۲/۳ سالوں تک رمضان والد صاحب کے ساتھ گزارے، وہ والد صاحب کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے- خاندان کے لوگوں نے کئی دفعہ والد صاحب سے کہا بھی کہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں اور مسجد کے ذمہ دار آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں- والد صاحب نے کہا وہ جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دو-لیکن جوار قرب المساجد ہے، پہلے ہمیں اسے آباد کرنا ہے- اس کا حق ہم پر زیادہ ہے- اس لیے ہم نماز یہیں پڑھیں گے- چاہے وہ برا کہیں یا بھلا کہیں- چوں کہ اس زمانے میں ان لوگوں میں تھوڑی بہت دیوبندیت بھی تھی-

سوال:-حضرت صدرالشریعہ کی تبلیغ کا انداز کیا تھا؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:-والد صاحب نے تو ۱۹۴۴ء سے پہلے تبلیغ کی ہی نہیں، ہاں بارہ ربیع الاول کو میلاد شریف کیا کرتے تھے، والد صاحب، مفتی وقار الدین، صوفی مبین، سید ظہیر الدین زیدی، خلیل احمد خاں برکاتی، یہ سب حضرات مل کر اپنے اخراجات سے ۱۲/ویں شریف کو ایک یا دو دیگ کھیر پکایا کرتے تھے-طلوع صبح صادق سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے، ایک تخت بچھتا تھا، اس کے اوپر بیلا چمیلی اور دوسرے پھول، بچھائے جاتے تھے اور پھر اس پر بیٹھ کر والد صاحب میلاد شریف پڑھتے تھے- اس کے علاوہ انہوں نے

وعظ تقریر کبھی نہیں فرمائی - ہاں ۱۹۴۴ء کے بعد جب والد صاحب آنکھوں سے معذور ہو گئے جہاں جاتے کچھ دیر وعظ وتبلیغ فرما دیا کرتے تھے، اس میں وہ حضور صلی اللہ علیہ سلم کے فضائل ہی اس انداز میں بیان کیا کرتے تھے کہ شیعیت کا، وہابیت کا یا اور جتنے گروہ ہیں سب کا رد ہو جایا کرتا تھا-

سوال:- بہار شریعت انہوں نے کب لکھی؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- والد صاحب نے اعلیٰ حضرت کی زندگی میں ہی اسے لکھنا شروع کر دیا تھا- ۳ یا ۴ حصوں پر اعلیٰ حضرت کی تقاریظ بھی ہیں- والد صاحب نے درس وتدریس کے زمانے میں لکھنے کا کام نہیں کیا، انہوں نے تصنیف وتالیف کا کام یا تو چھٹیوں میں کیا یا پھر گرمیوں میں جب ایک وقت کا مدرسہ ہوتا تو دوپہر کے بعد اپنے شاگرد مفتی وقارالدین وغیرہ کو لے کر عصر تک بیٹھتے تھے، لیکن میں یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ بہار شریعت لکھتے تھے یا طحاوی شریف کا حاشیہ لکھتے تھے-

سوال:- جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

قاری رضاء المصطفیٰ اعظمی:- جب میں نے پہلی مرتبہ جام نور دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی کہ آپ تو بڑے نوخیز اور نوعمر ہیں، آخر اتنا اچھا کیسے لکھ سکتے ہیں- پھر مجھے محسوس ہوا کہ بلا شبہ یہ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ، علامہ غلام آسی پیا رحمۃ اللہ علیہ اور جتنے بھی بزرگان دین ہیں سب کا فیض اور کرامت ہے- رسالہ کے مضامین بھی بہت ہی معیاری اور علمی ہوا کرتے ہیں، مشمولات گراں قدر ہیں، لیکن آپ سے میرا ایک مشورہ ہے کہ اختلاف جتنا بھی کرنا ہے کیجیے لیکن احترام انسانیت ملحوظ رکھیے اور مخالفت مت کیجیے- میں ہر ماہ جام نور پابندی سے پڑھتا ہوں، کراچی میں اس کے قارئین کی بہت بڑی تعداد بھی ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید بام عروج تک پہنچا دے-□□□

(شمارہ جنوری ۲۰۰۷ء)

مولانا سید رکن الدین اصدق چشتی

مدیر اعلیٰ سہ ماہی ''جام شہود'' وبانی ومہتمم مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف بہار شریف

بارہویں صدی ہجری میں عارف باللہ خواجہ شاہ قیام اصدق صادق فخری نظامی رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جنہیں صوبہ بہار میں سلسلہ نظامیہ کے بانی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے- آپ کی خانقاہ چشتی چمن پیر بیگہ شریف ضلع نالندہ میں واقع ہے اور یہیں خانوادۂ اصدقیہ آباد ہے- اسی خانوادے کے ایک علمی فرزند کا نام مولانا سید رکن الدین اصدق چشتی ہے- آپ کی ولادت ۱۹۴۴ء میں ہوئی- ابتدائی تعلیم خانوادہ کے بزرگوں ہی کے زیر نگرانی عمل میں آئی- فراغت کے بعد ۱۹۶۸ء میں آپ مدرسہ عزیزیہ پنجرانواں ضلع جہان آباد میں صدر المدرسین کے عہدے پر فائز ہوئے، جب کہ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۴ء جامعہ شرفیہ گیا میں بھی اسی منصب پر رہے- آپ کی علمی، قلمی اور تدریسی صلاحیتوں اور دینی خدمات سے متاثر ہوکر ۲۵/اکتوبر ۱۹۷۴ء کو رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے ادارۂ شرعیہ پٹنہ کا منصب اہتمام آپ کے سپرد کیا- ۹/سال تک آپ نے بحسن وخوبی ادارے کا نظم ونسق چلایا اور پھر ۱۹۸۳ء کو دین ومسلک کی اشاعت کے لیے بہار شریف میں ''مدرسہ اصدقیہ مخدوم شرف'' کے نام سے تعلیمی ادارہ قائم کیا- مذہبی صحافت میں بھی آپ کی خدمات لائق ستائش ہیں، آپ نے ادارۂ شرعیہ کے دور اہتمام میں پندرہ روزہ ''رفاقت'' کی ادارت فرمائی جب کہ پچھلے ۱۰/سالوں سے سہ ماہی ''جام شہود'' آپ کی زیر نگرانی شائع ہو رہا ہے- آپ کے قلم سے متعدد کتابیں بھی منظر عام پر آئیں ہیں، جن میں تاریخ ہجرت، تحائف اصدقیہ، بے نقاب چہرے، خطرات کے بادل، ترجمہ زاد السفر اور حیات اصدق قابل ذکر ہیں-

سوال:-کیا ماضی کے مقابلے میں آج جماعت اہل سنت تحریری، صحافتی اور دعوت و تبلیغ کے میدان میں زیادہ فعال ہے- اگر ایسا ہے تو اس عروج کا سہرا آپ کس کے سر باندھیں گے؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:- ماضی میں ہماری جماعت کے اندر تدریسی صلاحیت کے علما کی بہتات تھی اور اب ویسے اساتذہ ڈھونڈنے پر ملتے ہیں- بایں ہمہ تحریری، صحافتی اور دعوت وتبلیغ کے میدانوں کی طرف سے بے اعتنائی ضرور تھی- گوناگوں دینی موضوعات پر کتب ورسائل کم یاب تھے-جس کا نقصان دہ پہلو یہ تھا کہ کامیاب مناظروں کے بعد زمین اہل سنت کے حق میں ہموار ہو جاتی تھی-مگر ہم دعوت وتبلیغ اور دینی جرائد ورسائل کے ذریعہ اسے اپنے حق میں استوار نہیں رکھ پاتے تھے-جس کی متعدد مثالیں میرے پیش نظر ہیں، مگر اس کا ذکر اس وقت طوالت کا باعث ہوگا-

متاخرین علما میں حکیم الامت حضرت مولانا احمد یار خاں بدایونی اور حضرت مولانا عبد المصطفی اعظمی علیہم الرحمہ قابل ذکر ہیں جنہوں نے عوام کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر دینی کتابیں تصنیف فرمائیں- اور اس طرح تحریری ڈگر پر چلنے کی ہمیں راہ دکھائی- دعوت وتبلیغ کے میدان میں خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی اور رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہم الرحمہ کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی- ان حضرات نے فرق باطل کے جراثیمی اثرات سے قوم کو محفوظ رکھنے کے لیے جگہ جگہ مساجد ومدارس قائم فرمائے اور نوع بنوع کتابیں تحریر فرمائیں- ایک نے الہ آباد سے ماہنامہ پاسبان اور دوسرے نے کلکتہ سے ماہنامہ جام نور جاری کیا جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے-لیکن آج تحریری، صحافتی اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں ان اسلاف کے جانشیں پیدا کرنے کا فریضہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور انجام دے رہا ہے-

سوال:- دین کی اشاعت کے نام پر موجودہ جلسہ وجلوس کو آپ کتنا موثر اور با مقصد جانتے ہیں؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-:- جلسے جو مدارس اسلامیہ کے تحت فارغین کی دستار بندی اور تقسیم اسناد کی غرض سے ہوتے ہیں، ضرورتاً ہیں یا پھر میلا النبی اور معراج النبی کے نام پر جو جلسے منعقد ہوتے ہیں، بامقصد ہیں- ان موقعوں پر عموماً باوقار اور علمی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا ہے- خاص کر دستار بندی کے جلسوں میں تو اس کا خاص اہتمام ہوتا ہے-۱۹۸۲ء میں دارالعلوم غریب نواز الہ آباد کے جلسۂ دستار فضیلت میں، میں شریک تھا- جب سندیں اسٹیج پر لائی گئیں تو حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ نے فرمایا سندوں پر علما سے دستخط کرالو- اس موقعہ پر حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین پرنوی اسٹیج پر موجود تھے- انہوں نے بلند آواز سے کہا: ''مقررین سے نہیں صرف مستند علما ہی سے دستخط کرائیے گا''-

اب تو آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ دستار بندی کے موقعوں پر علمی شخصیتوں کی موجودگی کیوں ضروری ہے، اب رہی عوامی جلسوں کی بات تو چاہے وہ کسی نام سے ہو یہ ایک خوبصورت اور نفع اندوز تجارت ہے ایک خطیر رقم جلسہ کرانے والوں کو منافع میں چاہیے- غیر ضروری ڈیکوریشن اور آرائش پر، نمائش اور کمیشن کے طور پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے- چتر ویدی، لطیفہ باز اور ڈائیلاگ بولنے والے مقررین مدعو کیے جاتے ہیں جو اپنی بکواس میں رات گزار دیتے ہیں- صبح کو ایک طرف اذان ہو رہی ہے اور دوسری طرف پیشہ ور مقررین کی گاڑی روانہ ہو رہی ہے، جس کا کھلی آنکھوں سے عوام نظارہ کر رہے ہیں- بے گانے طعنہ زنی اور اپنے افسوس کر رہے ہیں- دوسرے روز ہر طرف چرچہ ہے کانفرنس پر دولاکھ روپے خرچہ ہوئے اور ڈھائی لاکھ روپئے خرچ ہوئے- پچیس ہزار کا مجمع تھا اور پچاس ہزار کا مجمع تھا- لیکن پوچھ دیجیے کہ عوام کو کیا ملا؟ تو جواب ہوگا نغمہ، راگ، لطیفہ، چٹکلا اور قہقہہ- افسوس جو جلسے اصلاح عمل کے لیے ہوتے- آج وہ ذہنی عیاشی کا سامان بن کر رہ گئے ہیں-

سوال:-تو پھر آپ کی نظر میں ان نمائشی جلسوں اور ایسے پیشہ ور مقررین کو روکنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:- جو دھارا چل پڑا ہے اسے روکا نہیں جا سکتا- ایسے

لوگوں کو لگام دینے والی شخصیتیں اب روپوش ہو چکی ہیں اور جو ہیں ان کا ان جلسوں سے مفاد وابستہ ہے- ہماری اور آپ کی یہ باتیں صرف ان ہی لوگوں کو اچھی لگیں گی- جو گہرائی میں اتر کر اس کے نقصانات پر غور کرنے کی کوشش کریں گے- بدقسمتی سے ہمارے سرمایہ داروں کو بھی ان نمائشی جلسوں سے ہی دلچسپی ہے- وہ بھی پائیدار کام نہیں چاہتے، ورنہ ان جلسوں کو بند کر کے ہی قومی سرمائے کے نقصان سے بچا جا سکتا ہے-

سوال:- ادارہ شرعیہ پٹنہ کے قیام اور اس کے استحکام میں آپ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے دست و بازو رہے- کیا وہ حضرت علامہ کے خوابوں کی تعبیر بن سکا ہے- اگر نہیں تو پھر وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے ادارہ اس مقام تک پہنچ گیا ہے؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-:-۱۹۷۴ء میں بھی حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے چودہ ماہ غیر ملکی دورے کے نتیجے میں ادارۂ شرعیہ پٹنہ موت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا- ہندوستان واپسی کے بعد اس کی حیات نو کے لیے حضرت علامہ نے قائد ملت حضرت مولانا سید شاہ اسرار الحق شاہجہاں پوری اور مجاہد دوراں حضرت مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی رکن علما بورڈ کی مدد سے مجھے پا بجولاں ادارۂ شرعیہ لا کر منصب اہتمام پر جز و کل کے اختیار کے ساتھ بٹھایا تھا- اس وقت نہ صرف یہ کہ ادارہ کے اثاثہ میں ایک پھٹے ہوئے توشک اور ایک بے غلاف کی مسند کے سوا کچھ نہ تھا- بلکہ مالی بحران کا یہ حال تھا کہ شروع سال ہونے کے باوجود تیرہ سو روپے قرض میں مجھے ادارہ کا چارج ملا تھا، ادارہ کی صرف پہلی منزل وہ بھی انتہائی خستہ حالت میں تھی- انوار احمد نامی ایک لڑکا صرف دو گھنٹے کے لیے دفتر کھولتا تھا-

چونکہ ادارہ شرعیہ کے قیام کا مقصد حفظ خانہ کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ نہیں تھا بلکہ اس کا بنیادی مقصد دار القضاء اور دار الافتاء کا شعبہ تھا- ان دونوں شعبوں کا الگ الگ محکمہ نہیں تھا- میں نے سب سے پہلے ان دونوں کو الگ الگ محکموں میں تقسیم کیا- قاضی شریعت حضرت مولانا فضل کریم فیض پوری علیہ الرحمہ کی تنخواہ کا معقول بندوبست کرنے کے بعد انہیں دار القضاء کی مکمل ذمہ داری پر آمادہ کیا- وہ سلیم الفطرت بزرگ تھے- انہوں نے اپنے کمال علمی اور پختہ کاری کی بناء پر جس خلوص کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھائی- اس

کی مثال ادارہ شرعیہ کی تاریخ میں کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی-

اس کا دوسرا بنیادی شعبہ دار الافتاء تھا- اس کے لیے حضرت مولانا مفتی عبد الواجد صاحب حامدی سے رابطہ قائم کیا گیا- انہوں نے اس شعبے کی خدمت قبول فرمائی اور لمبے عرصے تک بطریقۂ احسن اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے اور کسی طرح کی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا- میرے مستعفی ہونے تک وہ ادارہ میں موجود تھے- ان کی علاحدگی کا سبب مجھے نہیں معلوم- ان دونوں شعبوں کے بعد ضرورتاً اور مصلحتاً مدرسہ شرعیہ میں حفظ خانے کا انتظام کیا اور بیرونی طلبہ کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کیا- پہلی منزل کے تمام کمرے قابل استعمال بنا دینے کے بعد بھی جگہ ناکافی ہوئی تو میں نے تنہا اپنی کوششوں سے دوسری منزل تعمیر کرائی جس میں حضرت علامہ کا بھی کوئی تعاون شامل نہیں ہے-

حضرت علامہ کے نا چاہتے ہوئے بھی بار بار اصرار کر کے ان سے منظوری حاصل کی اور پندرہ روزہ ''رفاقت'' جاری کیا- اس کے اجراء کے بعد جب تک ادارہ میں رہا الحمد للہ اس کا ایک شمارہ بھی ناغہ نہیں ہونے دیا- حضرت علامہ کو ان راہ کی کٹھنائیاں معلوم تھیں- انہیں گمان تھا کہ رسالہ یہ چلا نہیں پائیں گے، اس لیے انہیں اجازت دینے میں تأمل تھا- فخراً نہیں، تحدیث نعمت کے طور پر کہہ رہا ہوں اور ملک کے مقتدر علما کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ روز قیام سے لے کر اب تک یہ دور ادارہ شرعیہ بہار کا سب سے تابناک دور تھا- اور بلا شبہ حضرت علامہ اور تمام بانیین ادارہ کے خوابوں کی تعبیر کا دور تھا-

آپ کے سوال کا یہ ٹکڑا کہ ''وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے ادارہ اس عبرتناک مقام تک پہنچ گیا ہے-'' اس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ ملک کے گیارہ منتخب علما پر مشتمل ادارہ شرعیہ بہار کا ایک نگراں علما بورڈ ہوا کرتا تھا- جس کے صدر اور امین شریعت حضرت مولانا شاہ رفاقت حسین اشرفی علیہ الرحمہ تھے- چونکہ دستور اساسی میں یہی ہے کہ جو علما بورڈ کا صدر ہوگا وہی امین شریعت کہلائے گا- نائب صدر حضرت مولانا مفتی انیس عالم صاحب علیہ الرحمہ، اور ناظم عمومی حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ تھے-

ہر تین سال پر علما بورڈ کی نشست ہوا کرتی تھی جس میں ادارہ شرعیہ کی کارکردگی کا

جائزہ لیا جاتا تھا- نئے انتخابات عمل میں آتے تھے اور تجویزیں اور منصوبے بروئے کار لائے جاتے تھے-اس موقعہ پر ہمارے تمام معروف اداروں کے ناظمین واساتذہ مدعو کیے جاتے تھے-اورانہیں شریک کارکیا جاتا تھا-تاکہ ان کے اندرادارے کے تعاون کا احساس جاگے- اور وہ سمجھیں کہ ادارہ شرعیہ شخص واحد کا نہیں پوری جماعت کی امانت ہے- اسی موقعہ پراجلاس عام بھی منعقد ہوا کرتا تھا- حفظ خانوں کی طرح ہر سال دستار بندی کا جلسہ نہیں ہوتا تھا-

اس کارروائی کا خاطر خواہ فائدہ یہ تھا کہ بہار کے ہرادارے کے ناظم ومہتمم اور ہر مدرسے کے صدر مدرس وسربراہ خودکوادارہ شرعیہ سے منسلک جانتے تھے اورادارے کا ہر پیغام اپنے حدودعمل میں نافذ کرنا اپنے اوپرلازم گردانتے تھے اوراسی باعث ادارے کا نظم و نسق درست تھا،میرے عہداہتمام میں اس طرح کی تین بار نشستیں منعقد ہوئی تھیں-

آج علما بورڈ کے ارباب حل وعقد گورغریباں میں آرام فرما ہیں- جو بچ رہے ہیں وہ بر طرف ہیں،وہ لوگ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ قضائے قاضی کے نفاذ کی کتنی صورتیں ہیں-وہی آج سب کچھ ہیں اس لیےکوئی بھی بڑا عالم ادارہ کی مرکزیت تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہے- اور آج کسی کے دل میں ادارہ کے لیے ہمدردانہ جذبات نہیں پائے جاتے- بہار کے ہزاروں اداروں میں ایک نام ادارہ شرعیہ کا بھی ہوکر رہ گیا ہے-

سوال :-آپ اس ادارہ کے انتظام وانصرام میں شریک رہےاوراس کے ترجمان پندرہ روزہ ''رفاقت'' کے مدیر مسئول بھی رہے پھر وہاں سے دست بردار ہونے کی کوئی خاص وجہ؟

مولانا سید رکن الدین اصدق :-:-یہ سوال کر کے آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے-اس وقت میں ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کے دوراہے پر کھڑا ہوں اگر وجہ صاف صاف بیان کرتا ہوں تو بہتوں کو تکلیف ہوگی اور خاموشی اختیار کرتا ہوں تو سچائی کو چھپانے کا الزام میرے سر آئے گا-

دراصل ایسا ہے کہ کچھ لوگ ''نہ خود خورد، نہ کسے دہد'' کے قائل ہوتے ہیں،خود بھی کچھ

کرنا نہیں چاہتے اور کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، ایسے ہی لوگ میرے استعفیٰ کا باعث بنے،آپ کے دادا بزرگوار جہاں بے شمار خوبیوں کے مالک تھے وہیں ان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ جس نے جو کہہ دیا اس پر یقین کرلیا کرتے تھے،ذاتی طور پر بھی آپ کواس کا تجربہ ہوگا-اسی لیے چمچہ گیری کرنے والے لوگ اپنی اوقات سے زیادہ ان سے فائدہ اٹھالیا کرتے تھے-میرے ہوتے ہوئے جن لوگوں کی ادارہ شرعیہ میں دال نہیں گل سکتی تھی انہوں نے میرے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیا اور حضرت علامہ کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر کچھ الزامات میرے خلاف تراشے جن کی تفصیلات اس وقت نا مناسب ہیں-

نومبر ۱۹۸۳ء میں امین شریعت دوم اور صدر اعلیٰ کے انتخاب کے لیے جو علما بورڈ کی نشست ہوئی تھی اور جس میں بہار کے تمام اہم مدارس کے نمائندگان موجود تھے-ان لوگوں نے ان الزامات کو خوب اچھالا جس کا میری طرف سے دفاع میں کافی وشافی جواب حضرت مولانا محمد شبنم کمالی،حضرت مولانا مفتی عبدالجلیل مدھوبنی اور حضرت مولانا محبوب رضا جیسے متدین علما نے دیا اور سارے الزامات کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے-آخر میں بیان صفائی دینے کے بعد میں نے اپنے استعفیٰ کا اعلان کردیا-

اگرچہ میرا یہ استعفیٰ نہایت دھماکہ خیز ثابت ہوا اور استعفیٰ کی واپسی کے لیے بہت سارے جتن کیے گئے،مگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہا- کیونکہ میں نے جس خلوص،للٰہیت اور بےنفسی کے ساتھ ادارہ کی دس سالہ خدمات انجام دی تھیں،اس کا یہ صلہ نہیں تھا-''رفاقت'' میں نے اپنے بل بوتے پر جاری کیا-مالیات کی فراہمی سے لے کر اس کی تمام ذمہ داریاں اپنے دوش ناتواں پر اٹھائیں- اور کبھی اس کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا- پھر بھی ان معاملات میں ذمہ داران کا پہلو تہی کرنا اور بدخواہوں کی باتوں پر کان دھرنا میرے لیے ناقابل برداشت تھا-

سوال:-کیاوجہ ہے کہ ادارہ شرعیہ میں قابل قدر علمی شخصیتیں نہیں رکتیں؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-:-قابل قدر علمی شخصیتوں کے لیے صرف موٹی تنخواہ

اورعمدہ کھانا ہی کافی نہیں ہے،ان کے وقار وتمکنت کے لائق دوسرے انتظامات بھی ضروری ہیں-ان کے فقدان کی صورت میں ان کا رکنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے-مثلاً باوقار عالم ہرکس وناکس کی حکمرانی برداشت نہیں کرسکتا-

سوال:-حضرت علامہ کے رفیق اور معتمد خاص ہونے کی حیثیت سے کیا آپ بتائیں گے کہ ان کا طریقۂ دعوت وتبلیغ کیا تھا؟ اور وہ جماعت کے لیے تعمیری کام کس نہج سے کرتے تھے تاکہ نئی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہو؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-حضرت علامہ مرحوم کا ایک خاص مزاج تھا-وہ عزیز واقارب کی دعوت پر کہیں تشریف لے جاتے یا جلسہ وجلوس میں مدعو ہوکر کہیں پہنچتے تو وہاں کے ماحول کا جائزہ لیتے،اپنے لوگوں کے اعداد وشمار معلوم کرتے اور انہیں متحد ومنظم رکھنے اور دیگر افراد کو اپنے قریب لانے کے لیے کسی مدرسہ یا مسجد کی داغ بیل ڈال دیتے اور کسی عالم کا انتخاب کرکے نہ صرف اس جگہ پر بھیج دیتے بلکہ اس کی کارگزاریوں کی خبر بھی لیتے رہتے،ہر روز جماعتی کام آگے بڑھانے کے لیے نئی نئی راہیں اسے دکھاتے رہتے-وہ کسی اہم اور غیر مانوس مقام پر پہنچنے کے بعد صرف گھن گرج کی تقریر کردینے کے بعد واپس لوٹ جانے کے قائل نہ تھے-وہ اپنے ذہن وفکر سے ہم آہنگ لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے-اور انہیں اپنی ایک الگ شاخ بنانے پر آمادہ کرتے-اشاعت سنیت کے لیے ان کی یہ کوششیں نہایت کارآمد ثابت ہوتیں-اور سچی بات یہ ہے کہ ان ساری کارروائیوں کے پیچھے مسلکی مفاد کے سوا ان کا کوئی ذاتی مفاد نہ ہوتا-

سوال:-تحریر وصحافت کی بہ نسبت اہل سنت نے ہمیشہ عوامی جلسہ وجلوس کو اہمیت دی-ماضی میں بھی ہمیں دوسرے مکاتب فکر کے مقابلے میں اپنے لٹریچر کی کمی کا احساس رہا اور اب بھی ہے-اس کا ذمہ دار آپ کس کو مانتے ہیں؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-بلاشبہ تحریر وصحافت کے میدان میں دوسرے لوگ کل بھی ہم سے آگے تھے اور آج بھی ہیں-خواص تحریر وصحافت کو پسند کرتے ہیں اور عوام جلسہ وجلوس کے شیدائی ہیں-دوسروں نے خواص کو نظر میں رکھ کر قدم اٹھایا اور اپنوں نے

عوام کی بھیڑ کو ساتھ لے کر چلنا پسند کیا-جس کا نقصان دہ پہلو یہ سامنے آیا کہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری محکموں میں آج غیروں کے ہمنوا دیکھے جارہے ہیں اور ہر طرف ان کے لیے آسانیاں نظر آرہی ہیں-اس حد تک کہ وہ تمام اقلیتی اداروں پر اپنی اجارہ داری سمجھنے لگے ہیں اور آج ہم جماعتی مشن کے لیے جو قدم بھی اٹھاتے ہیں ہمارے سامنے مشکلات آکھڑی ہوتی ہیں-

آپ ہماری جسارت معاف فرمائیں تو میں یہ عرض کروں کہ لا کلام ہمارے اگلوں سے یہ بھول ہوئی کہ انہوں نے قابل اعتراض کتابوں کا صرف رد لکھ دینے کے بعد یہ تکیہ کر بیٹھے کہ ہم تحریری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوگئے اور ایسی تمام اصناف تحریر سے گریز فرمایا جس کے ذریعہ دانشوروں کا دل جیتا جاسکتا تھا-اور انہیں اپنے سے قریب لاکر اپنے کام کا آدمی بنایا جاسکتا تھا-اگر کچھ کارآمد کتابیں اپنے بزرگوں کی تھیں بھی تو وہ ہر شہر اور ہر کتب خانے میں دستیاب نہیں تھیں-کیونکہ دور دور تک سنی مکتبے اور کتب خانوں کا پتہ نہیں تھا-اب جب کہ قرطاس وقلم لے کر کچھ لوگ میدان عمل میں اترے ہیں اور جگہ جگہ اپنے کتب خانوں کا انتظام کیا ہے-تو بہت دیر ہوچکی ہے پھر بھی اس کا بہت کچھ فائدہ سامنے آرہا ہے-

سوال:-ہمارے یہاں ایک عام بات دیکھنے میں یہ آتی ہے کہ ہمارے اکابرین و مشاہرین اپنے پیچھے اپنا کوئی نعم البدل اور علمی وفکری جانشین چھوڑ کر نہیں جاتے، جب کہ دوسری جگہوں پر اس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے-اسباب کیا ہیں؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-مثل مشہور ہے کہ ”گھر چراغ تو مسجد چراغ“ مگر ہمارے اکابرین قوم کے درد میں کچھ اس طرح غرق ہوئے کہ گھر ہی کی خبر نہیں رہی-یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں میں جیسے جیسے مایۂ ناز علما پیدا کیے-فرزندوں میں ان خوبیوں کے حاملین پیدا نہ ہوسکے-الا ماشاءاللہ! کچھ تو بڑے باپ کے بیٹے ہونے کی نسبت نے انہیں آزادی کی راہ دکھائی اور کچھ شفقت پدری نے ڈھیل دی،نتیجہ جو کچھ سامنے آیا وہ سب کو معلوم ہے-

اب رہے مشاہرین تو ان کی تو بات ہی نہ کیجیے،ان کے گرد دولت اس قدر سمٹ آئی

کہ انہوں نے اپنے فرزندوں کے لیے یہ راہ پسند ہی نہ کی- وہ اپنے فرزندوں کو دولتوں کے انبار پر بٹھانے کی فکر میں ہمیشہ غلطاں نظر آئے، گویا دلق اویسی پر تاج سلطانی کی طلب غالب آگئی-

سوال:-(۱۰) ماہنامہ ''جام نور'' اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مولانا سید رکن الدین اصدق:-''جام نور'' جب کلکتہ سے آپ کے دادا بزرگوار کی ادارت میں نکلتا تھا تو اس کا ایک الگ رنگ تھا، ہندو پاک میں دیابنہ اس وقت سواد اعظم سے مغلوب تھے، اس لیے وہ طرح طرح کے فتنے جگا کر امت کو ورغلایا کرتے تھے اور حضرت علامہ کا خارا شگاف قلم ''جام نور'' کے صفحات پر اس کا دنداں شکن جواب دیا کرتا تھا- اور آج اسلام دشمن طاقتیں نئے نئے چولے بدل کر سامنے آرہی ہیں تو آپ کی ادارت میں دہلی سے نکلنے والا یہ ''جام نور'' قوم کو ان کے خطرات سے متنبہ کر رہا ہے- لہٰذا قوم کو اس وقت ملت کے اس ترجمان کی اشد ضرورت ہے، اس لیے قوم کو چاہیے کہ اس رسالہ کی زندگی کے لیے ہر ممکن تعاون فرمائیں- مولیٰ تبارک و تعالیٰ آپ کے علم و عمر میں برکتیں عطا فرمائے-□□□

(شمارہ دسمبر ۲۰۰۴ء)

مولانا شاکر علی نوری

امیر ''سنی دعوت اسلامی''، ممبئی

مولانا شاکر علی نوری (عمر: ۴۵ سال) جوناگڑھ کاٹھیاواڑ گجرات میں پیدا ہوئے- میٹرک تک کی تعلیم جوناگڑھ میں حاصل کی، پھر مدرسہ عرفان العلوم اپلیٹہ اور دار العلوم مسکینیہ دھوراجی میں حفظ قرآن کیا اور تجوید و ترتیل کی تعلیم پائی- پھر دار العلوم محمدیہ مینارہ مسجد ممبئی میں داخل ہوئے اور درس نظامیہ کی جماعت خامسہ تک تعلیم حاصل کی- آپ کے اساتذہ میں مولانا ظہیر الدین قادری، مولانا مجیب الرحمٰن قادری اور مولانا حنیف خاں اعظمی مبارک پوری کے نام شامل ہیں- مولانا سید حامد اشرف علیہ الرحمہ سے بھی استفادہ کیا- مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں قادری علیہ الرحمہ سے شرف بیعت ہے، جب کہ خلافت مولانا اختر رضا خاں ازہری اور سجادہ نشیں آستانہ قادریہ بغداد سے حاصل ہے- موصوف دینی تعلیم سے فراغت کے ساتھ ہی دعوت وتبلیغ سے وابستہ ہوگئے تھے، نہایت دین دار اور پابند سنت ہیں- دعوت و اصلاح کی غرض سے ۱۹۹۲ء میں عالم گیر اصلاحی و دعوتی تحریک ''سنی دعوت اسلامی'' کو قائم کیا جو بہت جلد مقبول ہوگئی، ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، کناڈا اور امریکی وافریقی ممالک میں اس کے بینر تلے اچھا کام ہو رہا ہے- ہندوستان ،امریکہ اور برطانیہ میں اس کے عظیم الشان سالانہ اجتماعات ہوتے ہیں- آزاد میدان ممبئی میں ہر سال تقریباً ۵/لاکھ فرزندان توحید کا مجمع ہوتا ہے- مولانا تعلیم دین کو عام کرنے کے لیے ایک سو گیارہ مدارس قائم کرنے کا عزم رکھتے ہیں جب کہ اب تک ایسے ۲۵/مدارس/اسکول قائم ہو چکے ہیں - مولانا کے منصوبوں میں انگلش میڈیم اسکول اور ہاسپٹل کا قیام بھی شامل ہے- تصنیف وتالیف سے بھی آپ کا رشتہ ہے، جس کے نتیجے میں اب تک کئی اصلاحی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں-

سوال:- 'دعوت' کا مفہوم کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟

مولانا شاکر نوری:- داعی جس عقیدہ پر خود قائم ہو اس کی طرف حکمت وموعظت کے ساتھ بلانا دعوت ہے- بلانا اسی وقت ممکن ہے جب داعی کو اس عقیدے کے حوالے سے یقین کامل ہو کہ یہی صحیح ہے اور اس عقیدے کے تعلق سے دلائل وبراہین سے بھی واقف ہو- قرآن پاک میں ہے کہ تاجدار کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں سے فرماتے ہیں "**وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ**" دوسرے مقام پر قرآن مقدس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو لوگوں سے یوں خطاب کرنے کے لیے فرمایا گیا "**قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی**" لہٰذا داعی جب تک اپنے عقائد پر صدفی صد یقین نہ رکھتا ہو دعوت کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے- آج عقیدہ توحید ورسالت وآخرت کے حوالے سے کماحقہ واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان کو بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی- جہاں تک دعوت کے تقاضے کا معاملہ ہے تو عرض ہے کہ داعی اعظم رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب پہلی مرتبہ لوگوں کو دعوت الی اللہ پیش فرمائی اس وقت لوگوں نے حضور سے دلیل طلب کی تھی- اس وقت نبی برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا اسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے: **فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ افلا تعقلون**" لہٰذا جب تک ہمارا وجود ہماری دعوت کا نمونہ نہ ہو جائے ہم بحیثیت داعی کامیاب نہیں ہوسکتے- دعوت کا پہلا تقاضا ہے اپنے وجود کو دعوت کا عملی نمونہ بنانا- اس کے علاوہ بھی دعوت کے تقاضے ہیں- مثلاً علمی تقاضے، فکری تقاضے اور عملی تقاضے- اور یہ سب اس وقت مکمل ہوسکتے ہیں جب ہم قرآن وسنت اور اس کے صحیح پیروکاروں سے رابطہ مضبوط کرلیں- اور سب سے اہم تقاضا تو یہ ہے کہ ہم بغیر کسی طمع کے لوگوں کو حق کی طرف بلائیں، دعوت میں اخلاص وللّٰہیت موجود ہو، حرص وطمع اور کوئی دنیوی مقصد پیش نظر نہ ہو-

سوال:- پیری مریدی اور دینی وتعلیمی اداروں کی کثرت کے باوجود 'دعوت وتبلیغ' کا کام ہماری بے توجہی کا شکار کیوں ہے؟

مولانا شاکر نوری:- میرے نزدیک پیری مریدی اور دینی وتعلیمی ادارے ہی دعوت الی اللہ کے سب سے موثر ذرائع ہیں- لیکن اسے صحیح طور پر انجام دینا چاہیے- مثلاً سرکار حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ پیر کامل تھے، آپ نے پیری مریدی کے ذریعہ لاکھوں لوگوں کو نمازی اور شریعت کا پابند اور عقیدہ حقہ کا عامل بنایا، ان کا جلال وجمال سب کچھ اللہ کے لیے تھا- وہ دین کو جانتے تھے اور اس کی تعریف سے آشنا تھے، آپ کو معلوم تھا کہ دین "خیر خواہی" کا نام ہے- شب وروز پریشان حال انسانوں کو تعویذ بھی دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو شریعت وسنت کی پابندی کی دعوت بھی دیتے- کوئی ضرورت مند خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو حضرت تک رسائی بھی ممکن تھی اور اس کی مراد بھی پوری ہوتی تھی- ان کی نصیحت ودعوت اس لیے موثر تھی کہ وہ خود فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کے پابند تھے- پیرانہ سالی کے باوجود جب نماز باجماعت کے لیے مسجد کی طرف نکلتے تو بچے بوڑھے جوان سب حضرت کی اقتدا میں اللہ کے گھر کی طرف چل پڑتے- اہتمام نماز کا یہ عالم تھا کہ "**خذوا زینتکم عند کل مسجد**" پر عمل کرتے ہوئے ہر نماز کے لیے دولھے کی طرح تیار ہوتے دکھا بس اسی طرز عمل کے احیا کی ضرورت ہے- جہاں تک تعلیمی اداروں کی بات ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کے انداز درس وتدریس اور طریقہ تربیت کو اپنانے کی ضرورت ہے- حضور حافظ ملت کے سینکڑوں شاگرد دنیا کے کونے کونے میں دعوت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، وجہ یہ ہے کہ حافظ ملت علیہ الرحمہ کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاص وللّٰہیت اور راہ خدا میں آنے والی تکالیف پر صبر واستقامت کی تعلیم بھی دیتے تھے- آپ کی زندگی کو آئیڈیل بنالیا جائے تو ان شاء اللہ پھر اہل سنت کا بول بالا ہوگا- ساتھ ہی ساتھ ایک کامیاب داعی بننے کے لیے مبلغ اسلام خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی بھی ہمارے لیے عظیم نمونہ ہے- وہ انتظار نہیں کرتے تھے کوئی ان کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے بلائے اور انتظامات کرے بلکہ آپ نے خود دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور دعوت کا وہ فریضہ انجام دیا کہ آپ کے اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے آپ کے ہاتھوں پر ۷۰ ہزار سے

زائدلوگوں نے اسلام قبول کیا-آج اسی جذبے کی ضرورت ہے-ہم اپنی اصلاح کریں اور ان بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں ان شاء اللہ ہر طرف اسلام وسنیت کے جلوے نظر آئیں گے-ان شاء اللہ

سوال:- دعوت کے عمل اور تردید وتنقید کے عمل میں کیا فرق ہے؟

مولانا شاکر نوری:- دعوت کے عمل میں تردید وتنقید کا عمل بھی ضروری ہے،اس لیے کہ جب داعی کسی کو اسلام کی دعوت پیش کرے گا اور مدعو اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوگا تو داعی کلمہ طیب پڑھا کر داخل اسلام کرے گا-اس کلمہ میں معبودان باطل کی تردید ہے اور اللہ کے وحدہ لاشریک ہونے کا اقرار،کیا رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معبودان باطل کا رد اور ان کے نافع نہ ہونے پر تنقید نہیں فرمائی؟ ہاں! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ دعوت میں درد ہو،اخلاص ہو،تردید وتنقید فکر واعتقاد کی اصلاح کے لیے ہو،تخریب کے لیے نہیں-اس راہ میں مجادلہ اور مباحثہ تو ہونا ہی ہے لیکن جدال احسن کے حکم پر عمل ضروری ہے،تبھی نتیجہ احسن ہوگا-

سوال:- فاسق وفاجر،بدعقیدہ وگمراہ اور کافر ومشرک تک اپنی بات پہنچانے کا حکیمانہ طریقہ کیا ہے؟ اگر داعی ان سے ملاقات کو یکسر مسترد کرتا ہو تو وہ فریضۂ دعوت کیوں کر ادا کرسکتا ہے؟

مولانا شاکر نوری:- فاسق وفاجر کو عام مبلغین دعوت دے سکتے ہیں لیکن بدعقیدہ اور کافر ومشرک تک اسلام کی بات پہنچانے کا فریضہ وہی علما انجام دے سکتے ہیں جو اپنے مذہب پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ کفار ومشرکین اور بدمذہبوں کے اعتراضات کا کماحقہ جواب دے سکیں-

سوال:- ''سنی دعوت اسلامی'' کا قیام کب اور کن حالات میں عمل میں آیا؟

مولانا شاکر نوری:-سنی دعوت اسلامی کا قیام ۵رستمبر ۱۹۹۲ء بروز سنیچر ممبئی میں ہوا-

سوال:- ''سنی دعوت اسلامی'' کے بنیادی،فکری،اعتقادی اور عملی اصول کیا ہیں، جن پر اس کی عمارت قائم ہے؟

مولانا شاکر نوری:-تحریک کے قیام کے چند ماہ بعد رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ اور رئیس التحریر حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی مدظلہ العالی ممبئی تشریف لائے تھے-ان دونوں علمائے کرام کی بارگاہ میں میں نے معروضہ پیش کیا کہ تحریک کے لیے آپ حضرات کوئی دستور العمل تحریر فرمادیں تاکہ ہم انہیں خطوط پر دعوت کا کام کرسکیں-تو انہوں نے درج ذیل خطوط متعین کیے-

☆ فکری وعملی سطح پر مسلکِ اہل سنت کی ترویج واشاعت اس تحریک کا بنیادی نصب العین ہے اور یہ تحریک انہیں خطوط پر کام کررہی ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ کرتی رہے گی، جو رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار صحابۂ کرام، تابعین کرام، ائمۂ کرام، سیدنا غوث الثقلین اور خواجہ غریب نواز اور حضور اعلیٰ حضرت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے متعین فرمائے ہیں-اسی کے نتیجہ میں یہ تحریک اس امر کی پابند ہے اور رہے گی کہ ہر حال میں وہ اپنے جماعتی امتیازات اور مسلکی شناخت کو برقرار رکھے گی-

☆ عقائد واعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس تحریک کے قیام کا بڑا مقصد علمائے اہل سنت اور مدارس اہل سنت سے عوام کو مربوط رکھنا، تعلیمی واخلاقی پسماندگی کو دور کرنا، سماجی وفلاحی کاموں کے ذریعہ اُمت مسلمہ کی پریشانیوں کو ختم کرنا اور ہر اس تحریک کو ناکام بنانا ہے جو کسی ذات خاص کو مرشد انام اور مرجع خلائق بنانے کے لیے علما ومدارس کے خلاف چلائی جائے-

سوال:- مختلف شہروں میں بعض اوقات تحریک دعوت اسلامی اور سنی دعوت اسلامی کے کارکنان عمل دعوت وارشاد کی بجائے باہم دست وگریباں ہوجاتے ہیں، جب کہ جماعت کے ارباب حل وعقد دونوں تحریکوں کو اہل سنت کی تحریک سمجھتے ہیں، آخر کارکنان کی اصلاح کے لیے اوپر سے احکام کیوں نہیں جاری ہوتے؟

مولانا شاکر نوری:-ایسا نہیں ہونا چاہیے،ہم کسی مبلغ یا کارکن کو باہم دست وگریباں ہونے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ آج جام نور کے ذریعہ پھر جملہ مبلغین سُنی دعوت اسلامی کو حکم دیتے ہیں کہ باہم الجھنے سے گریز کریں اور اپنے مقصد پر نظر رکھیں-

سوال:- ''سنی دعوت اسلامی'' کو اپنے کاز میں سب سے زیادہ رکاوٹ کن چیزوں سے ہے، کیا خارجی یا داخلی سطح پر واقعی کچھ ایسی رکاوٹیں ہیں جن کو ختم کیا جانا ضروری ہے؟

مولانا شاکر نوری:- تحریک کے کاز میں سب سے بڑی رکاوٹ افراد کی قلت ہے- اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے- اس لیے کہ ہم خیال وہم فکر ساتھی کا ملنا بڑے نصیب کی بات ہے- ویسے افراد سازی کی کوشش جاری ہے لیکن چونکہ ملک و بیرونِ ملک میں تحریک کا تعارف وتنظیم نیز تصنیف وتالیف، تعمیری کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اس کام میں خاطر خواہ وقت نہیں دے پاتے لیکن اب تربیت یافتہ چند ساتھی تیار ہو چکے ہیں- اس لیے امید ہے کہ درپیش رکاوٹیں جلد ہی ختم ہو جائیں گی- ان شاء اللہ-

سوال:- ''تحریک دعوت اسلامی'' جو ایک زمانے تک ٹیلی ویژن کے استعمال کے خلاف رہی مگر حالات کے پیش نظر اب نہ صرف وہ اس کے جواز کے قائل ہے بلکہ اب اس کا مدنی چینل بھی شروع ہو چکا ہے، کیا سنی دعوت اسلامی بھی اس سمت میں کچھ سوچ رہی ہے؟

مولانا شاکر نوری:- فی الحال اس سمت میں کچھ ارادہ نہیں ہے-

سوال:- تبلیغی جماعت نے اصلاح عمل کے نام پر جو فکری بے اعتدالیاں پیدا کیں اس کی روک تھام میں سنی دعوت اسلامی کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے؟

مولانا شاکر نوری:- تبلیغی جماعت نے چھے باتوں میں لوگوں کو قید کر رکھا تھا- تحریک نے اس سے لوگوں کو آزاد کرایا اور یہ بتانے کی بھرپور کوشش کی کہ اسلام صرف چھے باتوں میں محدود نہیں ہے بلکہ اسلام ہر شعبے میں اپنی حکومت و برتری چاہتا ہے- الحمدللہ! تحریک اس بات کو سمجھانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہے-

سوال:- ''سنی دعوت اسلامی'' ایک علمی و دعوتی مجلّہ ''سنی دعوت اسلامی'' بھی شائع کر رہی ہے جس کا ''دعوت نمبر'' سال گزشتہ شائع ہوا- سوال ہے کہ علمی سطح پر، خاص طور پر ہندی اور انگریزی دنیا تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ''تحریک'' کیا کر رہی ہے یا مستقبل میں اس کے کیا پروگرام ہیں؟

مولانا شاکر نوری:- الحمدللہ! علمی سطح پر اب تحریک کے پلیٹ فارم سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ بہ یک وقت اردو، ہندی اور انگلش زبانوں میں طبع ہوتی ہیں، اب تک دو درجن سے زائد چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں- عنقریب ایک نہایت اہم کتاب ''آیات جہاد کا قرآنی مفہوم'' (تصنیف علامہ یسین اختر مصباحی) انگلش میں شائع ہوگی، ترجمہ ہو چکا ہے، پروف کا کام چل رہا ہے- اسی طرح انگریزی میں ہمارے برطانیہ اور کنیڈا کے مبلغین کے بیانات کی MP3 بھی منظر عام پر آ چکی ہے جس کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچانے کا انتظام کیا جا رہا ہے- مزید کے لیے دعا اور مشورے کا طلب گار ہوں- ساتھ ہی اب تک چار انگلش میڈیم اسکول مع اسلامک اسٹڈیز قائم کیا جا چکا ہے- جہاں ہزاروں طلبہ عصری علوم کے ساتھ دینی علوم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں- اور تحریک کے زیر اہتمام اب تک ۲۵/ دینی ادارے قائم ہو چکے ہیں جہاں درس و تدریس اور انگلش و کمپیوٹر کی تعلیم دی جاتی ہے-

سوال:- آپ کی نظر میں مسلموں اور غیر مسلموں میں دعوت کے جدید تقاضے اور ذرائع کیا ہیں، جن کی طرف اب تک توجہ نہیں دی جا سکی ہے؟

مولانا شاکر نوری:- میری نظر میں مسلموں اور غیر مسلموں میں دعوت کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی خوبیوں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمتوں کو اجاگر کیا جائے- آج ہمیں شخصیات کے ساتھ ساتھ اسلام کی عظمتوں کو اجاگر کرنے والی کتابیں لکھنے اور سی ڈیز تیار کرنے کی ضرورت ہے- تاکہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کا جواب ہو سکے اور اصلی اسلام کو لوگ سمجھ سکیں-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مولانا شاکر نوری:- رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **بادروا بالاعمال الصالحة فتكون فتن كقطع الليل المظلم يصبح الرجل مؤمناً و يمسى كافراً ويمسى مؤمناً ويصبح كافراً يبيع دينه بعرض من الدنيا-**
(صحیح مسلم: کتاب الایمان)

ترجمہ: نیک عمل میں جلدی کرو، اس لیے کہ بڑے بڑے فتنے آنے والے ہیں، ایسے فتنے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے، صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر اور شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر، اپنے دین کو تھوڑے سے دنیاوی سامان کے بدلے میں بیچ ڈالے گا-

اللہ اکبر! آج فتنے کا وہی دور ہے اور یہ فتنے اندھیری رات کے ٹکڑے کی طرح ظاہر ہو رہے ہیں- آدمی سوچتا ہے کہ آنے والا کل آج سے بہتر ہوگا لیکن رات کے پہلے حصّے سے بعد والا حصہ زیادہ تاریک ہوتا ہے- ویسے ہی آنے والا کل آج سے خراب ہی ہوگا- لہٰذا نیک کام کرنے میں اب تاخیر مت کرو بہانے نہ بناؤ- شیطانی وسوسوں کا شکار مت ہو جاؤ ،ٹال مٹول مت کرو یہ نہ سوچو کہ ابھی تو ہماری عمر ہی کیا ہے؟ ابھی جوان ہیں- یہ سب شیطانی دھوکہ ہے- آج بدعقیدگی کا سیلاب اور اس کی چمک دمک کے سامنے بندہ مرعوب ہو جاتا ہے اور غلط عقائد ونظریات کو قبول کر لیتا ہے- یہ بھول جاتا ہے کہ اسلاف کی میراث کیا ہے؟ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ خلیجی ممالک دنیا کمانے جاتے ہیں اور دین بگاڑ کر آ جاتے ہیں- حلال وحرام کی تمیز ختم ہو چکی ہے- الا ماشاء اللّٰہ- کیا آج کے دور میں یہ سوچ نہیں بن گئی ہے کہ سب چلتا ہے- نہیں نہیں سب نہیں چلتا بلکہ وہی چلے گا جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چلایا ہے- اس لیے گزارش ہے کہ ہم اپنی فکر کریں، آخرت کی تیاری کریں، کسی بھی نیک کام کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑیں نہیں اور کسی چھوٹے گناہ کو چھوٹا سمجھ کر نہ کریں- اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **فمن یعمل مثقال ذرۃٍ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃٍ شرا یرہ**-

آج کے مسابقت کے دور میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ تعلیمی میدان سے لے کر تعمیری میدان تک اور سماجی خدمات سے لے کر سیاسی معاملات تک، اس کا احتساب ضروری ہے- کاش کہ ہم قرآن مقدس کی اس آیت پر عمل پیرا ہوتے "**فاستبقوا الخیرات**"- تو یقیناً دنیا مقتدی ہوتی اور ہم امام ہوتے- آج ہمارے اندر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے- صبر وضبط کی ضرورت ہے، خیر خواہی کے جذبے کی ضرورت ہے، اور خاص طور پر جذبۂ اخلاص وایثار کی ضرورت ہے- مخلوق خدا کی خدمت ضروری سمجھیں- حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی امت کے غموں کا ازالہ کریں نہ کہ اس میں اضافہ- اور اپنے ایمان کی فکر کریں- اپنی اولاد کی ایمان کی فکر کریں- ان شاء اللہ سنہرا دور پھر سے آئے گا اور دارین میں سرخروئی نصیب ہوگی-

عصر حاضر میں دارالعلوم کے ساتھ ساتھ انگلش میڈیم اسکول (جن میں اسلامی تعلیمات کا معقول بندوبست ہو) کا قیام بھی ضروری ہے تاکہ مڈل اور اَپر کلاس کے لوگوں تک بھی اسلام وسنیت پہنچ سکے اور ساتھ ہی ساتھ معیاری اسپتال کا قیام بھی ضروری ہے تاکہ علاج ومعالجہ کے ذریعہ کسی حد تک مخلوقِ خدا کی خدمت بھی ہو- اور ایسی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو قدرتی آفات کے مواقع پر امداد رسانی کا کام کریں- دراصل ان تینوں شعبوں میں خلا ہونے کی وجہ سے آج ہم مسلکی طور پر کما حقہ متأثر نہیں کر پاتے ہیں- میں اپنا واقعہ آپ کو بتاؤں کہ گجرات کے کچھ کی سرزمین پر جب زلزلہ آیا تھا اس کے ۲۴ر گھنٹے بعد ہم اپنے رفقا کے ساتھ وہاں کا جائزہ لینے اور امداد رسانی کی غرض سے جب وہاں پہنچے تو ہم سے پہلے کئی جماعتوں کے کیمپ لگ چکے تھے- ظاہری بات ہے جو مصیبت میں کام آئے گا لوگ اس کے ہم خیال ہو جائیں گے- الا ماشاء اللہ- اس وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ یہ شعبہ بہت ضروری ہے- اس سے متعلق عوام اہل سنت کو پیش قدمی کرنی چاہیے- آج عصری علوم کے سلسلے میں البرکات انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کو نمونۂ عمل بنایا جا سکتا ہے اور پیر طریقت حضور امینِ ملت اور حضرت اشرفِ ملت سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور دیگر شعبوں میں جماعتِ اہل سنت کے دانشوران اور نوجوان پیش قدمی کریں تو بہتر ہوگا- اِن تینوں شعبوں میں اس چیز کا خیال رکھا جائے کہ مسلکِ حقہ کا فروغ اور اس کا عامل بنانا بھی مقصود ہو- اخیر میں عرض ہے کہ اس فقیر کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر عطا فرمائے-□□□

(شمارہ نومبر ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر سید شمیم احمد منعمی

سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ قمریہ وصدر شعبۂ عربی اورینٹل کالج، پٹنہ

حضرت مخدوم شاہ محمد منعم پاک باز (م: ۱۱۸۵ھ) بارہویں صدی ہجری کے عظیم عالم ربانی، عارف حقانی اور شیخ ہمہ عالم گزرے ہیں- ان کا آستانۂ فیض شہر پٹنہ کے محلّہ متین گھاٹ میں صدیوں سے مرجع خلائق ہے- یہ آستانہ دینی، روحانی اور تاریخی ہونے کے ساتھ اپنی علمی روایت بھی رکھتا ہے، چنانچہ آستانے کے کتب خانے میں ۱۶ہزار مطبوعات اور پانچ سو سے زائد قیمتی مخطوطے ہیں- ڈاکٹر سید شاہ شمیم احمد منعمی اسی مقدس آستانے کے متولی وسجادہ نشین اور اس کی دینی و علمی روایتوں کے امین ہیں- موصوف نے دینیات کی تعلیم خانقاہ میں اپنے بزرگوں اور مختلف اساتذہ سے حاصل کی، پھر عصری تعلیم سے وابستہ ہوئے، آپ ایم اے کی تین اسناد رکھتے ہیں، ایک عربی میں، دوسری فارسی میں اور تیسری قدیم ہندوستانی تاریخ اور آرکیالوجی میں- لائبریری اور قانون کی اسناد سے بھی سرفراز ہیں، کچھ دنوں محکمۂ آثار قدیمہ سے وابستہ رہے، پھر پٹنہ یونیورسٹی میں فیلو رہے اور ۱۹۹۷ء سے اورینٹل کالج پٹنہ کے شعبۂ عربی میں ہیں، اس وقت صدر شعبہ ہیں- آپ علمی، روحانی، فکری اور ادبی شخصیت کے حامل ہیں- شگفتگی، شائستہ بیانی اور تحقیقی انداز آپ کی تحریر و تقریر کی خصوصیات ہیں- ان خصوصیات کی وجہ سے ملک کے مختلف مذہبی، ادبی، روحانی اور ملی کانفرنسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں کثرت سے مدعو کیے جاتے ہیں- تصوف آپ کا خاص میدان ہے، ۱۱/۹ کے بعد اسلام کو جس طرح بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ایسے میں ضروری ہوگیا ہے کہ اسلام کی صحیح تعبیر یعنی صوفی اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جس کے لیے آپ مختلف پلیٹ فارم سے کوشش کررہے ہیں-

سوال :- عصر حاضر کی آزاد فکر، تصوف کو اسلامی تاریخ کی ایک بدعت یا عجمی روایت کے طور پر دیکھتی ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

سید شمیم احمد منعمی :- عصر حاضر کی آزاد فکر اگر تصوف کو اسلامی تاریخ کی ایک بدعت یا عجمی روایت کے طور پر دیکھتی ہے تو اس میں حیرت کیا ہے؟ وہ تو اب فقہ اسلامی اور فقہائے اسلام کو بھی حرف غلط کی طرح مٹانے پر مصر ہے- آزاد فکر کی ایک اور زرد موشگافی حدیث و سنت کی تشریعی حیثیت کو ماننے سے انکار کرچکی ہے اور عصر حاضر کی آزاد فکر تو اسلامی شریعت کو بھی قابل ترمیم سمجھتی ہے- نعوذ باللہ من ذلک

تاریخ اسلامی و شخصیات اسلامی کا مطالعہ روز روشن کی طرح صاف صاف یہ بتا رہا ہے کہ تمام مقبول اور مستند شخصیتوں کے یہاں تصوف کا ذوق وشوق موجود ہے الا ماشاء اللہ اور اگر کسی کے یہاں انکار تصوف کی کوئی مثال ملتی بھی ہے تو اس کی ناپختہ کاری اور متشدد ہونے کی علامت ہے- جیسے جیسے اسے بالغ نظری نصیب ہوتی گئی اور محققانہ شان پیدا ہوتی گئی، اس کا رجحان نہ صرف تصوف کی طرف ہوا بلکہ وہ اس کا حامل ہوگیا-

تحقیق ومطالعہ کا حق تو یہ ہے کہ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر اکابر میں سے کسی کے یہاں ابتدا یا وسط میں انکار تصوف کا اضطراب ہے بھی تو انتہا تصوف کے سکون وقرار سے مالا مال ہے- مولانا روم اور امام غزالی اس کی سب سے بڑی مثال ہیں-

شعور وآگہی کا سفر اگر تصوف کے انقباض سے شروع ہو لیکن اختتام انشراح تصوف پر ہو تو انجام بخیر ہونے کی دلیل ہے- اللہ تعالیٰ سب کی عاقبت بخیر فرمائے-

سوال :- وہابی فکر اور صوفی فکر میں بنیادی طور پر کیا اختلافات ہیں اور آپ ان میں کس کو درست سمجھتے ہیں اور کیوں؟

سید شمیم احمد منعمی :- صوفی مکتبۂ فکر، صوفی کہلانے کے پہلے سے موجود و سرگرم ہے- عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وعہد صحابہ وعہد تابعین، صوفی فکر کا نقطۂ عروج ہیں حالاں کہ اس وقت یہ فکر صوفی نہیں کہلاتی تھی اور بظاہر یہی حال وہابی فکر کا بھی ہے کہ وہابی فکر، وہابی

کہلانے سے پہلے بھی موجود تھی اور آج بھی خود کو اس کے اہل وہابی کہیں یا نہ کہیں، مانیں یا نہ مانیں روح اس کی وہی ہے جس کی تحقیق کرنے والے نے اس کو وہابیت کا نام دیا ہے-

وہابی فکر اور صوفی فکر کا بنیادی فرق یہ ہے کہ وہابی فکر تعریف (Defination) تو یاد رکھتی ہے لیکن مثال (Example) بھول جاتی ہے جبکہ صوفی فکر جس قدر تعریف کو یاد رکھتی ہے اسی قدر مثال کو بھی پاس رکھتی ہے- وہابی فکر کا نقطۂ آغاز حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب کے زمانے کا وہ لمحہ ہے جب تاریخ اسلامی و ایمانی ایک ایسی فکر سے روبرو ہوتی ہے، جس کے حاملین قرآن و حدیث کے اقدار و احکام کو تو یاد رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کی فی زمانہ سب سے روشن مثال حضرت علی کو بھول جاتے ہیں اور انہیں بجائے تعریف کی مثال قرار دینے کے ضد قرار دیتے ہیں- قرآن و حدیث کے عنوان سے اپنی فکر اور اپنی تفہیم کو بنیاد بنا کر سابقون کے رد و انکار اور تنقید و تنقیص کی یہ سب سے پہلی مثال ہے- یہ ایسی جرأت ہے جس کے آگے کسی علم کا انکار اور کسی شخصیت کا انکار کوئی معنی نہیں رکھتا ہے- جب اپنی تفہیم کی بنیاد پر حضرت سیدنا علی کی تنکیر و تکفیر کی جا سکتی ہے تو صوفیہ کرام و مشائخ عظام کا رد و انکار کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اللہ ایسے خود ساختہ دربانوں سے محفوظ رکھے جو کسی روز اہل خانہ کو بھی شک کے دائرے میں لا دیں اور داخلہ ممنوع کر دیں- وہابی فکر کے بھی کئی دور گزرے ہیں- حضرت علی کے انکار سے مسلک جمہور سے اعتزال تک اور اعتزال سے علامہ ابن تیمیہ کے افکار تک اور علامہ ابن تیمیہ سے شیخ عبدالوہاب نجدی تک اور شیخ نجدی سے مولوی اسماعیل صاحب دہلوی اور مولوی اسماعیل دہلوی سے موجودہ متمول وہابیت تک-

وہابی تحریک مولوی اسمٰعیل دہلوی تک دلچسپ تضاد بیانی و عملی سے گزرتی رہی- علامہ ابن تیمیہ جہاں ایک طرف صوفی فکر کو دار پر کھینچ کر سنگسار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں سلسلہ قادریہ کا خرقہ پہنتے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے ہیں- اسی طرح مولوی اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان میں فیل مست خرام کی طرح اتحاد و اتفاق امت کو روندتے ہوئے نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف عبقات و صراط مستقیم میں ائمہ صوفیہ کی اقتدا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن موجودہ وہابیت علامہ ابن تیمیہ اور مولوی اسماعیل دہلوی کے سنگ میل سے بہت

آگے نکل چکی ہے اور اب اس میں روز اول کی طرح اپنی تفہیم کی بنیاد پر سابقون کی سراسر تنقید و تنقیص ہے-

اگر وہابیت **انا خیر منه** کی جلوہ گاہ ہے تو صوفیت **ربنا ظلمنا انفسنا** کی چلہ گاہ ہے- اگر وہابیت عقل کی موشگافی ہے تو صوفیت عشق کی خموشی ہے- اگر وہابیت طائف کی وادی ہے تو صوفیت **اهد قومی** کی وظیفہ خوانی ہے- اگر وہابیت بصارت ہے تو صوفیت بصیرت ہے- اگر وہابیت خود کو ناجی مان چکی ہے تو صوفیت شب و روز خود کو خوف دوزخ سے پگھلا رہی ہے اور **وقنا عذاب النار** کا وظیفہ پڑھ اور پڑھا رہی ہے- اگر وہابیت **وما اوتیم الا قلیلا** ہے تو صوفیت **وعلمناہ من لدنا علما** ہے-

سوال:- نظری اور عملی تصوف میں کیا فرق ہے اور موجودہ حالات میں تصوف کی اشاعت کے لیے کس کس انداز سے کام کرنے کی ضرورت ہے؟

سید شمیم احمد منعمی:- نظری اور عملی تصوف میں وہی فرق ہے جو اصول حدیث اور حدیث میں ہے یا اصول فقہ اور فقہ میں ہے- یا پھر Jurisprudence اور Law میں ہے- لیکن یہ یاد رہے کہ نظری تصوف یا فلسفۂ تصوف کا ماہر ہونا ٹھیک اسی طرح صوفی ہو جانے کی دلیل نہیں ہے جس طرح کسی مستشرق کا بعض اسلامی علوم پر گراں قدر کام کر جانا اس کے مسلمان ہونے کی دلیل نہیں ہے- نظری تصوف ساحل سمندر سے سمندر کا نظارہ ہے اور عملی تصوف غوطہ لگا کر موتی نکال لانا ہے-

موجودہ حالات میں بھی تصوف کے کام کو سب سے بڑا خطرہ اور سب سے زیادہ نقصان نیم حکیم قسم کے نیم صوفی اور صوفی نما متصوفین سے ہے- یہ اپنی بول چال اور گفتار و کردار سے اقدار و اوصاف تصوف کو جس قدر نقصان پہنچاتے ہیں اس قدر نقصان تو منکرین تصوف سے بھی نہیں پہنچتا- یہی وجہ ہے کہ تصوف کی تمام مستند تصانیف میں نقلی صوفی اور صوفی نما افراد و جماعت پر سخت سے سخت تنقیدیں دیکھنے کو ملتی ہیں- اسی لیے مشائخ کی یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ ان کے حلقۂ ارادت کا کوئی شخص تصوف کی ایسی ترجمانی خواہ وہ قولی ہو یا فعلی نہ کرے جس سے تصوف کی معنویت کو ٹھیس پہنچے-

علم تصوف کے خواہاں ہر فرد کو پہلے علم ظاہر میں خاطر خواہ محنت و مصروفیت رکھنی چاہیے ورنہ علم تصوف سے بجائے فائدے کے نقصان ہوگا اور اگر کوئی جہل پر مصر، کسی بزرگ صوفی کا نام بطور مثال لے تو وہ راہ تصوف کے لیے روز اول سے ہی نالائقی کا ثبوت فراہم کر رہا ہے-حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) فرماتے ہیں:

"ولا تکونوا من جهال الصوفية فانهم لصوص الدين وقطاع الطريق"

(جاہل صوفیہ کی طرح مت بن جانا جو دین کے چور اور لٹیرے تھے-)

دوسری چیز یہ کہ مشائخ کی کتابوں کے تراجم یا شروح وحواشی کی ذمہ دار اشاعت ہونی چاہیے جس سے اس راہ کو سر کرنے والے کے لیے آسانیاں پیدا ہوں، ساتھ ہی ایسی کتابوں کی اشاعت سے پرہیز بھی کرنا چاہیے جس سے متشابہات پیدا ہوں-

مشائخ کی ان کتابوں کی اشاعت بھی ہونی چاہیے جو انہوں نے علم تفسیر وحدیث وفقہ و دیگر علوم منقولہ وغیر منقولہ سے متعلق تالیف فرمائی ہیں تاکہ علوم وفنون کے ارتقاء میں صوفیہ کرام کی گراں قدر خدمات نمایاں ہو سکیں-

مشائخ کی درگاہیں اور خانقاہیں ہمہ وقت اور ہمہ جہت تبلیغ ودعوت اور خدمت خلق اللہ کا مراکز رہی ہیں، فی زمانہ یہ ذمہ داری بعض مراکز پر غفلت کا شکار ہوگئی ہے، اعراس یا خاص مواقع پر خانقاہوں کی آبادی اور سالوں بھر ویرانی بھی تصوف کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ ہے، ہر خطے میں پھیلی ہوئی بے شمار درگاہیں اور خانقاہیں اگر خاطر خواہ طور پر مصروف عمل ہو جائیں تو تصوف کی حیات بخش روشنی سے گوشہ گوشہ منور ہو جائے-

خانقاہوں اور درگاہوں میں اوقات کی پابندی کے ساتھ عام لوگوں کے لیے قرآن و حدیث نیز مستند کتب صوفیہ کے درس کا اہتمام، عام لوگوں نیز طالبین طریقت کے لیے تربیتی ہفتوں کا التزام، ذکر و مراقبہ کی بافیض مجالس کا انعقاد اور ضروری عوامی مسائل کے لیے حتی الامکان اقدام یہ ایسی سرگرمیاں ہیں جن سے اندرون ملت بھی انقلاب آئے گا اور بیرون ملت بھی-

سوال:-اہل سنت وجماعت پر بدعت نوازی کا الزام کتنا درست ہے؟

سید شمیم احمد منعمی:-اگر ایمان داری سے محاسبہ کیا جائے تو یہ الزام خود ملزمین پر بہر خوبی ثابت ہوتا ہے اور ان کے مقابلے اہل سنت و جماعت قرآن وسنت کی پاسداری و پابندی میں ان چودہ سو برسوں میں منفرد نظر آتے ہیں-

کسی خاص نسل کے بادشاہوں کا یکے بعد دیگرے نسلی بنیادوں پر مسلمانوں کے ملک اور جان و مال کا مالک بننا مخالفین اہل سنت و جماعت کے نزدیک عین شریعت ٹھہرتا ہے، انہیں بادشاہت کے علاوہ ہر چیز میں بدعت نظر آتی ہے-

اسلامی ملکوں کے غیر اسلامی بادشاہوں کی تصویریں کرنسی نوٹوں سے لے کر شاہ راہوں، دفتروں اور انتہا یہ کہ مسجد حرام کے اندر انتظامیہ کے دفتروں میں آویزاں ہیں اور یہ سب عین اسلام اور بدعت سے پاک ہیں-

مسجدوں سے منبر ہٹا کر کرسی لگائی جا رہی ہے اور امام کے خطبہ دینے کے لیے منبر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سادگی کے بجائے بادشاہوں کے جھروکھوں کی مانند تعمیر کو تیزی سے معمول بنایا جا رہا ہے اور یہ سب بدعت پروف اعمال ہیں-

حرم کے علاوہ اکثر مساجد میں باضابطہ سرکاری طور پر امام کو ہی مؤذن اور مکبر یعنی تینوں ذمہ داری اکیلے ادا کرنے کا پابند کر دیا گیا ہے اور یہ بھی عین شریعت، پاک از بدعت ٹھہرا-

نمازوں میں مکروہات کو بھی اس طرح قبولیت مل گئی جیسے مستحب ہوں اور سنت مؤکدہ نمازوں کا باضابطہ ترک بھی عام ہو گیا اور یہ بھی قطعی بدعت وضلالت نہ ٹھہرا-

چوں کفر از کعبہ برخیزد
کجا ماند مسلمانی

یہ سرکاری جھلکیاں ان اعمال کی ہیں جو بدعت غلیظہ ہیں اور علی الاعلان بالقصد و بالارادہ ترک سنت ہیں اور ان کی تاویلات عذر گناہ بدتر از گناہ کی مصداق ہیں، ان کے مقابلے میں اہل سنت و جماعت پر بدعت نوازی کا الزام کج فہمی، ژولیدہ دماغی اور نفاق بین المسلمین کے ارادے سے لگایا گیا ہے-

سوال:-"علمائے ربانیین" کون ہیں؟ اور آج ان کی تلاش کہاں کی جائے؟ مدارس

میں، خانقاہوں میں، یا کہیں اور؟

سید شمیم احمد منعمی :- علمائے ربانیین سے یہ دنیا کبھی خالی نہیں ہوتی ہے سوائے وقت فنا کے- لیکن اس دنیا میں ان کی تلاش **کونوا مع الصادقین** کے حکم سے فرض ہے اور یہ بھی طے ہے کہ ان کی تلاش میں کامیابی بغیر فضل الٰہی کے ناممکن ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب عالم ربانی حضرت خضر کے دیدار اور ان سے استفادہ کا شوق ہوا تو جو طریقہ بتایا گیا وہ سورۂ کہف میں موجود ہے اور غیر معمولی ہے اور قرآن کریم سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس کوشش میں ناکام کرنے کے لیے شیطان ایڑی چوٹی کا زور بھی لگاتا ہے- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق تلاش خضر میں بھٹک کر عرض کرتے ہیں، **وما انسٰنیہ الا الشیطان ان اذکرہ** جب ان کی تلاش میں ایک پیغمبر کی راہ میں شیطان اس قدر فعال ہے تو ان علمائے ربانیین سے تعلق و مودت اور ان سے اخذ فیضان و نسبت نیز ان کی بارگاہوں، درگاہوں اور خانقاہوں میں حاضری کے عنوان پر شیطان کیا کیا عیاری مکاری نہ کرتا ہوگا، کبھی اسے خلاف شریعت بتائے گا تو کبھی اسے بدعت سمجھائے گا تو کبھی اسے قبر پرستی سے تعبیر کرے گا اور کبھی شرک ہی قرار دے دے گا- ایسا دراصل شیطان اس لیے کرتا ہے کہ وہ خود اسی راہ میں بھٹک کر برباد ہوا ہے، تو اس کی پہلی خواہش ہے کہ میں اس راہ پر آنے والے سے اپنا انتقام لیتا رہوں اور جس طرح میں نے عالم ربانی حضرت آدم علیہ السلام کی تنقیص کی تھی اسی طرح ان سے بھی تنقیص علمائے ربانی کراتا رہوں گا- **العیاذ باللہ**

اب سوال یہ ہے کہ ان علمائے ربانی کو کہاں تلاش کی جائے، مسجد میں یا مدرسے میں؟ تو اس کا جواب حضرت مولانا جامی خوب دے گئے

خوشا مسجد و مکتب و خانقاہے
کہ دروئے بود قیل و قال محمد ﷺ

سچ تو یہ ہے کہ جب تک کوئی سمندر شوق کے ساحل پر سفر اختیار نہیں کرے گا اور شوق و فضل الٰہی کے مجمع البحرین تک نہیں پہنچے گا اور علامت کے بھول جانے پر شیطان مردود سے پناہ طلب نہیں کرے گا وہ عالم ربانی تک نہیں پہنچ سکتا-

یہ بھی درست ہے کہ گر کوئی اچھے بڑے اور ماڈل اسکول کی تلاش میں مقامی اسکولوں میں داخل نہ ہو تو وہ جاہل ہی رہ جائے گا اس لیے تلاش جب طویل ہو تو طول شب فراق کو شیطان کا افسانہ سمجھ لینا چاہیے اور اپنے قریب میں ہی منزل کھوج نکالنا چاہیے-

سوال :- ملکی اور عالمی سطح پر اہل سنت و جماعت کے مابین نقطۂ اتحاد و اشتراک کیا ہے؟

سید شمیم احمد منعمی :- ملکی و عالمی سطح پر اہل سنت و جماعت کے مابین اتحاد و اتفاق و اشتراک جس قدر بھی ہے وہ **سیجعل لھم الرحمن وُدّا** کی تجلی ہے- محبت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدت اولیاء اللہ، وسیلہ الی اللہ اور صحابہ سے لے کر کل تک کے سابقون بالایمان کے لیے سینہ خالی از کینہ یہی وہ مرکزی عناصر ہیں جو اہل سنت و جماعت کے مابین نقطہ اتحاد و اشتراک ہیں-

سوال :- آخر کیا وجہ ہے کہ بہار میں علما، دانشوران، مدارس اور عصری دانش گاہوں کی کثرت کے باوجود وہاں کے تعلیمی اداروں میں علمی ماحول اور جذبۂ مسابقت کا فقدان ہے؟

سید شمیم احمد منعمی :- بہار میں کثرت کے باوجود قلت کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی لیاقت بڑے پیمانے پر بیرونی ریاستوں اور راجدھانی دہلی کی طرف ہجرت کر جاتی ہے اور وہاں کی قلت کو کثرت اور وہاں کے خزاں کو بہار بخشتی ہے- اسی لیے اس ملک کی تمام بڑی دانش گاہیں نہ صرف بہار کے طلبہ سے پُر ہیں بلکہ اساتذہ کی صف میں بھی بہار کے اہل علم نمایاں ہیں- یہی حال معاصر علوم و فنون کا ہے- بہار کے سپوت دوسروں کی ترقی کے معمار بنے ہوئے ہیں- یہی وجہ ہے کہ خود بہار پسماندہ ہوتا جاتا ہے- اگر بہار میں بھی اچھے معیاری تعلیمی ادارے جدید تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو بہار کے بہترین دماغ بہار کو پُر بہار کر سکتے ہیں-

ایک دوسری وجہ بہار میں خاطر خواہ پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کا فقدان ہے- بے توجہی، بے حسی اور ناقدری کا معاملہ بھی پتہ نہیں کہاں سے یہاں آ گیا ہے- یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہیرا دوسری جگہ آنکھیں خیرہ کر رہا ہے لیکن وہ بہاری لغت کے اس محاورے کا

مصداق بنا ہوتا ہے: گھر کی مرغی دال برابر

ایک تیسری وجہ بہاریوں سے غیر بہاریوں کا تعصب ہے، ساری لیاقت کے باوجود اگر کوئی بہاری ہے تو یہی اس کا سب سے بڑا ڈی میرٹ ہے، اس بغض و کینہ نے بھی بہاری لیاقت کو احساس کمتری اور پست حوصلگی کا شکار بنایا ہے اور جائز حقوق و مقام سے محروم رکھا ہے-

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بہار کے تعلیمی ادارے خواہ وہ مدارس ہوں یا عصری دانشگاہیں وہاں عمارتیں اور طلبہ کی کثرت تو دیکھنے کو ملتی ہے لیکن نصاب اور طریقۂ تعلیم Up to date نہیں ہے، جدید تقاضوں سے جیسی ہم آہنگی ہونی چاہیے وہ نظر نہیں آتی، سب سے برا حال سرکاری تعلیمی اداروں کا ہے، یہاں کے اساتذہ و ذمہ داران اپنی معاش سے مطمئن ہو کر جد وجہد بھول چکے ہیں اور ان کی عدم دلچسپی نے علمی ماحول اور مسابقاتی فکر کو مردہ کر دیا ہے- سرکاری مدارس کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے، لمبے عرصے تک تنخواہوں کے نہ ملنے سے سرکاری دفاتر کی دوڑ بھاگ اور روزانہ کی دقتوں نے نظام درس وتدریس کو بے روح کر دیا ہے، مدارس میں زیادہ تر مکاتب ہیں اور اونچے درجے خال خال ہی چلتے ہیں اور وہ بھی نا قابل تذکرہ یا برائے نام- ان ساری وجوہات کے علاوہ فکر معاش نے تعلیمی نظریے میں جو انقلاب برپا کر دیا ہے وہ تو صحت مند تعلیم و تعلم کے لیے قیامت سے کم نہیں ہے-

سوال:- کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ عصری اداروں میں تعلیم حاصل کرنے سے فکر و عمل میں کجی پیدا ہو جاتی ہے، آپ اس تعلق سے کیا کہتے ہیں؟

سید شمیم احمد منعمی:- فکر و عمل میں کجی اگر عصری اداروں کا نتیجہ ہوتیں تو جتنے فرقے اور مسلک پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں، ان کے بانیین عصری دانش گاہوں کے فارغین ہوتے- دراصل عصری اداروں میں دو طرح کے معاملے ہیں، یا تو وہاں دین اور مذہب کا دور دور تک نہ پتا ہے اور نہ چرچا ہے- نتیجتاً اس ماحول میں پرورش پانے والے نوجوان دین سے اس طرح متوحش رہتے ہیں جیسے جنگل سے آنے والے ہرن آبادی سے-

دوسرا معاملہ یہ ہے کہ عموماً عصری اداروں میں طلبہ کے درمیان دینی رجحان پیدا

کرنے والے صحیح العقیدہ فکر کے ترجمان بہت کم ہیں- یہی وجہ ہے کہ ان کا ناپختہ ذہن بد عقیدگی کے ساتھ پختہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یھدی من یشاء کی جلوہ باری اپنا کام کرتی ہے اور عصری اداروں کے فارغین میں بھی متقی و پرہیز گار اور صوفیہ کرام کے عشاق نیز دین کے اچھے واقف کار ملتے ہیں-

سوال:- کالج اور یونیورسٹی دعوت وتبلیغ کے لیے بہترین میدان ہیں، آپ کی نظر میں اس میدان میں کام کرنے کے لیے کس طرح کی منصوبہ بندی ہونی چاہیے؟

سید شمیم احمد منعمی:- یہ بالکل صحیح و درست ہے کہ کالج اور یونیورسٹی دعوت وتبلیغ کے بہترین میدان ہیں، عقل وفہم اور علم ودانش کی نئی نئی کونپلیں یہاں پھوٹتی رہتی ہیں، ان کے درمیان کام کرنے کے لیے ان کی زبان اور ان کے ماحول سے یکسانیت رکھنے والے طریقۂ کار زیادہ مفید رہیں گے- بہت روایتی یا بہت تنقیدی طریقۂ کار شاید خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن یہ طے ہے کہ جہاں اس عمر کے طلبہ میں گمراہ ہونے کے امکانات قوی ہوتے ہیں، وہیں اس عمر میں دین داری و پرہیز گاری کا ذوق وشوق بھی بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے، اگر ہم نے مثبت جبلّت کو قاعدے سے مہمیز نہیں لگائی تو ایک بہت بڑی تعداد جس پر مستقبل کا انحصار ہے، وہ دین سے یا تو ناواقف رہ جائے گی یا پھر دین سے متوحش ہو جائے گی-

ہر عصری دانش گاہ میں طلبہ کی ایسی انجمنیں تشکیل پانی چاہییں جو خوش عقیدہ دینی شغف اور رجحانات کو پیدا بھی کریں اور ان کی حفاظت بھی کریں اور اس میں مقامی مربیین کی مدد ونصرت مناسب طریقے پر ملنی چاہیے، اچھے علما وخطبا کے لیکچرس بھی اگر طلبا کو نصیب ہوتے رہیں جس میں دینی موضوعات سے متعلق واقفیت بخشنے کے ساتھ ساتھ ان کے شکوک وشبہات بھی دور کر دیے جائیں تو بہت مناسب ہوگا- اچھے مطالعے کا شوق و ذوق بھی پیدا کرانا چاہیے، اگر کتابیں اور کتابچے مہیا کرائے جائیں تو بہتر ورنہ ان تک ان کی رہنمائی کی جائے- اس کے علاوہ وقت اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے کہ ان کا دین کا رجحان فزوں سے فزوں تر ہوتا جائے-

سوال:- موجودہ دور میں ایک طرف میدان سیاست میں علما کے اترنے کی بات

کی جارہی ہے تو دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علما سیاست میں آنے کے بعد اپنا تقدس سلامت نہیں رکھ پاتے-اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟

سید شمیم احمد منعمی:-سیاست اور علما یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق ہیں یا مخالف؟ معاصر تاریخ میں اگر اس کا جواب ڈھونڈیں تو ایران کی سرزمین علما کی سیاسی بصیرت کی بلائیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن اسی سوال کا ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک ہی نام و بینر تلے چلنے والی ایک دینی جماعت سرحد کے پار سیاست کو لقمہ حلال سمجھ رہی ہے اور اس پار لقمۂ حرام -دراصل بعض لوگ جس طرح مسجد کو نماز کے لیے محدود کردیتے ہیں اسی طرح علما کو بھی مصلیٰ تک محدود ومقید دیکھنا چاہتے ہیں، جہاں مسجد میں نماز کے علاوہ ہر کام خواہ اس کا دینی وملی پس منظر جو بھی ہو شان کے خلاف نظر آتا ہے اور مسجد ناپاک دکھتی ہے، ٹھیک اسی طرح علما کی سیاسی بصیرت وپیش قدمی بھی دامن امامت پر مثل داغ نظر آتی ہے- پتا نہیں ایسی سوچ میں علما کے لیے خلوص ہے یا کہیں پر اپنے لیے عدم تحفظ کا احساس ہے- **واللہ اعلم**

یہ بالکل درست ہے کہ جیسے عہد نبوی میں خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بعض کا توریت وزبور وانجیل کا علم حاصل کرنا درست نہیں تھا اور بعض کے لیے یہ حکم تھا کہ عبرانی پڑھو اور صحائف وکتب سماویہ کا بھی علم حاصل کرو، اسی طرح جسے یہ خوف وخطرہ ہو کہ سیاست مجھے طاہر نہیں رکھے گی اس کے لیے اس سے اجتناب دین ہے اور جس میں یہ عزیمت موجود ہو کہ وہ مردانہ وار اس راہ میں خود دین پہنے ہوئے ہر وار سیاست سہہ لے گا تو اسے سیاست روا ہے- **لاھلہ حلال ولغیرہ حرام واللہ ورسولہ اعلم**-□□□

(شمارہ جون ۲۰۰۹ء)

مولانا عبدالحکیم شرف قادری

سابق شیخ الحدیث: جامعہ نظامیہ، لاہور، پاکستان

مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری اہل سنت وجماعت کے ان ممتاز علمائے محققین میں ہیں جن کی تحقیقات پر ان کے اکابر نے بھی حد درجہ اعتماد کیا-موصوف منفرد محقق وقلم کار ہونے کے ساتھ منجھے ہوئے مدرس، نکتہ رس خطیب اور عربی وفارسی زبانوں کے ماہر تھے-آپ نے اپنی ۶۳/سالہ زندگی میں ملت کی رہنمائی کے لیے جتنا کام کیا وہ بقول شارح مسلم مولانا غلام رسول سعیدی ''قابل رشک اور لائق تقلید ہے''-آپ کی ولادت مرزا پور ضلع ہوشیار پور پاکستان میں ۱۹۴۴ء میں ہوئی-۳/سال کی عمر میں لاہور ہجرت کی اور ابتدائی تعلیم اسی شہر میں مکمل کی، پھر بالترتیب جامعہ رضویہ فیصل آباد، جامعہ نظامیہ لاہور اور جامعہ مظہریہ امدادیہ بندیال میں داخل ہوکر اپنے وقت کے جلیل القدر علما (محدث پاکستان مولانا سردار احمد، مولانا عطا محمد بندیالوی چشتی، مولانا اشرف سیالوی اور مفتی عبدالقیوم ہزاروی) سے درس نظامیہ کی تکمیل کی اور ۱۹۶۴ء میں سند فضیلت حاصل کی-فراغت کے بعد ۶۵ء میں جامعہ نعیمیہ لاہور سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، ۶۶ء میں جامعہ نظامیہ لاہور منتقل ہوگئے اور پھر اپنی پوری تدریسی زندگی اسی ادارے سے وابستہ رکھی-اس درمیان آپ نے عربی، فارسی اور اردو میں دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں، اہم علمی کتابوں کے ترجمے کیے، درسی وغیر درسی کتابوں پر مقدمات، حواشی اور شروحات لکھے اور مختلف علمی وفکری موضوعات پر پچاسوں مضامین ومقالات سپرد قلم کیے-آپ کی انہی علمی خدمات کے اعتراف میں متعدد اداروں نے آپ کو اعزازات سے نوازا-آپ کا وصال یکم ستمبر ۲۰۰۷ء میں ہوا-مختلف زبانوں میں ان کی ہزاروں صفحات پر پھیلی درجنوں تصانیف، تراجم اور حواشی یقیناً طالبان منزل شوق کی رہنمائی کرتے رہیں گے-

سوال:- آپ ہندوستان پہلی بار کب تشریف لائے؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- میرا نام ہے محمد عبدالحکیم شرف قادری، میں لاہور پاکستان سے حاضر ہوا ہوں- پہلی دفعہ غالباً ۱۹۹۴ء میں سرہند شریف امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس شریف میں حاضر ہوا تھا-

سوال:- ہندوستان آنے سے قبل یہاں کے مسلمانوں کے معاشرتی، مذہبی، ثقافتی اور تعلیمی معیار کے متعلق آپ کیا تاثر رکھتے تھے؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں معاشرتی اور معاشی طور پر یہ تاثر تھا کہ وہ تجارت، زراعت، ملازمت بلکہ ہر میدان میں بہت پیچھے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ میں انہیں کافی پسماندہ سمجھتا تھا- معاشی لحاظ سے بھی اور تعلیمی لحاظ سے بھی، لیکن مذہبی اعتبار سے میری یہی رائے تھی اور ہے کہ ہندوستانی مسلمان پاکستانی مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط ہیں- اس لیے کہ یہاں ایک مقابلے کی کیفیت ہے، ایسی صورت میں آدمی زیادہ مضبوط اور غیرت مند ہوتا ہے، کیونکہ جب دیکھتا ہے کہ دوسرا آدمی اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہے تو ہمیں بھی اپنے دین وایمان کی حفاظت کے لیے قربانی دینی چاہیے-

سوال:- ہندوستان تشریف لانے کے بعد اب آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- میں نے محسوس یہ کیا ہے کہ حکومت ہندوستان مسلمانوں کو بالکل نظرانداز نہیں کر رہی ہے بلکہ جہاں وہ دوسرے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتی ہے وہاں وہ مسلمانوں پر بھی توجہ دے رہی ہے، خاص طور پر مسلمانوں کے وہ دینی مدارس جن کا الحاق الہٰ آباد بورڈ کے ساتھ ہے ان کو وہ بڑی ہی گراں قدر امداد گرانٹ کی صورت میں دیتی ہے- یہاں کے مدارس کے جو اساتذہ ہیں ان کی تنخواہیں چھ چھ آٹھ آٹھ ہزار روپئے تک ہیں- میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اچھی علامت ہے، جبکہ حکومت کو دینی مدارس کے علما سے کوئی فائدہ نہیں ہے- مدارس کے علما نہ تو ان کے ووٹرز

ہیں اور نہ ان کے حق میں رائے عامّہ کو ہموار کرتے ہیں، یعنی ان سے ظاہری فائدہ نہ ہونے کے باوجود حکومت ہند کا ان کی امداد کرنا ایک نیک فال ہے اور اچھی علامت بھی، اس کی قدر کرنی چاہیے-

سوال:-آپ نے ہندوستان کے مختلف مدارس اور خانقاہوں کا دورہ کرنے کے بعد علماے اہل سنت کی مذہبی سرگرمیوں کے متعلق کیا رائے قائم فرمائی؟ کیا یہاں کے علما کی سرگرمیوں سے عوام مطمئن ہیں؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- ہندوستان آنے کے بعد میں نے ممبئی کے کچھ مدارس کا سروے کیا، لیکن وہاں اکثریت مقامی طلبہ کی ہے وہ یا تو قرآن پاک پڑھ رہے ہیں یا درس نظامی، اس لیے زیادہ لمبا چوڑا اسسٹم دیکھنے میں نہیں آیا- البتہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور جب میں گیا تو الحمدللہ! یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جامعہ اشرفیہ کا جو رقبہ ہے وہ کوئی ۱۲۵ ایکڑ ہے یہ بہت وسیع رقبہ ہے، عمارات بھی بہت عالی شان ہیں اور پھر عزیز ملت حضرت مولانا عبد الحفیظ صاحب مدظلہ العالی نے علما کی جو ٹیم جمع کی ہے وہ بہت ہی شاندار ہے- میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک درۂ یکتا ہے اور جو کام جامعہ اشرفیہ میں ہو رہا ہے وہ پورے ملک میں مجھے کسی دوسرے مدرسے میں نظر نہیں آتا- ہندوستان میں جامعہ اشرفیہ اور پاکستان میں جامعہ نظامیہ رضویہ اہل سنت کی مذہبی سرگرمیوں کے اہم مراکز ہیں- اب رہی بات کہ عوام اہل سنت علما سے مطمئن ہیں یا نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم، کیوں کہ عوام اہل سنت کے ساتھ مجھے کوئی زیادہ میل جول اور رابطے کا موقع نہیں ملا، رہی میری بات تو میں خود مطمئن نہیں ہوں- علما کو جتنا فعال اور مستعد اور سرگرم ہونا چاہیے وہ بات مجھے نہ تو ہندوستان میں نظر آئی اور نہ ہی پاکستان میں- ہمارے یہاں عام طور پر یہ رواج بن گیا ہے کہ مدرسے میں پڑھ لیا اور پڑھا لیا، امامت اختیار کر لی، مسجد سے لگ گئے یا خطیب بن گئے اور بس، حالانکہ ایک عالم دین کی جو ذمہ داریاں ہیں وہ اِس محدود دائرے سے کہیں بڑھ کر ہیں- مدرسے اور مسجد سے باہر بھی اُن کی ذمہ داریاں ہیں کہ تصنیف واشاعت کے میدان میں وہ کام کریں، مکتبہ قائم کریں اور زبانی دعوت وتبلیغ بھی اس جذبے کے تحت کہ اللہ ورسول کا پیغام لوگوں

تک پہنچانا ہے، لیکن معلوم ہو رہا ہے کہ رسمی طور پر علما یہ کام کر رہے ہیں اور اسی پر اکتفا کیے بیٹھے ہیں، حالانکہ اس پر اکتفا نہیں ہونا چاہیے-

سوال: - نئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر بے چینیوں کے آثار پائے جاتے ہیں، کیا ان وجوہات پر آپ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری: - میں نے یہاں پر اہل سنت و جماعت کے بہت سے نوجوانوں سے ملاقات کی، ان لوگوں میں دیکھا ہے کہ واقعی یہ حضرات بے چینی کا مجسمہ ہیں اور اس بات سے مجھے خوشی ہوئی ہے- یہ لوگ اپنے اندر ایک تڑپ رکھتے ہیں، سوچ رکھتے ہیں کہ ہمیں کچھ کرنا چاہیے- آپ نے کہا ان کے وجوہات کیا ہیں؟ وجوہات ظاہر ہیں کہ جب آئیڈیل شخصیتیں تسلی بخش انداز میں کام نہیں کریں گی تو پھر عوام الناس بھی بے چینی محسوس کریں گے اور طلبہ اور نوجوان بھی بے چینی محسوس کریں گے- یہ ذمہ داری میں سمجھتا ہوں کہ سرکردہ علما اور مشائخ کی ہے کہ ان نوجوانوں کے سروں پر ہاتھ رکھیں، دست شفقت رکھیں اور ان کی بات کو سنیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں، کس انداز میں کام چاہتے ہیں- یہ کہنا کہ تم باغی ہو گئے ہو تمہیں ہم مسترد کرتے ہیں یہ بات اچھی نہیں ہے، بلکہ ان سے پوچھا جائے کہ آپ چاہتے کیا ہیں- اگر وہ دین اور مسلک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ان کی ہر طرح سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے-

سوال: - آپ ایک مؤقر درس گاہ کے شیخ الحدیث ہیں، کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ عصری تقاضوں کے پیش نظر مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے؟ اپنے تجربات کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری: - میں جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں حدیث شریف کا خادم ہوں اور مجھے کوئی تیس سال ہو گئے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ انعام اور اس کا احسان ہے، حق یہ ہے کہ عصری تقاضوں کے مطابق مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تبدیلی کی تو بہر حال ضرورت ہے اور بالخصوص ہمارے مدارس میں انگریزی کی تعلیم ضرور ہونی چاہیے اور جدید عربی کی بھی- کیوں کہ اگر ہم اپنا پیغام انٹرنیشنل سطح پر پہنچانا چاہتے ہیں تو انگلش کے بغیر کوئی

چارہ نہیں ہے- رہی جدید عربی کی بات تو عرب ممالک کے ساتھ ہمارے دینی، ایمانی اور روحانی تعلقات ہیں، لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان رابطہ نہیں ہے- میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر کی فروگزاشت ہے اور یہ میں کوئی گستاخی نہیں کر رہا ہوں کہ انہوں نے عربی لٹریچر تیار نہیں کیا اور عربوں کے ساتھ انہوں نے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا-

درس نظامی کے نصاب میں ایسی کتابیں شامل ہیں جو چھ سو سال یا پانچ سو سال پرانی لکھی ہوئی ہیں- ہماری کمی یہ ہے کہ مولانا جامی نے کافیہ کی شرح لکھ دی تو اب دوسرا آدمی اس کی شرح نہیں لکھ سکتا جب کہ عرب و مصر کے اساتذہ اور دوسرے ممالک کے اساتذہ نے نئی نئی کتابیں اپنے تجربات کی روشنی میں لکھی ہیں جو طلبہ کے لیے مفید ہیں- ہمارے علما کو چاہیے کہ وہ خود کتابیں تیار کریں- یعنی بے شمار کتابیں جو دنیا کے اندر موجود ہیں ان کو سامنے رکھیں اور اپنے لیے ایک نئی کتاب تصنیف کریں اور ایسی کتابیں لکھ کر شاگردوں کو بھی تلقین کریں کہ اگر وہ اپنے دور میں نئی کتابوں کی ترتیب کی ضرورت محسوس کریں تو وہ بھی لکھیں-

ہمارے مدارس میں اصول و عقائد کی نئی کتابیں لانی چاہیے کیوں کہ شرح عقائد چھ سو سال پرانی لکھی ہوئی ہے، اس کے علاوہ تقابل ادیان اور تاریخ اسلام کو اہمیت دینی چاہیے مزید یہ کہ تصوف کو بھی شامل کریں کیوں کہ تصوف دل میں خوف خدا اور اتباع رسول کا جذبہ پیدا کرتا ہے، ایک آدمی کو انسان بناتا ہے اور نیکی و تقویٰ کی طرف مائل کرتا ہے- یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہمارے یہاں منطق و فلسفہ تقریباً نکال دیا گیا ہے اور ''توضیح و تلویح'' جیسی کتاب رکھی ہوئی ہے جب کہ ایک طالب علم اس کتاب کو بغیر منطق و فلسفہ کے سہارے نہیں پڑھ سکتا-

سوال: - آج ہمارے مخالفین کا ہم پر یہ اعتراض ہے کہ ہمارے علما اپنے جلسوں میں صرف شانِ رسالت، اختیارات انبیاء اور عظمت اولیاء پر ہی گفتگو کرتے ہیں، توحید کے موضوع پر بہت کم بولتے ہیں، ان کے الزامات کہاں تک درست ہیں؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری: - اصل میں یہ ہوا کہ انگریز کے دور اقتدار میں ایسے

فتنے کھڑے کیے گئے اور ایسے علما کی سر پرستی کی گئی جنہوں نے توحید کی آڑ میں عظمت نبوت اور عظمت ولایت کو مجروح کرنے کی کوشش کی، انہوں نے کہا کہ اللہ کو مانو اور کسی کو نہ مانو- علمائے اہل سنت اور خاص طور پر اعلیٰ حضرت شاہ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ نے بھرپور انداز میں ان لوگوں کی مذمت کی اور ان کے سیلاب کے آگے بندھ باندھ دیا بلکہ میں کہوں گا کہ ان کے منہ میں لگام دے دی، مگر اب بھی وہی سلسلہ برقرار ہے، ہمارے یہاں ایسی بہت سی جماعتیں ہیں جو اللہ رب العزت کی وحدانیت اور اس کی عظمت و جلالت کو متفقہ طور پر مانتی ہیں مگر رسول پاک ﷺ اور اولیائے کرام کی عظمت کے سبھی قائل نہیں ہیں، اس لیے ہمارے علما اس طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں- مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے مقصود بالذات اور ایک ہوتا ہے مقصود بالعرض، مقصود بالذات کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی مقصود نہیں ہے وہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، اب رہا سوال یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا اور بھی کوئی مقصود ہے یا نہیں؟ تو میں یہی کہوں گا کہ پیر و مرشد بھی مقصود ہے جو رسول پاک کی تعلیمات پر چلنے کا سبق دیتا ہے اور حضور ﷺ بھی مقصود ہیں کیوں کہ وہ ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارہ گاہ میں پہنچائیں گے اس لیے ہمیں اپنی گفتگو، تقریروں اور محفلوں میں توحید کو بھی موضوع سخن بنانا چاہیے نیز رسالت اور ولایت کے بارے میں بھی گفتگو کرنی چاہیے- اب رہی بات ان کے الزامات کی کہ ہمارے علما توحید کے موضوع پر بہت کم بولتے ہیں تو یہ بات صحیح ہے-

سوال:- کہا جاتا ہے کہ ماضی میں علمائے اہل سنت کا وقار عوام میں بہت بلند تھا لیکن دور حاضر میں اس کا انحطاط ہے، ایسا کیوں؟ کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انہیں کون سے مدبرانہ رخ اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- یہ صحیح ہے کہ ماضی میں ہمارے علما کا کردار بہت بلند تھا کیوں کہ وہ صرف گفتار کے غازی نہیں تھے بلکہ کردار کے بھی غازی تھے، وہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے کام کرتے تھے اسی وجہ سے عوام میں ان کی ہیبت تھی اور رعب بھی تھا، آج بھی ایسے علما ہیں جن کی قدر و منزلت عوام کے درمیان بہت ہے

جب وہ کہیں جاتے ہیں تو ہزاروں افراد ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے وعظ و نصیحت کو سننے کے لیے آتے ہیں، اگر ہم اپنے کردار پر نظر ثانی کریں، ہمارے اندر جو کمیاں اور کوتاہیاں ہیں ان کو پورا کرنے کی کوشش کریں، رسول پاک کی اسوۂ حسنہ پر عمل کریں، اپنے اندر فعالیت اور تنظیمی سطح پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا کریں اور عوام سے ایک مضبوط رابطہ بنائیں تو پھر صورت حال تبدیل ہو سکتی ہے، لیکن یہ تمام امور اسی وقت ہوں گے جب ہمارے تمام کام خلوص اور للّٰہیت پر مبنی ہوں-

سوال:- پاکستان میں اب تک نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ کیوں نہیں ہوا؟ کیا اس پس منظر میں علما کی تساہلی ہے یا سیاسی حکمرانوں کی رسہ کشی؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- علما کی تساہلی بھی ہے اور سیاسی حکمرانوں کی رسہ کشی بھی مگر بڑی ذمہ داری حکمرانوں کی ہے کیوں کہ علما قوانین کا نفاذ نہیں کر سکتے اس لیے کہ ان کے پاس اقتدار ہی نہیں ہے تو وہ نظام مصطفیٰ ﷺ کس طرح نافذ کریں گے، حکمران جب اقتدار میں نہیں ہوتے ہیں تو عوام سے کہتے ہیں کہ اقتدار میں آنے کے بعد ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے، اسلامی قوانین کا نفاذ کریں گے مگر اقتدار میں آتے ہی اپنے وعدوں کو بھول جاتے ہیں- جہاں تک علما کا مسئلہ ہے تو وہ بھی ذمہ دار ہیں کیوں کہ پاکستان کے علما نے جماعتی سطح پر کام نہیں کیا، جب جنرل ضیاء الحق کے دور میں شرعی عدالت قائم ہوئی تو انہیں وہاں جا کر قرآن و احادیث کے حوالے سے مسائل دینیہ پر گفتگو کرنی چاہیے تھی مگر انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی یا پھر قوانین کی دفعات نظام اسلام کی روشنی میں ترتیب دیتے اور ایسے افراد تیار کرتے جو جج اور وکلاء کی کرسی سنبھال سکیں، نہ ہی انہوں نے افراد تیار کیے اور نہ ہی لیٹریچر اور نہ ہی ان کے اندر قوت ہے کہ وہ حکومت پر دباؤ ڈال سکیں کہ حکومت نظام مصطفیٰ ﷺ کو نافذ کرے-

سوال:- تبلیغ و اشاعت دین کے سلسلے میں ہندو پاک کے علما میں آپ نے کیا فرق محسوس کیا؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- ایک وقت وہ تھا جب ہندوستان کی راجدھانی دہلی

میں اہل سنت و جماعت کا کوئی تبلیغی اور اشاعتی ادارہ نہیں تھا مگر علامہ ارشد القادری صاحب نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء اور مولانا یٰسین اختر مصباحی نے دار القلم قائم فرمایا اور کتب اہل سنت کی اشاعت کے لیے کئی کتب خانے بھی وجود میں آئے، میں سمجھتا ہوں کہ تبلیغی و اشاعتی سطح پر یہ ایک زبردست انقلاب ہے جس کے اثرات پورے ہندوستان پر مرتب ہوں گے، اب رہی بات کہ اشاعت دین کے سلسلے میں ہند و پاک کے علما میں کیا فرق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ ہندوستان میں خوبصورت ٹائٹل اور مضبوط جلدوں کے ساتھ کتابیں تو بہت سی شائع ہو رہی ہیں مگر نئے نئے موضوعات پر کتابیں نہیں لکھی جا رہی ہیں اور پاکستان میں کتابیں بھی شائع ہو رہی ہیں اور اسی سرعت کے ساتھ جدید موضوعات پر اردو اور عربی دونوں زبانوں میں کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں، وہاں کے کتب خانے صرف کاروباری نوعیت سے ہی نہیں بلکہ تبلیغ و اشاعت دین کے پیش نظر بھی کتابیں شائع کر رہے ہیں، مکتبہ قادریہ لاہور جس کا قیام میرے ہاتھوں عمل میں آیا ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے درس نظامیہ کی بہت ساری کتابوں کو نئے حواشی و شروحات کے ساتھ شائع کیا نیز حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمۃ پر کئی کتابیں شائع کیں کیوں کہ حضرت علامہ اہل سنت کی وہ مظلوم شخصیت ہیں جن پر ہمارے علما نے توجہ نہیں دی-

سوال:- احسان الٰہی ظہیر کی کتاب ''البریلویہ'' کی تردید میں جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں ان کا اسلوب عام بریلوی مزاج سے ہٹ کر ہے، آپ نے اپنی تحریر میں شدت کیوں نہیں اختیار کی؟ اور آپ کے سنجیدہ و شائستہ اسلوب سے کیا فائدہ پہنچا؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- احسان الٰہی ظہیر لاہور کے رہنے والے ایک غیر مقلد تھے جنہوں نے البریلویہ نامی کتاب لکھی جس کی وجہ سے عوام و خواص میں بے چینی محسوس ہونے لگی، اس سلسلے کے پیش نظر مولانا عبدالستار خان نیازی نے پروفیسر طاہر القادری کے گھر علما کی ایک میٹنگ بلوائی جس میں میں بھی حاضر تھا، جہاں اس کے جواب لکھنے پر غور و فکر کیا گیا کہ کون شخص اس کا جواب لکھے، کئی علما کے نام زیر غور آئے، خود پروفیسر طاہر القادری نے کہا کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود ہی اس کا جواب لکھتا مگر مولانا عبد

الستار خان نیازی نے مجھے اس کا جواب لکھنے کے لیے کہا اور میں تیار ہو گیا اور جب میں نے اس کا جواب لکھا تو مولانا موصوف نے اس کے شائستہ اسلوب کی وجہ سے کہا کہ جواب زناٹے دار نہیں ہے- ایک فاضل نے کہا کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی بچے کو گود میں رکھ کر کھلایا جائے، یہ تو بڑے پیار و محبت والے انداز میں لکھی گئی ہے، یہ جواب کا انداز نہیں ہے- ہمارا ایک طبقہ ایسا تھا جو خوش نہیں تھا کہ اس میں بہت شائستہ زبان استعمال کی گئی ہے، مگر میرے پیش نظر یہ تھا کہ جو تعلیم یافتہ اور عوامی طبقہ ہے اور جو کالج و اسکول کے طلبہ ہیں میں ان سے بات چیت کر رہا ہوں اور ان سے گفتگو کرنے کے لیے معقولیت اور سلیس لب و لہجہ میں گفتگو کرنی ہوگی ورنہ وہ اسے قبول نہیں کریں گے- آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسے لب و لہجہ میں اپنی کتابیں لکھیں کہ ہر طبقہ اسے پڑھے اور ہمارے عقائد و نظریات کی طرف متوجہ ہو اور ہمارے سروں سے انتہا پسندی کا الزام دور ہو، یہی وجہ ہے کہ مجھے بیرون ممالک کے اکثر خطوں سے مبارکبادی کے بے شمار خطوط موصول ہوئے- جب میں ہندوستان آیا تو چند علما کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر نے کہا کہ ہم نے آپ کی فلاں فلاں کتابیں پڑھی ہیں اور ہم نے ان سے خوب استفادہ کیا- ویسے بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن**-

سوال:- تبلیغ و اشاعت دین میں حسن اخلاق کی کیا اہمیت ہے؟

مولانا عبدالحکیم شرف قادری:- مذکورہ آیت جو میں نے پیش کی ہے یہ تبلیغ و اشاعت دین میں حسن اخلاق کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کے اپنے مخالفین سے بحث و مباحثہ اور جھگڑا اچھے طریقہ پر کریں- اس ضمن میں میں ایک واقعہ کو بتاتا چلوں کہ فرانس کے معروف فاضل ڈاکٹر حمید اللہ کے پاس ایک خاتون ملنے کے لیے آئیں اور ملاقات کے وقت مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، کیوں کہ یورپ و امریکہ اور فرانس و جرمنی میں یہ عام سی بات ہے کہ عورتیں مردوں سے ہاتھ ملاتی ہیں اور اگر انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور آپ نے نہیں ملایا تو اسے غیر اخلاقی حرکت اور باعث تحقیر و تذلیل سمجھا جاتا ہے، تو جب اس خاتون نے ڈاکٹر صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے مصافحہ نہیں کیا اور فرمایا دیکھئے محترمہ

آپ ناراض نہ ہوں، اسلام نے قرآن پاک کو اتنا احترام دیا ہے کہ بغیر وضو اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا اور اسی اسلام نے عورت کو اتنا تقدس اور احترام دیا کہ بغیر نکاح اسے بھی کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تو وہ ان کی شکر گزار ہوئی- اسی طرح انہوں نے پردے کے بارے میں بھی فرانس میں ایسی حکمت کے ساتھ تبلیغ فرمائی کہ فرانس جیسے عریانیت شعار ملک میں کتنی عورتیں پردہ کرنے لگیں، انہوں نے فرمایا کہ عورتوں کی یہ نفسیات ہے کہ وہ اپنے حسن کی حفاظت چاہتی ہیں، وہ نہیں چاہتیں کہ ان کا حسن ماند پڑے تو جسم کے وہ حصے جو کھلے ہوتے ہیں وہ تمازت، گرد وغبار اور ماحول کے زیر اثر جلدی بدرنگ ہو جاتے ہیں، مگر وہ حصے جو چھپے ہوتے ہیں وہ ویسے ہی تروتازہ رہتے ہیں، لہٰذا بہت سی عورتیں وہاں پردہ کرنے لگیں- اگر ہم اپنی تحریروں اور تقریروں میں تبلیغ واشاعت دین کے لیے حسن اخلاق برتیں گے تو بلاشبہ اسلام ترقی کے منازل طے کرنا شروع کردے گا-□□□

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری

زیب سجادہ خانقاہ قادریہ، بدایوں (یوپی)

بدایوں کی مٹی بڑی زرخیز کہی جاتی ہے، اس خاک سے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب طلوع ہوئے ہیں جن کی تابانیوں سے اسلامیان ہند کی تاریخ ہر دور میں منور رہی ہے، اسی مردم خیز خطے کو چھٹی صدی ہجری میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد امجاد میں سے ایک بزرگ قاضی دانیال قطری نے اپنا مسکن بنایا، ان کی اولاد میں علم وفن کا ایسا تسلسل قائم ہوا کہ اس وقت سے لے کر آج تک یہ خاندان علم ظاہر وباطن میں ملت کی قیادت کر رہا ہے، کسی ایک خاندان میں علم وفن اور تصوف وروحانیت کا ایسا سلسلہ جو آٹھ صدیوں پر محیط ہو، حیرت انگیز بھی ہے اور نادر بھی، کم از کم برصغیر ہندو پاک میں ایسی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی- احقاق حق اور ابطال باطل کے سلسلہ میں گزشتہ دو صدیوں میں اس خاندان کے اکابر کی خدمات اتنی نمایاں ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر جماعت اہل سنت کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی- اسی خانوادے کے چشم وچراغ، تاج الفحول علامہ عبدالقادر بدایونی کے پوتے، عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی کے صاحبزادے اور خانوادۂ قادریہ عثمانیہ کی روحانی امانتوں اور روایات کے وارث، شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری ہیں، جن کی ولادت ۲۶رشعبان ۱۳۵۸ھ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی، تعلیمی مراحل اپنے آبائی مدرسے مدرسہ قادریہ میں طے کیے- آپ کی متعدد کتابیں اور نعت ومناقب کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں- آپ اپنی خاندانی اور خانقاہی روایتوں کے پابند، اخلاق وتواضع میں اپنے اکابر کا نمونہ، میانہ روی، توازن واعتدال، صبر وتحمل اور اعلیٰ ظرفی میں سلف کی یادگار ہیں- ۲۰۱۰ء میں آپ کی سجادگی کو پچاس سال مکمل ہوگئے ہیں- آپ کی اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی اور تعمیری خدمات کا سلسلہ نصف صدی کو محیط ہے-

سوال:- خانوادۂ عثمانیہ اور خانقاہ قادریہ بدایوں کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں خاندان عثمانی بدایوں کے مورث اعلیٰ قاضی دانیال قطری قطب الدین ایبک کے لشکر کے ہمراہ ہندستان آئے، شمس الدین التمش جب بدایوں کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے حضرت دانیال قطری کو بلا کر بدایوں کا قاضی مقرر کیا، جب سے اب تک انقلابات زمانہ کے باوجود یہ خاندان یہیں آباد ہے، اور گزشتہ آٹھ سو سال سے دین وملت کی خدمت کر رہا ہے-

جہاں تک خانقاہ قادریہ کے تاریخی پس منظر کا سوال ہے تو عرض ہے کہ اس خاندان میں ابتدا ہی سے علم ظاہر کے ساتھ ساتھ تصوف وسلوک اور روحانیت کی طرف رجحان رہا، خود ہمارے مورث اعلیٰ قاضی دانیال قطری حضرت خواجہ عثمان ہارونی کے مرید وخلیفہ تھے، اسی طرح ہر دور میں اس خاندان کے افراد صوفیا واولیا کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہے اور دوسروں کو بھی فیض بخشتے رہے، تیرہویں صدی کے اوائل میں حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید قادری بدایونی مارہرہ مطہرہ حاضر ہوئے، شمس مارہرہ حضور آل احمد اچھے میاں مارہروی قدس سرہ کی خدمت میں رہے، سلوک کی منزلیں طے کیں، اور اجازت وخلافت سے نوازے گئے، حضور اچھے میاں قدس سرہ کی حیات مبارکہ تک حضرت عین الحق قدس سرہ مارہرہ شریف میں ہی رہے، ۱۲۳۵ھ میں حضور اچھے میاں قدس سرہ نے وصال فرمایا اس کے بعد حضرت شاہ عین الحق قدس سرہ بدایوں تشریف لائے اور مخلوق خدا کی اصلاح وہدایت اور تزکیہ وتصفیہ میں مصروف ہوگئے، گویا انھوں نے خانقاہ قادریہ بدایوں کی بنیاد رکھی، اس کے بعد سے یہ سلسلہ آج تک قائم ہے-

سوال:- آپ نے ابھی حضور اچھے میاں صاحب سے خلافت ملنے کا ذکر کیا، اس پر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مارہرہ اور بدایوں کے درمیان رشتے کیسے رہے ہیں؟ اور آج ان رشتوں کی کیا نوعیت ہے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- مارہرہ اور بدایوں کے درمیان رشتے پہلے دن سے

لے کر آج تک ویسے ہی ہیں جیسے ایک خادم اور مخدوم کے درمیان ہونا چاہیے، میں نے ابھی عرض کیا کہ حضرت شاہ عین الحق بیعت ہونے کے بعد مارہرہ شریف ہی میں رہے، وہاں پر صاحبزادگان کی تعلیم وتربیت آپ کے سپرد کی گئی، آپ نے یہ خدمت انجام دی، جب شمس مارہرہ کے وصال کے بعد آپ مستقل بدایوں آگئے تو صاحبزادگان کا حصول علم کے لیے بدایوں آنا شروع ہوگیا، حضور خاتم الاکابر سیدنا شاہ آل رسول احمدی مارہروی، اور حضرت سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری سمیت کم از کم ۱۵ شہزادگان کے نام پیش کیے جا سکتے ہیں جن کی تعلیم وتربیت کرنے کا اعزاز بدایوں والوں کو حاصل ہوا، اس کے علاوہ حضرت خاتم الاکابر نے اپنے دونوں صاحبزادگان حضرت سید شاہ ظہور حسین اور حضرت سید شاہ ظہور حسن کو با اصرار حضرت شاہ عین الحق سے اجازت وخلافت دلوائی، حضرت نوری میاں قدس سرہ حضرت تاج الفحول کی محبت کو سنیت کی علامت فرماتے تھے، یہ سب مخدومانہ کرم فرمائیاں ہیں، تاریخ کے اس لمبے سفر میں کچھ نازک موڑ بھی آئے، لیکن بدایوں نے اپنی خادمانہ حیثیت کبھی فراموش نہیں کی اور آج بھی ہم فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ سب مارہرہ مطہرہ کا فیض ہے-

سوال:- مدرسہ قادریہ کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟ اس ادارے نے اہل سنت کو کس طرح کے افاضل دیے ہیں؟ اور آج یہ تاریخی ادارہ کس حال میں ہے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- قاضی دانیال قطری کے صاحبزادے قاضی رکن الدین نے بدایوں میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، اس کے بعد یہ سلسلہ مختلف ناموں سے چلتا رہا، اور ہمارے خاندان کے افراد اپنے اپنے زمانے میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں بحرالعلوم حضرت مولانا محمد علی عثمانی بدایونی کے درس کا شہرہ ہوا، آپ کی درسگاہ مدرسہ محمدیہ کے نام سے موسوم ہوئی، تیرہویں صدی کی تیسری دہائی میں حضرت سیف اللہ المسلول مولانا فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے خاندانی دستور کے مطابق درس وتدریس کا آغاز کیا تو مدرسہ محمدیہ کا نام ''مدرسہ قادریہ'' رکھ دیا گیا، اس طرح اب مدرسہ قادریہ اپنے قیام کے دو سو سال مکمل کرنے جا رہا

ہے، پہلے معمول تھا کہ خاندان کے بزرگ ہی مدرسہ قادریہ میں درس دیا کرتے تھے، یہ سلسلہ حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی قدس سرہ کے ابتدائی عہد تک جاری رہا، جب مفتی اعظم عدالت عالیہ کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد میں حضرت کا تقرر ہوا تو آپ مستقل طور پر حیدرآباد میں قیام پذیر ہوگئے، مدرسہ کے لیے آپ نے چند مدرسین کا تقرر کردیا، حضرت کے وصال کے بعد بھی مدرسہ کسی نہ کسی صورت میں چلتا رہا، مدوجزر کہاں نہیں آتے، لیکن رب مقتدر کا شکر واحسان ہے کہ اب پھر مدرسہ قادریہ تیزی سے ترقی کی طرف گامزن ہے، میرے دونوں بیٹے عزیزی اسیدالحق قادری اور محمد عطیف قادری اپنے اسلاف کی سنت کو زندہ کرتے ہوئے مدرسہ قادریہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان بچوں کی صلاحیتیں اور جذبہ دیکھ کر روشن مستقبل کی امید ہو چلی ہے۔

اس سوال کا جواب کہ ''اس مدرسہ نے اہل سنت کو کس قسم کے افاضل دیے ہیں''، ذرا تفصیل چاہتا ہے، مختصراً آپ اتنا سمجھ لیں کہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ۱۲۶۰ھ سے لے کر ۱۳۲۰ھ تک حق و باطل کے درمیان جو قلمی جنگ ہوئی ہے اس میں آپ کو مدرسہ قادریہ کے فاضلین اور ان کے تلامذہ اور فیض یافتہ ہی صف اول میں نظر آئیں گے۔

سوال:- قطع کلام پر معذرت چاہتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ ابھی آپ نے حق و باطل کی کشمکش کا ذکر کیا، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہابی تحریک کے خلاف خاندان عثمانیہ اور مدرسہ قادریہ کی کیا خدمات ہیں؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- شاہ اسماعیل دہلوی نے جب اہل سنت کے مسلک سے انحراف کرتے ہوئے بدعقیدگی پھیلانا شروع کی، اور تقویت الایمان کے ذریعہ کتاب التوحید کے غلط عقائد رائج کرنے کے درپے ہوئے، تو بالکل ابتدا میں تقویت الایمان کا رد کرنے والوں میں حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید قادری بدایونی کا نام ملتا ہے آپ نے تقویت الایمان کے رد میں مستقل رسالہ تصنیف فرمایا جو غیر مطبوعہ ہے اور کتب خانہ قادریہ میں موجود ہے، اس کے بعد آپ کے صاحبزادے سیف اللہ المسلول مولانا فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے تو اس محاذ کی قیادت فرمائی، المعتقد المنتقد، سیف الجبار، بوارق

محمدیہ، فصل الخطاب، حرز معظم، فوز المؤمنین، احقاق حق، تلخیص الحق، تصحیح المسائل، وغیرہ کتب و رسائل تصنیف فرما کر حق و باطل میں خط امتیاز کھینچ دیا، بعد کے سارے معرکے انہیں کے بنائے ہوئے خطوط پر سر کیے گئے، اس کے بعد حضرت کے صاحبزادوں حضرت مولانا محی الدین قادری اور تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی اور ان کے تلامذہ نے محاذ کی کمان سنبھالی اور احقاق حق کا حق ادا کردیا۔

مدرسہ قادریہ کے فضلا نے تحریک وہابیہ کے رد میں جو قلمی جہاد کیا ہے اس کی تفصیل طوالع الانوار اور اکمل التاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے گزشتہ دو سال سے ایک منظم منصوبے کے تحت اکابر خانوادۂ قادریہ کی کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے، اس سلسلہ میں وہ ساری کتابیں دوبارہ جدید انداز میں شائع کی جارہی ہیں جو ہمارے اکابر نے بدعقیدوں کے رد میں تصنیف فرمائی تھیں، ان کتابوں کی جدید اشاعت وقت کی ضرورت تو ہے ہی ساتھ میں اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ مدرسہ قادریہ نہ صرف یہ کہ آج بھی اپنے اسلاف واکابر کی روش پر قائم ہے بلکہ منکرین عظمت رسالت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں آج بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

سوال:- کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ ایک طبقے نے دانستہ طور پر بدایوں اور اہل بدایوں کی خدمات کو نظر انداز کیا، اور ان کو تاریخ میں وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- اس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا، اپنے اسلاف کی خدمات کو منظر عام پر لانے کے لیے ہم سے جو کچھ ہوسکتا ہے ہم کر رہے ہیں، باقی کسی دوسرے سے نہ کوئی توقع وابستہ کی ہے اور نہ ہی کوئی شکایت ہے۔

سوال:- خود آپ کی شخصیت کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا گیا، اور بعض فروعی مسائل کی بنیاد پر بدایوں کو جماعتی دھارے سے کاٹ کر رکھ دیا گیا، اس پر کیا کہیں گے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- اس پر وہی کہنا چاہوں گا جو میرے اسلاف کا طریقہ رہا ہے کہ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ اس بارے میں بھی مجھے کسی سے کوئی شکایت

نہیں ہے:

از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

ما قصہٴ سکندر و دارانخواندیم

سوال:-موجودہ حالات میں تمام خانقاہوں اورسنی مراکز کا اتحاد کتنا ضروری ہے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:- بے حد ضروری ہے،اور وقت کا اہم تقاضا ہے،مگر یہ خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جب اتحاد بنام اہل سنت ہو-

سوال :-آپ کی عہد سجادگی کے پچاس سال مکمل ہو رہے ہیں،ان پچاس برسوں میں خانقاہ قادریہ نے کیا خدمات انجام دیں؟اورآپ کے عہد سجادگی میں خانقاہ کی توسیع واستحکام کا کتنا کام ہوا؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:-گزشتہ پچاس برسوں سے خانقاہ قادریہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دے رہا ہوں،اس عرصے میں اہل سلسلہ کی تعلیم واصلاح کے علاوہ دین وسنیت کے فروغ واشاعت،اور خانقاہ کی تعمیر وترقی کے لیے جو کچھ ضروری سمجھا گیا وہ حسب صلاحیت اور وسائل کیا گیا-

خانقاہ اور درگاہ میں حسب ضرورت نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں،درگاہ قادریہ کے بالمقابل عظیم الشان مہمان خانے کی عمارت تعمیر ہوئی،بغداد شریف میں درگاہ غوث اعظم کے بالمقابل جو مہمان خانہ ہے اس کا نام ''دیوان خانہ'' ہے،ہم نے اسی مناسبت سے اس عمارت کا نام بھی ''دیوان خانہ'' رکھا ہے،کتب خانۂ قادریہ کے لیے بھی نئی عمارت تعمیر کی گئی،اور چند سال پہلے کتب خانے کی تزئین وتجدید کا کام بھی مکمل ہوا،یہ تاریخی کتب خانہ ہے جس میں ہزاروں قدیم مطبوعات کے علاوہ تقریباً ایک ہزار نادر ونایاب قلمی نسخے ہیں،مدرسہ قادریہ کے لیے بھی جدید عمارت تعمیر کی گئی،مدرسے کی نشاۃ ثانیہ کی گئی اب پھر درس وتدریس کا سلسلہ پوری آب وتاب کے ساتھ جاری ہے اور مزید ترقی کے لیے کئی منصوبے زیر غور ہیں،مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ''تقویہ اسلامیہ گرلز انٹر کالج بدایوں'' قائم کیا گیا،جو آج بدایوں ضلع کے چند معیاری کالجوں میں سے ایک ہے،بدایوں

کی مرکزی عمارت ''گھنٹہ گھر'' جو مولانا عبدالماجد بدایونی کی یادگار ہے اس میں عوام کے لیے ''مولانا عبدالماجد بدایونی پبلک لائبریری'' کا قیام کیا گیا،اکابر بدایوں کی تصنیفات کی اشاعت کے لیے پہلے ادارہ مظہر حق قائم کیا گیا تھا،جس نے اشاعتی خدمات انجام دیں،پھر اس کا نام بدل کر تاج الفحول اکیڈمی کر دیا گیا جو بحمدہ تعالیٰ اشاعتی میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے،ملت کے نوجوانوں کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے الازہر انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لایا گیا،جو فی الحال دیوان خانے کی عمارت میں چل رہا ہے اس کے لیے الگ سے زمین حاصل کر لی گئی ہے،جلد ہی تعمیر شروع ہونے والی ہے ،اس میں فی الحال تین کورس چل رہے ہیں،M.B.A. B.B.A. B.C.A کوشش کی جارہی ہے کہ اگلے سال سے (.B.Sc(I.T اور B.Ed کی کلاسز بھی شروع ہو جائیں-

اسی طرح خانقاہ قادریہ کے زیر انتظام اور بھی کئی ادارے مختلف میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں،جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں ہے-یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ تعمیر وترقی میرے بس کی بات نہیں تھی اگر میرے عزیز حافظ عبدالقیوم قادری سلمہ ناظم اعلیٰ مدرسہ قادریہ اور منتظم خانقاہ قادریہ یہ ذمہ داریاں اپنے سر نہ لیتے -**جزاہ اللہ تعالیٰ**

سوال:-عام طور پر خانقاہی شہزادے علم وعمل سے دور ہوتے جارہے ہیں،لیکن خانقاہ قادریہ بدایوں اس سے مستثنیٰ ہے،اس خانقاہ میں مولانا اسید الحق قادری جیسا عالم ومحقق ہے،مولانا عطیف قادری جیسا باصلاحت عالم اور خطیب ہے اور تیسرے صاحبزادے مولانا محمد عزام قادری بھی علم وفکر کے منازل طے کر رہے ہیں،ان سے بھی جماعت کو توقعات ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ کی تعلیم وتربیت کا وہ کون سا انداز تھا کہ جس نے آپ کے صاحبزادوں کو اس مقام تک پہنچایا ،اگر اسے جام نور کے قارئین کے ساتھ Share کریں تو یہ بات دوسرے ارباب خانقاہ کے لیے اپنے شہزادوں کی تربیت میں معاون ہوگی؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:-پہلی بات تو یہ ہے کہ:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دوسرے یہ کہ میں نے ان کو ہمیشہ یہی تاکید کی کہ دوران تعلیم خود کو کبھی پیرزادہ اور صاحبزادہ نہ سمجھیں، اساتذہ کی جوتیاں سیدھی کریں اور پوری محنت سے تعلیم حاصل کریں ،خدا کا شکر ہے کہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، اور ان شاء اللہ یہ اپنے اسلاف کا نام روشن کریں گے بلکہ کر رہے ہیں۔

سوال :۔آج جب کہ آپ کے تینوں صاحبزادوں نے علم وبصیرت کی آنکھیں کھول لی ہیں، ان کے ساتھ خانقاہ قادریہ کا مستقبل کا منصوبہ کیا ہے؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:۔کسی نے کہا ہے:

کیے تھے کام کچھ ہم نے بھی جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ باتیں جب کی ہیں باقی تھا جب عہد شباب اپنا
جو سچ پوچھو تو اب ساری امیدیں بس تمھیں سے ہیں
جواں ہو تم لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

مجھے امید ہے کہ یہ بچے کامیاب منصوبہ بندی کریں گے، بزرگوں کی ارواح کو خوش کریں گے، میری دعائیں ہر وقت ان کے ساتھ ہیں۔

سوال:۔ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری:۔ جام نور واقعی ملت کا ترجمان ہے، یعنی اسم بامسمیٰ ہے ،آپ نے اپنے محترم دادا کی یاد تازہ کردی ہے، رب مقتدر آپ کے حوصلوں کو جوان رکھے، آپ سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ:

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

رہا سوال قارئین کا، تو میں بھی ایک قاری ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کا مطالعہ ملّت کے لیے، ملّی معاملات میں ذہنی تناؤ سے چھٹکارے اور صحیح رائے قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔□□□

(شمارہ فروری ۲۰۱۰ء)

مولانا عبدالمبین نعمانی

بانی رکن ''المجمع الاسلامی'' مبارک پور و مہتمم دارالعلوم قادریہ، چریا کوٹ، مئو (یوپی)

مولانا عبدالمبین نعمانی کا شمار برصغیر کی عظیم درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے قابل فخر فرزندوں میں ہوتا ہے۔ موصوف ایک پختہ قلم کار، باصلاحیت مدرس، کامیاب مبلغ اور ایک اچھے مذہبی صحافی کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ مسلکی و جماعتی اصلاحات کا جذبہ، امانت داری، تقویٰ اور پرہیز گاری آپ کے نمایاں اوصاف ہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ ایک عرصے تک الجامعۃ الاشرفیہ میں بحیثیت استاذ اور اس کے ترجمان ''ماہنامہ اشرفیہ'' کے مدیر اعلیٰ رہے۔ آپ نے اپنے احباب مولانا محمد احمد مصباحی، مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مولانا افتخار احمد مصباحی کے ساتھ مشترکہ جدو جہد اور نجی وسائل سے اہل سنت کی گراں قدر کتابوں کی اشاعت اور ریسرچ کے لیے ''المجمع الاسلامی'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی جو آج مبارک پور اعظم گڑھ میں اپنی مستقل عمارت کے ساتھ علماے اہل سنت کی پچاسوں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ آپ نے چریا کوٹ ضلع مئو میں بھی ایک دینی درس گاہ بنام دارالعلوم قادریہ قائم کیا ہے جو ترقی پذیر ہے۔ اب تک آپ کے لاتعداد فکر انگیز مضامین اور اصلاح معاشرہ پر مبنی کئی چھوٹی بڑی تصانیف منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہیں، جن میں ''عورت اور ہمارا معاشرہ''، ''معاشرے کی چند خرابیاں'' اور ''لوٹری و شراب کی برائیاں'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ ایک پیر طریقت اور مصلح قوم ملت کے طور پر بھی متعارف ہیں۔ نوجوان علما کی علمی و قلمی تربیت اور حوصلہ افزائی بھی برابر کرتے رہے ہیں۔ دعوت واصلاح کی عالم گیر تحریک ''دعوت اسلامی'' کے حامی ومبلغ کے طور پر بھی آپ کو جانا جاتا ہے۔ المختصر آپ ایک تعمیری فکر اور اصلاحی مزاج شخصیت کے مالک ہیں۔

سوال :- جماعت اہل سنت تحریری وتصنیفی حیثیت سے آج کس مقام پر کھڑی ہے اوراس کا تحریری مستقبل کیا ہے؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- تحریری وتصنیفی لحاظ سے جماعت اہل سنت کا حال، ماضی قریب کے مقابلہ میں بہتر ہے اور مستقبل میں مزید بہتری کی توقع ہے- پہلے کے مقابلے میں اس وقت لکھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے جو یقیناً خوش آیند ہے، لیکن یہ ترقی بھی ماضی کے اہل قلم اکابر کی ہی رہین منت ہے، تاجدار علم وحکمت شہنشاہ قلم امام احمد رضا قدس سرہ العزیز کے بعد صدر الشریعہ اعظمی، حضرت صدر الافاضل مرادآبادی، سرکار مفتی اعظم ہند نوری بریلوی، حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی اشرفی، مفتی سید محمد افضل مونگیری، صدر العلما سید غلام جیلانی میرٹھی، شمس العلما قاضی شمس الدین جونپوری، استاذ العلما حضور حافظ ملت مرادآبادی، شیخ الحدیث علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، پاسبان ملت مولانا مشتاق احمد نظامی الٰہ آبادی، مولانا ابو النور محمد بشیر کوٹلوی، رئیس التحریر والقلم علامہ ارشد القادری بلیاوی، شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی گھوسوی، فقیہ ملت مفتی جلال الدین احمد امجدی، بدرملت مولانا بدرالدین احمد گورکھپوری، علیہم الرحمۃ والرضوان کی تصنیفی خدمات کو ہرگز بھلایا نہیں جاسکتا، آج انہیں اکابر کا فیضان ہے کہ ہمیں قلم پکڑنا آ گیا اور آج ہم انہیں اکابر کی تصانیف کے سہارے جی رہے ہیں-

سوال:- دعوت اسلامی جیسی عالمی تنظیم سے آپ بھی بحیثیت مبلغ وابستہ ہیں، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سنیت اور اسلام کی اشاعت میں وہ کتنی کامیاب رہی ہے؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- تحریک دعوت اسلامی یقیناً اہل سنت و جماعت کی ایک عالمی تنظیم ہے، جس کی تبلیغ ودعوت کا دائرہ تقریباً دنیا کے ساٹھ ملکوں تک پھیلا ہوا ہے، جس سے کئی کروڑ سنی مسلمان وابستہ ہیں اور لاکھوں مسلمان گناہوں سے تائب ہو کر سنت و شریعت کے پابند ہو چکے ہیں، کتنی ویران مسجدیں دعوت اسلامی کے صدقے میں آباد ہو چکی ہیں، کتنے وہ مسلمان جو ٹوپی بھی پہننا گوارہ نہیں کرتے تھے آج اپنے سروں کو عماموں سے

سجائے ہوئے ہیں، اور کتنے محلوق اللحیہ باریش ہو کر سنت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں- آج کے ایک بڑے پیر صاحب نے دعوت اسلامی کے مثبت اثرات سے متاثر ہو کر فرمایا-'' میں کیا میرے والد گرامی بھی جن مریدوں کو ٹوپی نہ اڑھا سکے آج مولانا الیاس قادری کی دعوت اسلامی نے ان کے سروں کو عماموں سے سجا دیا ہے-'' شارح بخاری حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ نے خود اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ، کراچی کے فیضان مدینہ مرکز دعوت اسلامی میں ہفتہ واری اجتماع میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ ہمارے یہاں بڑی بڑی کانفرنسوں میں نہیں ہوتی اور بڑے بڑے سیٹھ جو کسی بڑے سے بڑے جلسے میں بھی جانے کا وقت نہیں نکالتے وہ ہفتہ واری اجتماع میں سڑکوں پر رو رو کر دعائیں مانگتے نظر آتے ہیں، دینی اجتماعات میں شرکت کا یہ شوق اور اپنے گناہوں سے رو رو کر توبہ کرنے کا یہ جذبہ صرف دعوت اسلامی کی دین ہے- جسے میں بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں اور یقیناً یہ کامیابی صرف اسلام وسنت کی ہے اور دین وشریعت کی-

سوال :- کچھ سالوں سے اس تنظیم کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ یہ سنیت سے منحرف ہو کر وہابیت کی جانب جارہی ہے، جس پر باقاعدہ کچھ مفتیان کرام اور علما نے فتاوے صادر کیے، اس کے خلاف کتابچے اور پوسٹر شائع نکالے گئے اور اس سے دور رہنے کی تلقین کی گئی، آخر سچائی کیا ہے؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- میں نے دعوت اسلامی کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اس کے ذمہ داروں سے بھی ملاقاتیں کی ہیں، اور خود امیر دعوت اسلامی مولانا محمد الیاس عطا رقادری سے بھی کئی بار ملا ہوں، میں نے ان کی تقریر یا نجی گفتگو میں یا ان کے کسی لٹریچر میں مسلک اہل سنت و جماعت کے خلاف کوئی بات نہیں دیکھی اور مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کو جھوٹا اور غلط پایا، حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب رضوی سینئر مفتی دارالافتاء الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور نے چند سال پیشتر حج و زیارت سے واپسی پر اپنا واقع بیان کیا کہ میں حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے پاس بیٹھا تھا، گفتگو ہو رہی تھی، مجھ سے شرعی مسائل پوچھے جارہے تھے کہ اتنے میں ایک صاحب نے پوچھا، وہابیوں کے پیچھے نماز

پڑھنا کیسا ہے، میں نے کہا کہ اس کا جواب حضرت مولانا (محمد الیاس قادری) دیں گے، اس پر انھوں نے فرمایا: وہابیوں کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں، ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، اس بات کو مفتی صاحب نے متعدد مجالس میں بیان فرمایا ہے اور آج بھی ان سے اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے- ان کا مطبوعہ بیان موجود ہے کہ ''میں حسام الحرمین شریف کی تصدیق کرتا ہوں اور جن جن گستاخان رسول کو سرکار اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کافر ہونے کا فتویٰ دیا ہے میں بھی ان کو کافر سمجھتا ہوں-'' آپ نے یہ بھی فرمایا بلکہ تحریر شائع کی کہ ''علمائے کرام بد مذہبوں کا رد کریں جنھیں اس فن میں مہارت ہو، عام مبلغین کو رد کی اجازت نہیں دی جاتی وہ صرف فضائل بیان کریں اور وہ مسائل جو اچھی طرح یاد ہوں یا کتابیں دیکھ کر بیان کریں بلکہ اسی کو ترجیح ہے-''

میرا خیال ہے کہ یہ موقف ان کا بالکل صحیح ہے، اس کو بنیاد بنا کر ان کے اوپر کوئی فتویٰ لگانا درست نہیں- اس سلسلے میں جو حضرات بدگمان ہیں ان کو اپنی بدگمانی دور کر لینی چاہیے، اور دیکھئے فتوے کا معاملہ ہے کہ سائل جیسا بیان دے گا مفتی ویسا ہی حکم دے گا- میں نے دیکھا کہ بہت سی باتیں بے بنیاد دعوت اسلامی کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں پھر ان پر فتاوے حاصل کر کے شائع کیے جاتے ہیں، میرے پاس اس کے کئی شواہد موجود ہیں- ابھی حال ہی میں مولانا محمد الیاس قادری کے نام ایک فرضی خط بنا کر فتویٰ حاصل کیا گیا، جب مولانا سے رجوع کیا گیا تو فرمایا نہ میں نے ایسی کوئی تحریر دی ہے نہ زبانی بیان دیا ہے- اس فرضی خط کی پوری داستان اور اس پر مرکزی دارالافتاء بریلی شریف کا شرعی حکم شائع ہو چکا ہے جس پر کئی ایک دیگر علما کی تصدیقات بھی ہیں، جسے مولانا مفتی محمد خوشنود عالم احسانی قادری برکاتی رضوی استاذ دارالعلوم غریب نواز مرزا غالب روڈ، الہ آباد (یوپی) نے شائع کر دیا ہے، موصوف نے دو اور کتابیں شائع کی ہیں، جن کے نام یہ ہیں ''دعوت اسلامی سے محبت کیوں؟'' ''اور دعوت اسلامی اکابر علمائے اہل سنت کی نظر میں'' جن کو تفصیل درکار ہو وہ مذکورہ بالا کتابیں مطالعہ میں لائیں-

میں نے دیکھا کہ اکثر علمائے کرام جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے مخالفت کرتے تھے جب

ان کو حقائق سے آگاہ کیا گیا تو مطمئن ہو گئے اور اب بھی جو مخالف ہوں گے اس کی وجہ یہی ہوگی کہ ان کو حقائق سے آگاہی نہ ہوئی ہوگی، غلط فہمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بعض لوگ مناظرہ، فتویٰ اور دعوت و تبلیغ سب کو یکساں سمجھتے ہیں جب کہ ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے، ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ آدمی ہوتے ہیں- نہ ہر آدمی مناظرہ کر سکتا ہے نہ ہر عالم فتویٰ دے سکتا ہے نہ ہی دعوت و تبلیغ سب کے بس کی بات ہے- اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے رجال پیدا کیے ہیں، دعوت اسلامی کے بانیوں میں قائد اہل سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ ہیں، اس کے طریقہ کار کو طے کرنے والے بھی علامہ ہی ہیں، حتی کہ اس کی اصطلاحات بھی علامہ ہی کی وضع کردہ ہیں- ایک وقت وہ بھی آیا کہ حضرت علامہ ہی کو لوگوں نے غلط فہمی میں ڈال دیا تھا، لیکن جب ان کے سامنے حقائق رکھے گئے تو فوراً انھیں بات سمجھ میں آ گئی پھر وہ کھل کر دعوت اسلامی کی تائید کرنے لگے- اس کی تائید کے سلسلے میں جو خط علامہ نے میرے نام تحریر کیا ہے وہ رسائل اور کتابوں میں بارہا چھپ چکا ہے، مولانا خوشنود عالم صاحب کی کتاب میں بھی وہ خط موجود ہے، انتقال سے کچھ پہلے سید پورہ بلیا (اپنے گاؤں) جاتے ہوئے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب نے خود مجھ سے فرمایا کہ ''ایک الیاس قادری نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا-'' اور فرمایا کہ ''باضابطہ مرکز قائم کرو اور قوم کی تربیت کا انتظام کرو، صرف دورہ کرنے سے کام نہیں چلنے والا ہے- اصلاح کے لیے ایک جگہ بیٹھنا ہوگا- اس سلسلے میں میری کوئی ضرورت ہو تو میں تیار ہوں''-

حضرت شارح بخاری مولانا مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ سے شروع شروع میں جب میں نے دعوت اسلامی کی بات کی تو حضرت ناراض ہو کر فرمانے لگے ''چپ رہیے مولانا! آپ نہیں جانتے'' -واقعی میں اس وقت چپ ہو رہا اور اس وقت میں زیادہ معلومات بھی نہیں رکھتا تھا، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد جب حضرت شارح بخاری علیہ الرحمہ نے اطمینان کر لیا تو حاجی نگر کلکتہ کے اجتماع میں خود تشریف لے گئے اور میرے سامنے فرمایا ''جی میں تو آتا ہے کہ دارالافتاء کو چھوڑ دوں، اب دعوت اسلامی ہی کا ہو کر رہ جاؤں، مگر پھر سوچتا ہوں کہ دارالافتاء کون سنبھالے گا؟'' -مولانا مفتی محمد نسیم صاحب مصباحی اور

ماسٹر فیاض احمد صاحب اس کے گواہ ہیں اور بھی کچھ حضرات تھے جن کے نام یاد نہیں، پھر یہ
بات حضرت نے اور بھی مواقع پر ارشاد فرمائی - محدث کبیر حضرت علامہ ضیا المصطفیٰ قادری
شہزادہ صدر الشریعہ نے بار ہا ارشاد فرمایا ''میں دعوت اسلامی کو سنی تحریک سمجھتا ہوں، الیاس
قادری کو سنی ہی کہتا ہوں بلکہ ممبئی میں جب بعض لوگوں نے ان کے خلاف فتویٰ لگانا چاہا تو
میں نے ہی روکا کہ ان پر فتویٰ لگانا اور ان کو غیر سنی قرار دینا درست نہیں -'' ہاں! حضرت کا
بعض طریقہ کار کے سلسلے میں اختلاف ہے، لیکن یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں اس لیے دعوت
اسلامی کی تائید میں ایک فتوے پر حضرت محدث کبیر نے تصدیق بھی فرمائی ہے جو کتابچے
میں چھپ چکی ہے اور تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں ازہری قادری
(جانشین مفتی اعظم ہند) نے بار ہا ارشاد فرمایا کہ ''میں الیاس قادری کو رات کے اندھیرے
میں سنی کہتا ہوں'' - یہ بات حضرت نے میرے سامنے ارشاد فرمائی اور بھی متعدد بار کئی
مقامات پر ارشاد فرمائی، لہٰذا طریقہ کار کا تو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن سنیت سے انحراف کا حکم
لگانا بڑی جرأت اور جسارت کی بات ہے، یہ کوئی ذمہ دار اور دیندار آدمی نہیں کرسکتا، جو دین
و حیا سے گزر جائے گا وہی ایسی حرکت کرسکتا ہے، ایسا کرنے والا معاندین اہل سنت کا در
پردہ ایجنٹ ہوگا -

سوال:- دعوت اسلامی کے امیر مولانا الیاس عطار قادری صاحب کے خلاف لوگ
یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ عالم دین نہیں، علما کو اہمیت نہیں دیتے اور ان کے اندر تصنع زیادہ ہے،
اس لیے ایسے شخص کی قیادت قبول نہیں کرنی چاہیے - اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا عبد المبین نعمانی:- جہاں تک معروف معنی میں عالم دین ہونے کا سوال ہے
یعنی درس نظامیہ کی تکمیل اور سند کی تحصیل تو مجھے اس سلسلے میں کوئی قطعی علم نہیں، لیکن یہ ضرور
ہے کہ بہت سے درس نظامی کی تکمیل کرنے اور سند حاصل کرنے والوں سے ان کا علم بڑھا
ہوا ہے، ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے، مسائل پر بھی بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، علمائے کرام سے
برابر استصواب بھی کرتے رہتے ہیں جو سنت انہیں معلوم ہوجاتی ہے اور شریعت کا جو بھی
مسئلہ ان کے علم میں آجاتا ہے ان پر وہ سختی سے عمل کرتے ہیں اور اپنے متعلقین کو بھی عمل کی

تلقین کرتے ہیں - اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے درس و سند کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے فتاویٰ
رضویہ جلد دہم کو دیکھا جاسکتا ہے اس میں تفصیل موجود ہے - آج بہت سے بے سند اور بے
پڑھے عالم بنے پھرتے ہیں، ان کو علما میں شمار کیا جاتا ہے، علامہ لکھا اور کہا جاتا ہے جو محض
اپنی چرب زبانی کی وجہ سے مقبول ہیں، ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتا کہ وہ عالم نہیں
اور کتنے تو سند یافتہ ہوکر بھی محض جاہل ہیں، ان کو بھی کوئی جاہل کہنے کی جرأت نہیں کرتا، پھر
مولانا محمد الیاس قادری جو اپنے علم و عمل تقویٰ اور جدوجہد کی بنیاد پر عالمی پیمانے کا دینی کام
کررہے ہیں جس کے نتائج بھی سامنے ہیں، ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا تو صاف بتارہا
ہے کہ یہ کسی سازش کا شاخسانہ ہے تاکہ اہل سنت و جماعت کی ابھرتی ہوئی یہ تحریک دب
جائے اور بدعقیدوں کو مزید کھیل کھیلنے کا موقع ملے - ہاں! اتنا ضرور کہوں گا کہ مولانا محمد
الیاس قادری بھی انسان ہیں، معصوم نہیں، غلطیاں ان سے بھی ہوسکتی ہیں، افہام و تفہیم سے
مسائل حل بھی کیے جاسکتے ہیں، مگر ہر چھوٹی بڑی غلطی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنا اور دینی تحریک کو
نقصان پہنچانا تو کسی طرح قرین قیاس نہیں - مولانا نے مجھ سے خود فرمایا اکابر اہل سنت و
مفتیان کرام میری اصلاح کے لیے جو فرمائیں گے میں اس پر عمل کروں گا - مزید فرمایا آپ
فیضان سنت کو دیکھ ڈالیں اگر مجھ سے کہیں لغزش واقع ہوئی ہو تو مطلع کریں، میں اس کی
اصلاح کی کوشش کروں گا -

جہاں تک یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ علما کو اہمیت نہیں دیتے یہ بات میری سمجھ میں نہیں
آتی - میں نے علمائے کرام کو دیکھا کہ جب وہ ان کے پاس جاتے یا ان سے ملاقات ہوتی
تو غایت درجہ تعظیم کرتے ہیں اٹھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، بعض اپنی عمر سے کم عمر والے علما کا
بھی ہاتھ چومتے ہیں ہاں بہت سے علما سے اچانک ملاقات ہوجاتی ہے اور وہ نہیں جان
پاتے یہ کون عالم ہیں تو ہوسکتا ہے تعظیم و احترام میں کوتاہی ہوجاتی ہے اور ایک عالمی پیمانے
کے آدمی سے ایسی چوک لازمی ہے کیوں کہ سب کا جاننا پہچاننا آسان کام نہیں، ہم جیسے
معمولی لوگوں سے بھی ایسی چوک ہوجایا کرتی ہے، یہی حال تصنع کے الزام کا ہے کہ جو کوئی
بہت بڑی تحریک کو لے کر چل رہا ہے جس کے ہزاروں دشمن بھی ہیں، لمحہ لمحہ جس کا مصروف

ہے تو وہ بہت آسانی سے سب کو نہیں مل جائے گا اس کے لیے اپنے کورس زور رکھنا بھی اس کی اپنی مجبوری ہے اس کو اگر کوئی تصنع کہتا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ صحیح ہے پھر ہر آدمی ہر کسی کے معیار پر تو اتر نہیں سکتا لہٰذا جس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوئی اس نے جھٹ ریا کاری یا تصنع کا حکم لگا دیا یہ طریقہ تو نظر ثانی کا مستحق ہے نہ کہ تشہیر کا-

سوال :-سنی دعوت اسلامی کی دعوت اسلامی سے علیحدگی کی بنیادیں کیا ہیں- کیا یہ صحیح ہے، اور کیا آپ سنی دعوت اسلامی کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- دعوت اسلامی سے سنی دعوت اسلامی کی علیحدگی میرے سامنے نہیں ہوئی اس کی کیا بنیادیں ہیں میں صحیح طور سے بیان کرنے سے قاصر ہوں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی غلط فہمیوں کو زیادہ دخل ہے- میں نے تحریری اور زبانی طور پر مولانا شاکر القادری سے اس سلسلے میں بات کی کہ یہ اختلاف دور ہو جائے مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا، مولانا قمر الزماں اعظمی سے بھی میں نے گذارش کی، بالآخر میں نے یہ کہا اور تجویز رکھی کہ جہاں ان دونوں تحریکوں میں کوئی ایک تحریک کام کر رہی ہو وہاں دوسری تحریک اپنی سرگرمیاں شروع نہ کرے تاکہ کسی قسم کے تصادم کی نوبت نہ آئے، خدا کرے دونوں تحریکیں اس پر عمل پیرا ہو کر اور اپنے اپنے طور پر دین وسنیت کا کام کریں، میں اس اختلاف کے سلسلے میں بہت زیادہ رنجیدہ اور فکر مند ہوں بعض باتیں جو سامنے کی ہیں وہ بھی کہنا پسند نہیں کرتا کہ کہیں خلیج اور وسیع نہ ہو جائے، میں تو کام کا آدمی ہوں کام ہی پسند کرتا ہوں اور ہر کام کرنے والے کے لیے دعا گو بھی ہوں-

جہاں تک سنی دعوت اسلامی کی کارکردگی سے میرے مطمئن ہونے کا سوال ہے تو میں عرض کروں گا کہ اس کا جواب تو امیر سنی دعوت اسلامی ہی بہتر دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی جماعت کی کارکردگی سے واقف ہیں- میرے پاس نہ تو معلومات زیادہ ہے نہ ہی قریب سے ان کی کارکردگی کو ملاحظہ کرنے کا موقع ملا ہے-

سوال:- حال ہی میں اپنے ادارہ المجمع الاسلامی کے ذریعہ وظائف کے ساتھ صحافتی و تصنیفی ٹریننگ کورس کا اعلان کیا ہے اس کا طلبۂ مدارس پر کتنا مثبت اثر پڑا ہے اور اس

پیش قدمی سے آپ کتنے پر امید ہیں؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- اس اعلان سے طلبہ وعلما پر اثر تو پڑا ہے مگر امید سے بہت کم، البتہ ہم پر امید ضرور ہیں جس کا صحیح اندازہ سال آئندہ نشست میں بیٹھنے والے طلبہ سے ہی ہوگا- ہمارے اساتذہ کرام اگر طلبہ میں تحریری صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور تحریک وترغیب سے بھی کام لیتے رہیں تو مستقبل میں ہمیں اچھے اہل قلم بہ آسانی فراہم ہو سکتے ہیں، الحمد للہ بعض مدارس بالخصوص الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں تحریری سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں طلبہ کا ذوق بیدار ہو رہا ہے جو خوش آئند مستقبل کا غماز ہے-

سوال :-اس کورس میں تصنیف کی ٹریننگ تو سمجھ میں آتی ہے، مگر صحافت کی ٹریننگ کون دے گا؟ ہمارے مذہبی اداروں میں صحافت کا کوئی کورس نہیں ہے اور آپ کے اس کورس میں ٹریننگ دینے والا ہمارا کوئی عالم ہی ہوگا جسے صحافت میں (جہاں تک میں جانتا ہوں) Editing, Writing, Reporting اور Press laws سے متعلق کسی طرح کی معلومات نہیں، ایسے میں کیا یہ اعلان بے معنیٰ نظر نہیں آتا؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- میں نے اپنے کسی اعلان میں باضابطہ صحافتی کورس کے اجراء کی بات ہی نہیں کی ہے کہ مجھ سے یہ سوال ہو کہ صحافت کی ٹریننگ کون دے گا- ہاں اتنا ضرور ہے کہ تصنیف اور مضمون نگاری کی جب صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو صحافت کے میدان میں قدم رکھنا آسان ضرور ہو جائے گا اور اگر آئندہ ہمارے ادارے نے باضابطہ صحافت کی ٹریننگ کا کورس چلایا تو آپ جیسے ماہر صحافی کی خدمات اور مشوروں کو ضرور سامنے رکھا جائے گا اور ممکن ہوا تو تعاون بھی حاصل کیا جائے گا ان شاء اللہ-

سوال :-آپ نے اصلاح معاشرہ پر مبنی چھوٹی بڑی کئی کتابیں اور مقالات تصنیف وتحریر فرمائے ہیں جو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے، ایسے میں کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ جماعتی سطح پر بالعموم اچھی کتابیں تصنیف نہیں کی جاتیں جو اختلافی مسائل سے ہٹ کر عام آدمی کو متاثر کرے، اگر نہیں تو آپ کی نظر میں اس کی وجوہات کیا ہیں؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- کسی صالح معاشرہ کی تشکیل میں مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں

کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے، اصلاح عقائد اور رد بد مذہبان کی ضرورت تو بنیادی ضرورت ہے کہ اس سے ہرگز صرف نظر نہیں کیا جاسکتا، آج مسلک حق کا جو کچھ تحفظ ہے وہ انہیں کتابوں کا صدقہ ہے، ہاں اصلاح عقائد کے ساتھ اصلاح اعمال کی بھی بہت سخت ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اصلاح عقائد کی تحریک بھی پورے طور سے کامیاب نہیں ہوتی، بالخصوص عوام الناس کا حال تو یہ ہے کہ مخصوص چیزوں کی طرف جلد لپکتے ہیں- اعمال کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ سے قوم زیادہ متأثر ہوتی ہے اور قوم اثر نہ لے جب بھی فرائض و واجبات کی ادائیگی اور محرمات و مکروہات سے اجتناب و بیزاری امتثال امر باری ہے جو بہر حال ہمیں انجام دینی ہے کہ اس میں رضائے الٰہی ہے، لہٰذا دونوں طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، میں نے بھی محسوس کیا اور اس خلا کو پر کرنے کی طرف ذرا سی توجہ دی الحمد للہ دیگر اہل قلم حضرات بھی اب اس جانب متوجہ ہو رہے ہیں، ناچیز سے جو بھی ہو سکے گا انشاء اللہ کرتا ہی رہوں گا، الحمد للہ ہمارے ادارہ المجمع الاسلامی مبارکپور نے بھی اس کی طرف خاص توجہ دی ہے، اسلامی اخلاق و آداب، رسوم شادی، دعوت میت، مزارات پر عورتوں کی حاضری، اصلاح رسوم، حقوق والدین، اہمیت زکوٰۃ، اسلام اور تربیت اولاد، اسلامی معاشرت اور بندوں کے حقوق، میاں بیوی اسلام کی نظر میں، شادی اور آداب زندگی، امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات، آداب معلم و متعلم، وغیرہ کی اشاعت اسی غرض سے کی گئی ہے-

سوال :- آپ نے ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور کی کافی عرصے تک ادارت فرمائی ہے، ایسے میں کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہمارے مذہبی رسائل بالعموم صحافتی نقطۂ نظر اور ابلاغی تاثیر سے کافی حد تک خالی ہوتے ہیں؟ جو مذہب و ملت کے عصری مسائل اور رجحانات سے بالکل صرف نظر کرتے ہیں، شائد یہی وجہ ہے کہ وہ عوام و خواص میں بہت مقبول نہیں ہوتے، آپ کی کیا رائے ہے؟

مولانا عبد المبین نعمانی:- اسٹیج سے لے کر رسائل و مجلات تک ہمارے یہاں عصری مسائل سے غفلت عام ہے لیکن ایسا بھی نہیں کے میدان بالکل خالی ہے- میں سمجھتا ہوں کہ

ماہنامہ جام نور بہت حد تک اس کمی کو پوری کر رہا ہے اور ہمارے رئیس التحریر مولانا یٰسین اختر مصباحی کے ادارئے تو زیادہ تر عصری مسائل ہی سے متعلق ہیں باقی رہیں عصری ضرورتیں تو یہ بہت ہیں ان کی تکمیل کے لیے سب ہی کو کوشاں ہونا چاہیے، ہم میں سب ہی ذمہ دار ہیں اور سب ہی سے ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے سوال ہوگا- ہاں اخبارات و رسائل کے تعلق سے ایک بات میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ ہمارے اکثر رسائل ایک ہی ڈھرے پر چل رہے ہیں، جب کہ کچھ رسائل صرف تحقیقی ہیں تو کچھ خواتین سے متعلق اور یوں ہی اطفال کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، ''نیک خاتون'' کے نام سے صرف ایک رسالہ راجستھان سے نکل رہا ہے جو ہندی میں ہے اور عورتوں کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے، اردو میں تو بالکل سناٹا ہے میں سمجھتا ہوں اردو اور ہندی میں ابھی اور ماہناموں کی ضرورت ہے جو نکل رہے ہیں وہ اتنے بڑے ملک کے اعتبار سے بہت کم ہیں، اور ان میں کسی کا حلقہ وسیع نہیں-

رسائل کی کمی یا جو نکل رہے ہیں ان کی اشاعت کی کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں جلسہ و جلوس پر بہت زیادہ توجہ ہے اور لٹریچر پر اس سے بہت کم، ناخواندوں کو خواندہ بنانے کی تو کوئی اسکیم بھی نہیں، نہ بالعموم جلسوں میں تعلیمی موضوعات میں بیانات ہی ہوتے ہیں کہ قوم متوجہ ہوں یا جو پڑھے لکھے لوگ ہیں ان میں تحریک کی جائے تو رسائل کی اشاعت بڑھ سکتی ہے اور جب اشاعت بڑھے گی تو وسائل ہاتھ آئیں گے، پھر کسی رسائل کے میدان کو کوئی مشورہ دینا مناسب ہوگا ابھی تو جو مواد نکل رہا ہے وہ عوام کی طبیعت کے مطابق ہی نکل رہا ہے، ہاں اہل علم طبقہ کی ضیافت کا کم ہی سامان ہوتا ہے اور اہل علم خرید کر زیادہ پڑھنا بھی نہیں چاہتے-

مجلات میں ابلاغی تاثیر کے فقدان کی جو وجہ ہے وہ میرے نزدیک یہ ہے کہ زیادہ تر رسائل کسی خاص نقطۂ نظر سے نہیں نکلتے بس شوق پیدا ہوا رسالہ نکال ڈالا میں تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہوں کہ بعض رسائل مدارس کی طرف سے نکلتے ہیں مگر ان کے اندر ان مدارس کی ترجمانی کرنے والے مواد نہیں ہوتے، نہ کسی قسم کی کوئی تحریک ہوتی ہے، جس قلم کار نے جو مضمون بھیج دیا اس کو چھاپ دیا، اس سے زیادہ ایڈیٹر حضرات سوچتے ہی نہیں، در

اصل مدیر کے اپنے نقطۂ نظر اور زاویہ فکر کی چھاپ پورے رسالے پر ہونی چاہیے اگر ایسا نہیں ہے تو رسالہ محض مجموعہ مضامین ہوکر رہ جائے گا، مقصدیت سے اس کا تعلق ثانوی ہوگا اس لیے میں آپ کی رائے سے متفق ہوں-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مولانا عبدالمبین نعمانی:- میرے کئی پیغام ہیں نوٹ کرلیں: (۱) ماہنامہ جام نور دہلی رئیس القلم قائد اہل سنت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی یادگار ہے، اسے زیادہ دنوں تک باقی رکھیے اور اس کو باقی رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش سے دریغ نہ کیجیے - خدا نہ کرے کبھی بند ہو تو تمام خریداروں کا حساب کر کے بقایا ضرور چکتا کر ڈالیے گا، کیوں کہ اس کا آخرت میں کیا اثر پڑے گا وہ تو بعد میں معلوم ہوگا لیکن دوسرے نئے رسائل کے لیے خریدار فراہم کرنے میں یہ چیز بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے- لوگ کہتے ہیں کہ فلاں پرچے کا سالانہ جمع کیا، نہیں آیا، فلاں کا صرف دو شمارہ ملا پھر بند ہوگیا وغیرہ- (۲) مسلک اہل سنت و جماعت کی ترجمانی سے متعلق مضامین بہت کم ہوتے ہیں، آپ اپنی صحافتی مہارت کی بنیاد پر جدید طرز سے مسلک کی ترجمانی کریں تو شاید زیادہ مؤثر ہو (۳) اکابر اہل سنت کے حیات اور کارناموں سے متعلق بھی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوں تو اچھا ہے، بلکہ ضروری ہے-□□□

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

مفتی عبدالمنان اعظمی

شیخ الحدیث: مدرسہ شمس العلوم، گھوسی، مئو (یوپی)

بحر العلوم مفتی عبدالمنان اعظمی کی پیدائش یوپی کے ایک چھوٹے سے قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں ۱۹۲۵ء میں ہوئی اور پھر ہوش سنبھالتے ہی ان کے دیندار والدین نے انہیں الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں ہی حافظ ملت مولانا عبدالعزیز مرادآبادی کے تربیت میں ڈال دیا جہاں آپ نے اکتساب علوم عقلیہ ونقلیہ کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں فراغت حاصل کی- فراغت کے بعد کئی مختلف اداروں میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۵۵ء میں حضرت حافظ ملت کے مشورے سے الجامعۃ الاشرفیہ میں درجۂ عالیہ کے سربراہ کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور اس کو اہل سنت و جماعت کا مرکزی ادارہ بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا، ۱۹۵۶ء میں جب اشرفیہ میں شعبۂ افتا کا قیام عمل میں آیا تو بحیثیت مفتی ان پر مزید ذمہ داری ڈال دی گئی اور پھر جب حافظ ملت کا وصال ہوا تو ''صدر مدرس'' کے عہدے پر فائز ہوگئے اور اپنے عہد صدارت میں اپنے استاذ و مربی کے جامع منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں تندہی سے لگ گئے جس کے نتیجے میں جامعہ کا نیا نصاب مقرر ہوا اور حکومتی سطح پر ڈگریوں کو تسلیم کیا جانے لگا- اپنی ان مختلف مصروفیتوں کے بیچ انہوں نے لوح و قلم سے بھی گہرا رشتہ رکھا اور شرعی پس منظر میں کئی کتابیں اور رسالے لکھے -اپنے استاذ مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی کی سرپرستی میں ''فتاویٰ رضویہ'' کی بیشتر جلدوں کی تدوین، ترتیب اور تہذیب آپ کا سب سے اہم کارنامہ ہے- ان سب کے علاوہ پچھلی چھ دہائیوں سے آپ فقہ و افتا کے ذریعے برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کی رہنمائی بھی کر رہے ہیں- ۶ رجلدوں پر مشتمل ہزاروں صفحات میں پھیلے آپ کے فتاوے کا مجموعہ ''فتاویٰ بحر العلوم'' اس کی روشن دلیل ہے-

سوال:- آپ کتنے سالوں سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-تریسٹھ سال سے

سوال:- درس وتدریس کے میدان میں کئی دہائی گزارنے کے بعد آج مدارس کے طریقۂ تعلیم میں آپ کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-آج تعلیم کے ٹیپ ٹاپ اور ظاہر میں اضافہ ہوگیا ہے- اور معنویت گھٹ گئی ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے طالب علم سبق پڑھنے سے پہلے اس کا از خود مطالعہ کرتا تھا-جسمیں کبھی کبھی پورا سبق ہی حل کرلیتا تھا اور کبھی کچھ کم وبیش اور سبق سے ایک مناسبت تو سبھی مطالعہ کرنے والوں کو پیدا ہوجاتی تھی-جس کے نتیجے میں دوران سبق استاد سے سوال وجواب بھی ہوجاتا تھا- اور پھر پڑھنے کے بعد وقت نکال کر پوری جماعت کے طلبہ آپس میں بحث وتکرار بھی کرتے تھے- اس سے کم استعداد طلبہ کو بھی کافی فائدہ ہوتا کہ وہ آپس میں بے تکلفی سے افہام وتفہیم کرلیتے - اس طریقہ سے پڑھنے میں قوت حافظہ اور عاقلہ دونوں ہی مصروف ہوتے اور طالب علم کو سبق پر پوری طرح قابو ہوجاتا تھا-

اور اب طالب علم از ابتداء تا انتہاء کتاب کو اس کے شائع شدہ ترجمہ اور شرح سے پڑھتا ہے- امتحان اردو میں تیار شدہ نوٹ اور امتحان دلانے والوں کی چٹ اور پرچیوں سے دیتا ہے، اور دیگر غیر علمی ترکیبوں سے اپنی جماعت میں یونہی پوزیشن بناتا ہے- یعنی حصول علم میں عقل ودماغ کا حصہ کم سے کم ہوگیا ہے-

سوال:- زمانہ کی رفتار کے مطابق ہر چیز میں تبدیلی آرہی ہے، مگر ہمارے مدارس جہاں تھے وہیں ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-میرے خیال میں ایسا نہیں ہے- مدارس کی عمارتوں میں عام طور سے بڑی تبدیلی آئی ہے- نصاب میں خاصی ترمیم ہوئی ہے، بہت سے مدارس میں کمپیوٹر بھی لگائے گئے ہیں، امتحانات اور مدارس میں داخلہ کا سسٹم اسکولوں کی طرح ہوگیا ہے، مدارس میں کالجوں کی طرح سمینار بھی ہونے لگے ہیں، جماعت میں لکھنے والے علما کی

تعداد بھی خاصی ہوگئی ہے- پھر ترقی اور تیز رفتار سے آپ کی مراد کیا ہے، اس کی توضیح کریں تو جواب شاید صحیح میں پاتے-

سوال:- آج علما کا وقار مسلم معاشرے میں نہیں ہے، جو کبھی ہوا کرتا تھا- اس کے اسباب کیا ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- اس کا بہت کچھ سبب تو یہ ہے کہ عرصہ تک لیڈر حضرات نے علما کے خلاف پوری جدوجہد سے پروپیگنڈہ کیا ہے اور یہ سبب بھی ہے کہ علما نے اپنی حرکت وعمل سے خود بھی اپنا وقار کھویا ہے-

سوال:- ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں مدارس اسلامیہ ہیں اور ہر سال ہزاروں علما فارغ ہوتے ہیں، مگر چند حضرات کے علاوہ کوئی بھی اسلام کی ترویج اور تبلیغ کرتا دکھائی نہیں دیتا، آپ کی نظر میں اس کے وجوہات کیا ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- مجھے یہاں بھی نقطۂ نظر کا اختلاف نظر آتا ہے- کسی بھی آبادی میں پہلے دور دور تک خط لکھنے والے اور پڑھنے والے نہیں ملتے تھے- کتنی جگہ جنازہ پڑھانے والے عنقا تھے، عوام بغیر جنازہ پڑھے مردہ کو دفن کردیتے اور علامت کے لیے قبر پر لکڑی گاڑ دیتے کہ کوئی جاننے والا گزرے تو قبر پر جنازہ پڑھ دے- دیہاتوں میں اسلام کے طریقہ پر جانور ذبح کرنے والے نہیں ملتے تھے- چھری پھنکوا کر رکھتے اور اسی سے سال بھر جانور ذبح کرتے-

اور آج اللہ تعالیٰ کے فضل سے گاؤں گاؤں اسلامی مدرسے، اور محلّہ محلّہ مولوی ہیں- تقسیم ہند کے طوفانی دور میں جب زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کا نام لینے والے اس سرزمین سے ختم کردئے جائیں گے- لیڈر حضرات تو اڑ کر اس پار چلے گئے تھے اور دوسرا کلمہ گو فرقہ بھی زخم پر نمک چھڑک رہا تھا اور اسٹیج پر الاپ رہا تھا-

نواکھالی سے جو پھوٹا تھا چشمہ
اسی کے تیزرو دھارے نے مارا
مجھے ہندو سے کچھ شکوہ نہیں ہے
مسلمانوں کے بٹوارے نے مارا

اس وقت ٹوٹے پھوٹے دیہاتی مدارس تھے جو شکستہ دل اور مظلوم مسلمانوں کو ڈھارس دلا رہے تھے-اور اسلام پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کر رہے تھے-کیا یہ اسلام کی تبلیغ وتلقین کا جہالت کی کایا پلٹ دینے والا کارنامہ نہیں-اور جیسے عالمی مبلغین کا ذکر آپ نے کیا ہے تو وہ توصدیوں میں پیدا ہوتے ہیں-

سوال:- یہ کیا وجہ ہے کہ آج مسلم معاشرے سے دینی رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے-یہی وجہ ہے کہ عام مسلمان اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلانے کی بجائے عصری تعلیم کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں-کیا اس لیے تو نہیں کہ مدارس میں ہمارے بچوں کا معاشی مستقبل تابناک نہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-آپ کا اندازہ صحیح ہے-اور یہی سبق سید احمد کر لی علی گڑھی نے اور ان کے ہوا خواہوں نے مدتوں ہندوستان کے اسلامی اشراف کو سکھایا بھی تھا اور خوشحال زندگی کی اسلام بھی مخالفت نہیں کرتا-اور ہم نے سنا کہ ملابار کے مسلمانوں نے اس رخ پر کافی پیش رفت بھی کی ہے، مگر حضرت سعدی علیہ الرحمہ کا یہ شعر ہر دم مسلمانوں کے پیش نظر رہنا چاہیے...... ع

نباشد دل آن فرد مایہ شاد
کہ از بہتر دنیا دید دہن بباد

سوال:- الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی تعمیر وترقی میں آپ کا کیا کردار رہا-اور حافظ ملت کے ساتھ کتنے گہرے روابط رہے؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ مبارکپور تشریف لائے تو میں آٹھ، دس سال کا بچہ تھا، مدرسہ مصباح العلوم کے پرائمری درجات میں پڑھتا تھا میرے سامنے ہی حضرت تشریف لائے-اور صدر المدرسین مولانا شمس الحق صاحب کی درسگاہ میں بیٹھے-

آپ کی تشریف آوری کے بعد پے در پے ایسے امور ظہور پذیر ہوئے کہ مبارک پور کے تمام سنی مرد ہو کہ عورت، بچہ اور بوڑھا ہو یا جوان سب کے دل و دماغ پر حضرت حافظ ملت علیہ الرحمۃ اور مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم چھا گئے-آپ کے ساتھ کام کرنے والا

مبارکپور کا ہر سنی تھا مگر کسی کے بارے میں مجھے یہ یاد نہیں کہ اس وقت یہ دعوی کیا ہو کہ میں نے مدرسہ کی تعمیر وترقی میں یہ کارنامہ انجام دیا-ہر موقع پر سب حافظ ملت علیہ الرحمۃ کا ہی نام لیتے تھے-میں تو ان کا ایک طالب علم اور وہ میرے استاذ تھے-میں ان کا پروردہ اور وہ میرے مربی ونگراں تھے-میرے خیر خواہ اور ہم درد تھے-پرائمری درجہ دو کے بعد والد صاحب مجھے ان کی خدمت میں لے گئے تو فرمایا میں اس کو بخاری پڑھاؤں گا، فی الحال درجہ فارسی میں داخل کر دو-شرح جامی سے دورہ تک اکثر کتابیں میں نے ان سے پڑھیں-سفر و حضر میں بیشتر ان کے ساتھ رہا-انہیں کی عنایت سے اشرفیہ میں مدرس ہوا تو ان کی درسگاہ سے متصل اشرفیہ میں تدریس کے لیے مجھے جگہ ملی، بعد میں انہیں سے میں مرید ہو گیا-انہوں نے مجھے خاک سے پاک بنایا اور ذرہ تھا تو آفتاب تک پہنچایا-انہوں نے جب جہاں بھیجا بے چوں چرا گیا اور جب بلایا بے عذر حاضر ہوا جو حکم دیا سعادت مندی سے بجا لایا-ان کے ساتھ ان کی خدمت میں رہ کر جو کیا سب انہیں کا کردار ہے-میرا کیا ہے؟

سوال:- حافظ ملت سے اس قدر گہرے مراسم اور الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر وترقی میں اتنا اہم کردار ادا کرنے کے بعد یقیناً آپ کو وہاں سے جذباتی لگاؤ ہوگا، پھر وہاں سے سبک دوشی کی اصل وجہ کیا ہے؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- دارالعلوم سے جذباتی لگاؤ کے بارے میں آپ نے صحیح اندازہ لگایا-لگاؤ تو تھا، اب بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی رہے گا-رہا یہ سوال کہ میں دارالعلوم سے کیوں الگ ہوا؟ یہ سوال عرصہ ہوا کراچی میں مجھ سے ہوا، میں نے غالب کا یہ شعر پڑھ دیا-

سفینہ اپنا کنارے جب آ لگا غالب
خدا سے کیا گلہ جور نا خدا کرتے

اسی پر آپ بھی اکتفا کریں-

سوال:- الجامعۃ الاشرفیہ میں حافظ ملت علیہ الرحمۃ کی وفات سے قبل اور بعد آپ کن عہدوں پر رہے؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:-حضرت کی حیات میں شعبہ عالیہ الہ آباد کے ہیڈ کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا- جب ادارے میں شعبۂ افتاء قائم ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی- جب قوم نے ادارہ کی جملہ ذمہ داری حضرت کو سونپی تو انہوں نے جدید دستور کے موافق نئی کمیٹی قائم کی اور اس میں مجھے مجلس شوری اور عاملہ دونوں کمیٹیوں کا ممبر مقرر کیا-

حضرت کے سربراہ ادارہ ہونے کے بعد یہ سوال اٹھا کہ ادارے کا کوئی عہدیدار اس کا تنخواہ دار ملازم نہیں ہوسکتا تو آپ نے صدر مدرسی سے استعفیٰ دے دیا- اور مدرسہ سے تنخواہ لینی چھوڑ دی- کمیٹی حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بطور صدر المدرسین ادارے میں لے آئی جب انہوں نے استعفیٰ دے دیا تو ایک کمیٹی میں حضرت نے مجھ سے کہا تم کیوں یہاں کی صدر مدرسی قبول نہیں کر لیتے؟ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی حیات ظاہری میں آپ کی جگہ نہیں بیٹھ سکتا- آپ کی وفات کے بعد کمیٹی نے مجھ سے کہا اور میں نے یہ عہدہ قبول کرلیا تقریباً آٹھ سال کے بعد میں نے وہاں سے استعفیٰ دے دیا-

سوال:- آپ کو اسلاف کی یادگار کہا جاتا ہے- اس کے باوجود آج کے علمائے کرام جو عوام میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں ان میں آپ کہیں نظر نہیں آتے- ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کو عمداً یہ لوگ نظر انداز کر رہے ہیں، جب کہ آپ ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ میں ہر میدان میں سینیئر اور بزرگ ہیں؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- مجھے تو ایسا نہیں لگتا لوگ بلاتے ہیں، مگر میں اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہو پاتا اور اگر کچھ لوگ ایسا سوچتے ہوں تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں-

سوال:- اس ترقی یافتہ دور میں تعلیم نسواں کا معیار کس حد تک ہونا چاہیے؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- حدود شرع میں رہ کر اس کی رعایت بلکہ پابندی کے ساتھ ہر جائز علم حاصل کر سکتی ہے-

سوال:- فضیلت کے نو سالہ نصاب تعلیم کو پانچ سے چھ سال کیا جائے اور اپنے مدرسوں کو عصری یونیورسٹیوں سے الحاق کرایا جائے تا کہ طلبہ کم مدت میں عصری تعلیم سے بھی آراستہ ہوں، اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مفتی عبدالمنان اعظمی:- پانچ سال میں کسی کا عالم دین ہونا تو مشکل ہی ہے ڈر یہ ہے کہ اس پانچ سال کی کمی کہیں اسے عصری تعلیم کی برکتوں سے بھی نہ محروم رکھے-

البتہ ایسا کر سکتے ہیں کہ آپ اُنہیں اِنہیں چند سالوں میں عربی زبان کے ساتھ دینیات کی معتد بہ تعلیم دیدیں اس کے بعد آپ تعلیم کے مختلف شعبے کر دیں جو عصری تعلیم حاصل کر سکتا ہے وہ یونیورسٹی کا راستہ لے اور جو دینی علوم میں مہارت چاہتا ہے وہ اسلامی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرے، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ عصری تعلیم کی یونیورسٹی بھی آپ کے ہی (یعنی اہل اسلام کے ہی زیر انتظام رہے تا کہ آپ طلبہ کی دینی تربیت کا بھی مناسب بندوبست کر سکیں)

سوال:- آج جب کہ دنیا میں مذہب اسلام کو ایک تشدد پسند مذہب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے- ایسے میں ہمارے علما کی ذمہ داریاں کیا ہونی چاہیے-

مفتی عبدالمنان اعظمی:- سختی کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل کرنا اور برائی سے خود بچنا اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کرنا- رہ گئی بدنام کرنے کی بات تو مثل مشہور ہے آفتاب پر تھوکا اپنے منہ پر آتا ہے، آج پوری دنیا ایسی اصطلاح والوں کی دہشت پسندی کے خلاف احتجاج کر رہی ہے اور کتنے لوگ خود ان کو دہشت پسند کہہ رہے ہیں-□□□

(شمارہ جون ۲۰۰۳ء)

مفتی عبدالمنان کلیمی

مفتی شہر مرادآباد و صدر مجلس علمائے ہند

مفتی عبدالمنان کلیمی مرادآباد کے قدیمی ادارہ جامعہ اکرم العلوم کے مہتمم و شیخ الحدیث اور جماعت اہل سنت کے ایک سرکردہ عالم دین ہیں- ان کا ایک فتویٰ ۲۰۰۶ء میں اچانک میڈیا میں موضوع بحث بن گیا، مذکورہ فتویٰ کے حامیوں نے اگران کی جرأت وہمت کوسراہاتو مخالفین نے اس پر کافی واویلا مچایا، مگر مفتی صاحب مطمئن ہیں کہ انہوں نے ان حقائق کا عالمی سطح پر برملا اظہار کردیا ہے جن کوایک عرصے سے چھپانے کی کوشش کی جارہی تھی- یہ فتویٰ بدعقیدہ افراد کی اقتدا میں نماز جنازہ پڑھنے سے متعلق تھا- ہم نے اس حوالے سے بذریعہ ٹیلی فون مفتی صاحب کا تفصیلی انٹرویو لیا- موصوف ہندوستان کی معروف دینی درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ سے ۱۹۷۵ء میں فارغ ہوئے، وہ حافظ ملت مولانا عبدالعزیز محدث مرادآبادی کے مرید اور شاگرد ہیں جب کہ مفتی برہان الحق جبل پوری، مولانا عبدالمصطفیٰ ازہری اور مولانا محمد اکرم نعیمی سے خلافت واجازت حاصل ہے- مفتی صاحب نے مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں، مفتی شریف الحق امجدی، علامہ ارشد القادری علیہم الرحمہ اور دیگر اکابر اہل سنت کی صحبتیں پائی ہیں- فراغت کے بعد سے مسلسل درس بخاری دے رہے ہیں- آپ نے تحریری کام بھی کیے ہیں- فتاویٰ امجدیہ کی ترتیب وتدوین آپ کا اہم کارنامہ ہے، اس کے علاوہ گھوسی مئو میں دائرۃ المعارف الامجدیہ اور خیرآباد میں روضۃ المعارف قائم کرکے بہت سی کتابیں آپ نے شائع کی ہیں- شمس العلوم گھوسی اور جامعہ فاروقیہ خیرآباد کے بعد اب جامعہ اکرم العلوم مرادآباد کے منصب شیخ الحدیث پر فائز اور دینی وملی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں-

سوال :- حالیہ دنوں آپ کے ایک فتوے کو پرنٹ میڈیا اور خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نے خوب اچھالا، آخراس فتوے میں ایسا کیا تھا جس نے ٹی وی چینلوں کو متوجہ کیا اور پھر آپ کو ٹیلی ویژن پر بلاکر گرما گرم بحثیں چھیڑ دیں؟

مفتی عبدالمنان کلیمی :- ضلع مرادآباد میں ایک گاؤں ہے اہرولہ مافی، وہاں ایک صاحب کا انتقال ہوا، وہ سنی تھے، وہاں ۹۰ رفی صد سنی مسلک کے ہی لوگ ہیں، معدودے چند وہابی ذہن کے لوگ ہیں، گاؤں کے امام صاحب بھی سنی ہیں، وہ نماز جنازہ پڑھانے کے لیے تیار تھے، مگر متوفی کے متعلقین میں سے کچھ جو دیوبندی خیالات کے تھے، وہ کسی وہابی مولوی کو بلالائے اور وہ چالاکی سے نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ گیا، نماز تو ہوگئی مگر اس کے بعد زبردست انتشار ہوا، ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا، لوگ کہنے لگے کہ پورا گاؤں سنی ہے، مجمع سنی ہے، مرنے والا سنی ہے، پھر یہ دیوبندی مولوی کہاں سے دھمک آیا اور اس نے کیسے نماز جنازہ پڑھادی؟ چندلوگوں نے جو اس وہابی مولوی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی تھی انہوں نے کہا کہ آپ لوگ پریشان نہ ہوں ہم مفتی صاحب قبلہ سے استفسار کریں گے اور شریعت کا جو حکم ہوگا وہ صادر فرمائیں گے، اس پر عمل کیا جائے گا، ان لوگوں نے مجھ سے استفتاء کیا اور میں نے دوٹوک شرعی جواب پیش کردیا- میرے سامنے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کی کتاب حسام الحرمین تھی جس میں اہل دیوبند کی کتابوں سے یہ ثابت ہے کہ ان کے عقائد کفری ہیں، میں نے اس کے پیش نظر یہ جواب دیا کہ اگر امام انہیں کفری عقائد کا حامل ہے تو اس کی پڑھائی ہوئی نماز نہ ہوئی، جن لوگوں نے اس کے کفری عقاید پر مطلع ہوتے ہوئے اس کے پیچھے نماز پڑھی انہیں توبہ کرنا ہوگا، دوبارہ کلمہ پڑھنا ہوگا اور اگر ان کا نکاح ہوگیا تو تجدید نکاح بھی کرنی ہوگی اور جن لوگوں نے لاعلمی میں، جہالت میں اور اس مولوی کی ظاہری وضع قطع دیکھ کر اس کے پیچھے نماز پڑھ لی ہے تو ان کا ایمان باطل نہیں ہوا اور انہیں تجدید ایمان ونکاح کی ضرورت نہیں ہے- وہ اپنے عمل سے رجوع کریں اور توبہ واستغفار کریں اور اپنی برأت کا اعلان کریں- نہ جانے کس طرح یہ فتویٰ اخبار والوں کے

ہاتھ لگ گیا اور دینک جاگرن نے نمایاں سرخی کے ساتھ خبر چھاپا اور ساتھ میں میرے فتویٰ کی فوٹو کاپی بھی شائع کر دی - بس کیا تھا الیکٹرانک میڈیا کو بھی خبر ہو گئی، الیکٹرانک میڈیا کے لوگ مسلسل میرے پاس آنے لگے اور میرا انٹرویو کیا، میں نے اپنی بات مسلک اعلیٰ حضرت اور حسام الحرمین اور اپنے علما کے افادات کی روشنی میں کی، اس کے بعد سہارا چینل نے پیش قدمی کی اور اس نے مختلف اسکالرز کے سامنے یہ انٹرویو لیا، اس کے بعد انہوں نے طے کیا کہ مفتی صاحب کو بنفس نفیس بلایا جائے، انہیں اپنے فتویٰ کی خود وضاحت کرنی ہوگی اور ہمارے نیشنل و انٹرنیشنل جو ناظرین ہوں گے ان کے فونی سوالات کے جواب دینے ہوں گے - جس گاؤں کا یہ سانحہ تھا وہ مجھے وہاں اپنے ساتھ لے کر گئے - وہاں جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے مقابلے میں حلقۂ دیو بند کے کئی حضرات کو بھی مدعو کیا گیا ہے، مباحثہ شروع ہوا، میں نے پوری سنجیدگی اور سلیقے سے ہر سوال کا جواب دیا - دیو بندی سائلین کے اعتراضات کا بھی جواب دیا، چینل والوں کے سامنے اپنے موقف کی بھر پور انداز میں وضاحت کی اور جو فونی کالرز تھے ان کے سوالوں کے بھی تشفی بخش جواب دیے، یہ سلسلہ ۱۲ر بجے سے ۴ر بجے تک چلتا رہا، یہ تاریخ کا پہلا واقعہ تھا کہ اسکرین کے سامنے احقاق حق کے لیے ایک شخص ۴ر گھنٹے تک کئی مخالفین کے سامنے ڈٹا رہا اور حقانیت پر مبنی اپنی بات پیش کرتا رہا، پھر اس کے بعد ان لوگوں نے سوچا کہ اس مسئلہ کو انٹرنیشنل پیمانہ پر عام کیا جائے، چنانچہ پھر انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ ہمارا انٹرنیشنل چینل ۷۶ رملکوں میں دیکھا جاتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کے لیے بھی آپ وقت دیں اور اپنی بات پوری دنیا میں پہنچا دیں - میں نے احقاق حق کے لیے، مسلک کی صداقت کے اظہار کے لیے اور باطل کی سرکوبی کے لیے اس کو بھی منظور کر لیا، میں نے دو گھنٹہ تک بھر وقت دیا اور پوری دنیا میں پیغام حق کو عام کر دیا، یہ ہے اختصاراً اس واقعہ کی روداد -

سوال: - میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ تو اہل سنت و جماعت کا پرانا موقف ہے، پھر اس پر آخر میڈیا میں یہ ہنگامہ کیوں؟

مفتی عبد المنان کلیمی: - آپ صحیح فرما رہے ہیں اور اس نکتے پر زبردست میں نے

اظہار خیال کیا ہے، میں نے واضح لفظوں میں کہا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ کوئی نیا فتویٰ نہیں ہے، پچھلے ۱۰۰ رسالوں سے یہ مسئلہ سب کے سامنے ہے، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے، ان کے تلامذہ نے، ان کے خلفاء نے تحقیق و تفتیش اور مکمل وضاحت کے ساتھ بارہا اس کا اعلان کیا ہے - لیکن بہر حال یہ مسئلہ اب تک عوامی سطح پر بہت زیادہ نہیں آیا تھا، یا آیا تھا تو یہ بہت واضح نہیں تھا، اس لیے میڈیا نے اس کو کوریج دیا اور میڈیا کے ذریعے پہلی بار ہم نے دنیا بھر میں حق کی وضاحت کا فریضہ انجام دیا اور اس طرح سے لوگوں کو پہلی بار پورے طور پر حق کو سمجھنے کا موقع ملا -

سوال: - اس مباحثہ میں جہاں دیو بندی بریلوی عقاید کی بحث چھڑی ہوئی تھی، دیو بندی حلقے سے دو علما اور دو دانشوران شریک تھے، جبکہ سنیوں کی طرف سے صرف آپ تھے، اس سے کیا آپ کو نہیں لگتا کہ میڈیا والوں نے متوازن بحث نہیں رکھی؟

مفتی عبد المنان کلیمی: - بادی النظر میں تو آپ کی بات صحیح ہے، اس کا کھٹکا مجھے بھی ہوا، میں نے اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا لیکن جب ان لوگوں نے اپنی پالیسی بتائی اور اپنے طریق کار اور اصول کے بارے میں مجھ سے بتایا تو میں مطمئن ہو گیا اور تنہا ہر سوال کا جواب دینے کے لیے خود کو تیار کر لیا، ان لوگوں نے بتایا کہ چوں کہ فتویٰ آپ کا ہے جس کا اثر ایک طرح سے پوری دنیا میں ہوا ہے، اب اس تعلق سے جو شکوک و شبہات ہو رہے ہیں اب تقاضا یہ ہے کہ آپ ان کا جواب دیں - اگر آپ کے ساتھ ہم آپ کے حامیوں کو بھی بلا لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کا سپورٹ کریں گے تو جو چیز ہم پیش کرنا چاہ رہے ہیں کہ لوگوں کی تشویش اور شکوک و شبہات سامنے آئیں اور آپ ان کا ازالہ کریں یہ ہم پیش نہیں کر سکیں گے - اس لیے ہم صرف عوام کو نہیں بلکہ حلقۂ دیو بند کے بڑے بڑے علما اور دانشوران کو مدعو کرتے ہیں جن کے سوالات کا روبرو جواب دے کر آپ اپنے موقف کو صحیح طور پر واضح کر سکیں گے اور یہ بتا سکیں گے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ یونہی نہیں ہے، اس کی ٹھوس بنیادیں بھی ہیں - میں نے اس سے اتفاق کیا اور میں نے سب کے اعتراضات کے جواب دیے، مجھے اس سے خوشی ہوئی، میں نے اطمینان کا سانس لیا، اس لیے اس تعلق سے مجھے سہارا

چینل والوں سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

سوال:- میں نے محسوس کیا کہ دیوبندی حضرات اپنے حقیقی عقاید کو بتانے سے گریز کر رہے تھے اور عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مفتی عبد المنان کلیمی:-میری بات سہارا چینل والوں سے ہو گئی ہے، وہ پوری C.D. فراہم کریں گے، میں آپ کو بھی بھیجوں گا، آپ تفصیل سے دیکھیے گا کہ میں نے ہر ہر پہلو پر کس طرح سے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور مخالفین کی عیاریوں کا پردہ چاک کیا ہے، چینل والوں نے مجھ سے یہ بھی بتایا کہ اس تعلق سے انہوں نے حلقۂ دیوبند کے بڑے بڑے ادارے مثلاً مظاہر العلوم سہارنپور، دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلما کے بڑے بڑے مفتیوں سے رابطے کیے اور ان کو مدعو کیا تا کہ ان کی موجودگی میں عوام کے سامنے حقیقت نکھر کر آ جائے، مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے، انہوں نے یہ کہا کہ ان مباحث کو میڈیا میں پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اس سے انتشار ہوگا، بلکہ جن لوگوں نے اسٹوڈیو میں آنے کی ہمت بھی کی وہ بھی بڑی کوشش کر رہے تھے کہ ان کے بزرگوں کی کتابوں میں خدا اور رسول کی شان میں جو نازیبا عبارتیں ہیں، وہ عوام کے سامنے نہ آئیں اور اس طرح ان کے معتقدات پر پردہ پڑا رہے، لیکن میں نے ان کی ساری سازش اور فریب کا جالا توڑ دیا اور عوام کی عدالت میں ان کے حقیقی عقاید و نظریات کو پیش کر کے ان کی حقیقی صورت کو بے نقاب کر دیا۔

سوال:-کیا اس طرح کی بحثیں اس وقت اہل سنت و جماعت کے لیے مفید و ضروری ہیں؟

مفتی عبد المنان کلیمی:- دیکھیے! یہ اصولی مباحث ہیں، ان کا تعلق ایمان اور کفر سے ہے، آپ نے دیکھا کہ جب سلمان رشدی نے ہرزہ سرائی کی اور مسلمان کے نام پر اسلامی معتقدات و اصول کا مذاق اڑایا تو پوری دنیا کے مسلمان اس کے خلاف بھڑک اٹھے اور بھرپور احتجاج کیا، اب دنیا کا کوئی مسلمان بھی رشدی کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ نہیں رکھتا ہے، اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ قرآن کے خلاف ہرزہ سرائیاں کر کے، خدا اور پیغمبر

کی شان میں نازیبا کلمات کہہ کر کوئی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی اکابر دیوبند سے کوئی ذاتی رنجش نہیں تھی، بلکہ انہوں نے جب اکابر دیوبند کی کتابوں میں خدا اور رسول کی شان میں گستاخانہ عبارتیں دیکھیں، ان کے مغلظات کو پڑھا تو ان سے رجوع کرنے کا مطالبہ کیا اور رجوع و توبہ نہ کرنے کی صورت میں آخر کار انہوں نے ان کی تکفیر کی۔ جس پر ہندوستان کے اکابر علمائے اہل سنت کے علاوہ حرمین شریفین کے علما نے تصدیقات لکھیں اور اس فتویٰ کو حق بجانب بتایا۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ و خلفاء مسلسل اسی حقیقت کا اظہار کرتے آئے ہیں، علمائے اہل سنت جن میں نمایاں طور پر آپ کے دادا حضرت علامہ ارشد القادری بھی تھے، سب نے یہی کہا کہ دیوبند اور بریلی کا اختلاف خاندانی یا مالی نوعیت کا نہیں ہے، یہ اختلاف ایمان و کفر کے تعلق سے ہے۔ اس لیے لوگوں کو مسئلہ کی سنگینی کو سمجھانا چاہیے، سب نے اپنی بساط بھر زندگی بھر عوام کو اس حقیقت سے روشناس کرایا، آج میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، وہی کہا ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے توسط سے پوری دنیا کے سامنے اس ایمان و کفر کی بحث کے حقیقی خد و خال کو پیش کیا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں یقینی طور پر یہ مفید اور ضروری ہے، اس سے اہل سنت کو تقویت ملے گی، فائدہ پہنچے گا اور حلقۂ دیوبند کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔

سوال:-اپنی جماعت کا عمومی موقف ٹیلی ویژن اور تصاویر وغیرہ کے تعلق سے اب تک مختلف رہا ہے، علمائے بریلی کی رائے بھی یہی ہے، لیکن ہم آج برقی دور میں جی رہے ہیں جس کی اہمیت بتانے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ مختصر سے وقت میں اسی کے توسط سے پوری دنیا میں اپنا پیغام پہنچا سکے، اس کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا، تو کیا ایسے میں آپ اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتے کہ اس تعلق سے ہمارے موقف میں اب کچھ نرمی آنی چاہیے؟

مفتی عبد المنان کلیمی:- میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت کو بہت دنوں سے محسوس کر رہا ہوں اور اس کی طرف دوسروں کو متوجہ بھی کر رہا ہوں، ابھی کچھ دنوں پہلے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں جو میڈیا سمینار ہوا تھا اس میں بھی میں نے اپنے خطبہ صدارت میں اس تعلق سے مثبت گفتگو کی اور اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میڈیا کے مثبت اور افادی پہلوؤں کو دیکھتے

ہوئے وہ علما بھی اس سے قریب ہورہے ہیں جو اس مسئلہ میں بہت زیادہ محتاط تھے-

سوال :-آپ کے اس انٹرویو کے بعد اہل سنت کا کیا ردعمل رہا؟

مفتی عبدالمنان کلیمی :-اگر میں تفصیل سے بتاؤں تو کافی وقت لگ جائے گا، اللہ کا فضل ہے کہ بریلی شریف، کچھوچھہ مقدسہ، مارہرہ شریف، ممبئی، بنارس اور ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں سے اپنے علما و دانشوران کے فون موصول ہوئے، سب نے مجھے مبارک باد دی، خوشی کا اظہار کیا، تقریباً سب نے یہی کہا کہ آپ نے اعلیٰ حضرت کے مسلک کی صداقت کو سارے جہاں میں عام کردیا اور دیوبندی حضرات کے فریب کے جالا کو توڑ کر عوام کے سامنے ان کے حقیقی خدوخال پیش کردیے، یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، حضرت امین ملت نے بھی فون کیا اور تقریباً دس منٹ تک مجھے مبارک باد دیتے رہے-

سوال :-کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اسلام کی صحیح تصویر، اہل سنت کے صحیح عقائد کی اشاعت اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اپنا مستقل اخبار اور چینل ہونا چاہیے؟

مفتی عبدالمنان کلیمی :-خوشتر نورانی صاحب ! بالکل اس کی ضرورت محسوس ہورہی ہے اور میں آپ کے جام نور کے توسط سے اہل ثروت اور اہل دول حضرات سے گزارش کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں پیش قدمی کریں اور اپنا چینل جلد سے جلد قائم کریں، تاکہ ہم بلا خوف وخطر، بغیر کسی دشواری کے اپنا پیغام لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں اور اس سلسلے میں میں ایک اہم بات کہوں، وہ یہ کہ جو علماے دیوبند تھے انہوں نے تو اپنے معتقدات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی، لیکن جو لوگ یونیورسٹیز سے تعلق رکھنے والے تھے مثلاً ڈاکٹر شبیر صاحب ،طاہر محمود صاحب وغیرہ، ان کے تعلق سے میں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس حقیقی معلومات نہیں ہے، وہ اہل سنت و جماعت اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے تعلق سے ایک خاص موقف رکھتے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ مثبت انداز میں صحیح طور پر ان تک اعلیٰ حضرت کے حوالے سے باتیں نہیں پہنچائی گئی ہیں- یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر لاعلم بننے اور اپنے کو غیر جانب دار ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں-

سوال :-آپ کے مباحثہ میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ پروفیسر طاہر محمود اور ناہید

سلطانہ وغیرہ شریک تھے، اس مذاکرے میں پروفیسر طاہر محمود صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''یقینی طور پر دیوبندی اور بریلوی کے بیچ بھی نکاح درست ہے، بلکہ شیعہ اور سنی میں بھی نکاح درست ہے'' اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

مفتی عبدالمنان کلیمی :-آپ نے بالکل صحیح ریمارک کیا ہے اور رگ بیمار پر انگلی رکھ دی ہے، یقیناً طاہر محمود صاحب نے اور اس خاتون نے کچھ ایسی باتیں کی ہیں جو بے سروپا ہیں، طاہر محمود صاحب جو ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں وہ اپنی گفتگو میں بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ دستور ہند کو سامنے رکھنا چاہیے، اور ہندوستانی قوانین کو مدنظر رکھنا چاہیے، مجھے حیرت ہے کہ گفتگو ہورہی ہے شریعت اسلامیہ کی اور وہ دستور ہند کی بات کررہے ہیں، اگر دستور ہند کی روشنی میں ہم شریعت کو دیکھنے لگے تو مسئلہ تکفیر ہی کیا بہت سے مسائل پر سوالیہ نشان لگ جائے گا اور وہ زیر بحث آجائیں گے، مثال کے طور پر عدالت سے جو نکاح ہوتا ہے وہ نکاح قابل قبول نہیں، عدالت سے جو طلاق ہوتی ہے وہ طلاق قابل قبول نہیں، طاہر محمود صاحب کے نزدیک یہ سب صحیح و درست ہے، میں سمجھتا ہوں کہ علماے اہل سنت تو اپنی جگہ ہیں ہی خود علماے دیوبند بھی ان کی یہ بات قبول نہیں کریں گے- تو یہ سب باتیں ناواقفی پر مبنی ہیں اور میری رائے میں یہ سب موجودہ دور کی آزادروی اور آزادی فکری کی بلائیں ہیں کہ شریعت کے امور واسرار سے ناواقف لوگ اپنی عقل کی کسوٹی پر شریعت کو وزن کررہے ہیں-

سوال :-اگر مستقبل میں عمرانہ کے مسئلہ کی طرح کوئی اور مسئلہ میڈیا میں آتا ہے جس میں مختلف مکاتب فکر کے علما گرما گرم بحثیں کرتے ہیں اور غیر مسلموں کے سامنے نتیجہ کے طور پر اسلام اور شریعت کا مذاق ہوتا ہے، تو ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

مفتی عبدالمنان کلیمی :-اس کا جواب میں ایک تاریخی تناظر کو سامنے رکھ کر دیتا ہوں، ندوۃ العلما کا قیام ایک تنظیم اور ایک آرگنائزیشن کی شکل میں ہوا تھا، اس کے پہلے اجلاس میں سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی شریک رہے، وہاں بھی اتحاد امت اور اتحاد ملت کا مسئلہ اٹھا- اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پہلے آپ اپنے کو متحد کیجیے، شریعت کے جو احکام ہیں، جن کا اتباع ہم پر لازم ہے، ان کی وضاحت

کیجیے اوران پر عمل پیرا ہو جایئے تو اتحاد خود ہی ہو جائے گا، آج بعینہ اسی قسم کے مسائل اٹھ رہے ہیں، علمائے دیو بند سے اتحاد و اتفاق کی باتیں کی جارہی ہیں، حالانکہ جو اختلاف کی حقیقی بنیادیں ہیں پہلے ان کو سامنے رکھنا چاہیے، یہ ایمان و کفر کا مسئلہ ہے جائیداد کا مسئلہ یا فروعی مسئلہ نہیں ہے- جب مباحث سامنے آئیں گے اور علماے دیو بند اپنے خلافِ اہل سنت معتقدات سے توبہ ورجوع کرلیں گے پھر خود سے ہی اتفاق ہو جائے گا- الگ سے اتحاد کی کوشش نہیں کرنی ہوگی- اور جب تک یہ کام نہیں ہو جاتا، دونوں فریق کے علما ایک اسٹیج پر بیٹھ کر صحیح طور پر ملی مسائل پر سوچ ہی نہیں سکتے، ہاں اس طرح کے مسائل جب سامنے آئیں تو اپنے علما کو چاہیے کہ باہمی رائے مشورے کے بعد میڈیا کے سامنے اپنی ایک رائے پیش کریں تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم میڈیا کے سامنے اپنے موقف میں ہی الجھ کر رہ جائیں- اپنے علما کو اس پہلو پر سخت توجہ دینے کی ضرورت ہے-

سوال:- آخر میں آپ یہ بتائیں کہ کیا ہم اب تک عوام کے سامنے اپنا صحیح تعارف، اہل سنت کی صحیح تعبیر وتشریح اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا صحیح تعارف پیش کر سکے ہیں؟

مفتی عبدالمنان کلیمی:- دیکھیے! یہ تو صحیح ہے کہ موجودہ دور کا جو تقاضا ہے اس کو مدنظر رکھ کر صحیح انداز، صحیح اسلوب اور میڈیا کے طاقت ور اسٹیج سے جس طرح سے ہمیں اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کی تحقیقات، افکار ونظریات کو پیش کرنا چاہیے تھا، ہم نے اس انداز میں پیش نہیں کیا، لیکن اس سلسلے میں آپ حضرات نے اور دوسرے بہت سے ذی شعور افراد نے پیش قدمی کی ہے جو روشن مستقبل کی غماز ہے اور اس سے ہمیں اچھی امیدیں وابستہ ہیں-

سوال:- جام نور کے تعلق سے اپنے احساسات وخیالات کا اظہار کرنا چاہیں گے؟

مفتی عبدالمنان کلیمی:- آپ ایک بہت ہی روحانی، قلمی اور علمی شخصیت کے چشم و چراغ ہیں، آپ کے جد امجد حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے، آپ ان کے وارث ہیں اور جام نور آپ کا وسیلہ اظہار، اس لیے جام نور کی اشاعت میں حضرت علامہ کے افکار ونظریات، تحقیقات اور ان کے مشن کی جو روح تھی اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، جام نور مکمل طور پر اس پر کاربند ہے بھی، ہاں کچھ لوگوں کو آپ کی صاف

گوئی اور حقیقت پسندی سے شکایت ضرور ہوتی ہے، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر توجہ دی جائے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اس وقت جام نور کام کر رہا ہے اور صحیح روش پر گامزن ہے، میں اس کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں-□□□

(شمارہ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

مفتی عبدالواجد قادری

چیئرمین اسلامک فاؤنڈیشن آف نیدرلینڈ، ہالینڈ

مفتی عبدالواجد قادری بیک وقت ایک باصلاحیت عالم دین، مفتی، قلم کار و مصنف اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں- آپ کی ولادت ۹ فروری ۱۹۳۵ء کو شمالی بہار کے ایک مردم خیز علاقہ دوگھرا ضلع دربھنگہ میں ہوئی، آپ کی خاندانی وجاہت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آزادی ہند سے قبل آپ کے آباء واجداد کئی صوبوں کے اتالیق و امام مقرر کیے گئے- موصوف نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور پھر مختلف مدارس سے درجۂ عالمیت کی تکمیل کی اور اخیر میں جامعہ رضویہ منظر اسلام سے درجۂ فضیلت کی تکمیل کر کے مارچ ۱۹۵۷ء میں فراغت حاصل کی- فراغت کے بعد جامعہ میں ہی آپ مدرس ہوئے اس کے بعد ہندوستان کے مختلف مدارس میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے اخیر میں دارالعلوم المشرقیہ حمیدیہ دربھنگہ میں نائب صدر مدرس اور مفتی ادارہ کے حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی، پھر رئیس القلم علامہ ارشد القادری کے اصرار پر آپ ادارۂ شرعیہ بہار کے صدر مفتی کی حیثیت سے ۱۹۷۵ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک نمایاں خدمات انجام دیں اور ادارے کو وقار بخشا- اس درمیان آپ نے دسیوں ہزار فتاوے دیے جن کے مجموعے کا نام ''فتاویٰ شرعیہ'' ہے- ۱۹۸۵ء میں مولانا ریحان رضا خاں بریلوی کے اشارے پر آپ نے جامعہ منظر اسلام کے دارالافتاء کی ذمہ داری سنبھالی، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد آپ کو ہالینڈ جانا پڑا- اس وقت آپ ہالینڈ میں مرجع مسائل شرعیہ ہیں اور مختلف علوم و مسائل پر آپ کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں بالخصوص حیات مفسر اعظم، مکالمۂ حق و باطل، ضیائے تصوف، قرآنی تعلیمات، قرآنی علوم، فتویٰ نویسی کے رہنما اصول، تازیانہ، نقش دوام اور ''فتاویٰ یورپ'' اہم اور مقبول ہیں-

سوال:- ایک عرصے سے آپ ہالینڈ میں تبلیغ و اشاعت دین کا کام انجام دے رہے ہیں، اب تک آپ کے ذریعے وہاں کیا اہم کام انجام دیے گئے؟

مفتی عبدالواجد قادری:- سب سے پہلا کام جو ہمارے ذریعے وہاں شروع ہوا وہ یہ کہ نیدرلینڈ اسلامی سوسائٹی کی ایک چھوٹی سی جگہ تھی جس میں عظیم الشان پیمانے پر مسجد نوری تعمیر کی گئی- جتنے بھی ہمارے سنی علما خاص طور پر مسلکی اعتبار سے بریلی سے تعلق رکھنے والے ہیں ان کا قیام یا تو مسجد نبوی میں ہوتا ہے یا مسجد نوری میں، تو پہلا کام ہمارا یہ ہوا کہ مسجد نوری کو مسجد کی حیثیت دی گئی اور اس کے ذریعے تبلیغ و اشاعت کا کام بڑے پیمانے پر پورے ہالینڈ اور اس کے قرب و جوار میں شروع ہوا، میرے خیال میں سیکڑوں حضرات جو یہود و نصاریٰ یا لا مذہبیت کی زندگی گزار رہے تھے وہ اسلام میں داخل ہوئے، اس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ہم نے وہاں سے ہی شروع کیا، وہاں مختلف انداز سے لوگ استفتاء کرتے ہیں، کبھی ٹیلی فون کے ذریعے، کبھی تحریر کے ذریعے یا انٹرنیٹ یا فیکس کے ذریعے اور اس کا جواب دینا ہماری ذمہ داری ہے اور آج تک ہم اس کام میں لگے ہوئے ہیں-

اس کے بعد ہمارا تعلق رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری کے قائم کردہ ادارے جامعہ مدینۃ الاسلام سے صدر مفتی کی حیثیت سے ہوا کیونکہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنی صوابدید کے مطابق جامعہ مدینۃ الاسلام میں ایک دارالافتاء بھی قائم کیا تھا اور اس میں صدر مفتی کی جگہ ہمیں مقرر کیا، جس کی دستار حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری صاحب اور مختلف ممالک کے سفراء اور عمائدین شہر کی موجودگی میں میرے سر پر باندھی گئی- اس کے بعد سے لے کر آج تک میں اس دارالافتاء کا کام انجام دے رہا ہوں پھر اس بیچ میں مجلس علما کا قیام بھی عمل میں آیا، لوگوں نے مجلس علما کا دارالافتاء اور دارالقضاء میرے حوالے کیا اور آج تک میں اس کو بھی انجام دے رہا ہوں، بس یہ سب کام میرے ذریعے ہوئے ہیں-

سوال:- اا رستمبر کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ہالینڈ کی حکومت کا رویہ کیسا ہے؟

مفتی عبدالواجد قادری :- پہلے جیسا نہیں ہے، پہلے جس قدر نرم رویہ تھا اور مسلمانوں خاص کر داڑھی اور ٹوپی والوں کی جو عزت عوام کی نگاہ میں تھی اس میں کمی آئی ہے، نفرت تو نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن نفرت کی حد تک صورت دیکھنے میں آتی ہے، وہاں بھی کچھ اس طرح کی باتیں ہوئیں جن کا جواب مجلس علما کو دینا پڑا، بعض مسجدوں پر حملہ بھی ہوا، لیکن گورنمنٹ نے اس کو روکا، گورنمنٹ کا تعاون مسلمانوں کے ساتھ رہا، لیکن وہاں کے عوام متنفر ہوئے اور حکومت میں بھی بعض ایسے افراد شامل ہیں جو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن حکومت اب تک مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے-

سوال:- ہالینڈ میں اہل سنت وجماعت کتنی مضبوط ہے؟

مفتی عبدالواجد قادری :- الحمدللہ! اس وقت وہاں جانے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں صرف سنیوں کی ہی آبادی ہے اور وہ بھی متصلب سنی اور یہ صرف بعد میں جانے والے علما ہی کی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہاں پر رہنے والے وہ سنی مسلمان جن کے آباو اجداد ہندوستان سے منتقل ہوئے تھے اور اپنی سنیت کے مراسم اور روایات جو اپنے ساتھ لے گئے تھے ان کو ان لوگوں نے قائم رکھا مثلاً میلاد، فاتحہ، نیاز، دفن کے بعد قبر پر اذان دینا اور اس طرح کی بہت ساری چیزیں سنیوں کے مراسم میں شامل ہیں، وہ ان لوگوں کے یہاں ہیں، البتہ علما کے جانے سے یہ ہوا کہ مسائل کی انہیں جانکاری ہوئی اور انہوں نے صحیح طریقے سے اپنے آپ کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لیا، ویسے سنیوں کے بہت سارے مراسم ان کے آبائی ہیں-

سوال:- شہادت رویت ہلال کا مسئلہ پوری دنیا میں نزاعی صورت اختیار کرتا جارہا ہے، ایسے میں مفتیان کرام اور فقہائے عظام کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

مفتی عبدالواجد قادری :- اس سلسلے میں ہالینڈ کے علما بھی بڑے حساس ہیں اور انہوں نے آج سے چار پانچ سال قبل اس طرح کی نشستوں کا انتظام کیا کہ علما اکٹھے ہوں اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں، اس میں جتنے بھی ارکان طبقۂ علما سے تھے تقریباً سبھوں نے تحریری تبادلہ کیا اور اس مسئلے پر گفتگو کی لیکن اس کا نتیجہ کوئی خاص برآمد نہیں ہوا-

اس کے بعد بھی لوگ اس پر سوچتے رہے اور کچھ لکھتے بھی رہے لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے یہ معاملہ سلجھنے کے اور زیادہ الجھتا گیا، اس وقت میرے خیال میں پوری دنیا کے اندر گیارہ طریقوں سے رویت ہلال کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے اور اس میں سے دو تین طریقے ایسے ہیں جو صرف ہالینڈ کے اندر رائج ہیں، ایک تو یہ کہ رصدگاہ (Observatory) کے ذریعے ثبوت ہلال قائم کیا جاتا ہے، اگر رصدگاہ نے یہ کہہ دیا کہ آج چاند کی پیدائش ہے، تو کچھ لوگ ایسے بھی وہاں ہیں جو اس کو ہلال مان کر آنے والے کل کو پہلی تاریخ قرار دیتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا تعلق اس معاملے میں سعودی عرب سے ہے، وہاں جو لوگ رہتے ہیں وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور وہ عموماً مغربی یا انڈونیشین حضرات ہیں اور کچھ ترکی بھی ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں- کچھ ایسے بھی لوگ ہیں کہ اگر انگلینڈ کے علمانے فیصلہ کردیا کہ کل پہلی تاریخ ہے اور آج مہینہ ختم ہوگیا تو اس فیصلے کو مان لینے والے حضرات بھی وہاں موجود ہیں اور یہ زیادہ تر پاکستانی ہیں- کچھ ایسے بھی حضرات ہیں جو رویت کے اس مسئلے پر عمل کرتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے چلا آرہا ہے مثلاً ۲۹ر تاریخ کو چاند دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اگر چاند دیکھا گیا یا کہیں سے صحیح شہادت مل گئی تب وہ کل پہلی تاریخ مان لیتے ہیں ورنہ ۳۰ر پورا کر کے اپنا نیا مہینہ شروع کرتے ہیں اور یہ زیادہ تر سوری نامی حضرات ہیں- ہم لوگوں کا تعلق انہیں حضرات سے ہے جو اپنے اسلاف کے طریقے پر عمل کرتے ہیں چنانچہ اس سال بھی بعض لوگوں نے مطلع کے صاف ہونے کی صورت میں چاند ہونے کی گواہی دی لیکن چونکہ مطلع صاف تھا اس لیے دو تین آدمی کی گواہی بھی علمانے تسلیم نہیں کی -جب مطلع صاف ہو تو اس میں جم غفیر ہونے کی ضرورت ہوتی ہے یا اتنے لوگوں کی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس پر قاضی کو اعتماد کلی حاصل ہوجائے، لیکن ایسی شہادت چونکہ نہیں گزری، لہٰذا اس سال بھی نہ تو شعبان کا مہینہ شروع کیا گیا اور نہ رمضان کا مہینہ شروع کیا گیا دونوں کا اکمال ہوا ۳۰/۳۰ر تاریخ پوری کر کے مہینہ شروع کیا گیا- بہر حال اس معاملے کو لے کر انتشار ہے اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ علما سر جوڑ کر کے بیٹھیں اور اگر آسانی کی راہ امت مسلمہ کے لیے نکل سکتی ہے تو ضرور اس کو نکالنے کی کوشش کریں، اس

میں کوئی جدت پیدا نہیں کرنی ہے، بلکہ ہمارے جو اسلاف نے طرق موجبہ کی نشاندہی فرمائی
ہے، ہم کو انہیں سب طرق کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ایسا راستہ نکالنا ہے جو امت مسلمہ کے
لیے تسہیل کی صورت ہو سکے۔

سوال:- شہادت رویت ہلال کے باب میں فون، فیکس اور خط وغیرہ کو جمہور
علمائے اہل سنت نے نا قابل اعتبار گردانا ہے، ان چیزوں کو معتبر مان کر شہادت کا اعلان
کہاں تک درست ہے؟

مفتی عبدالواجد قادری:- نہیں ٹیلی فون، تار، فیکس، انٹرنیٹ یا دوسرے ذرائع ابلاغ
جو جدید آلات پر مشتمل ہیں اگر ان کے ذریعے کوئی خبر آتی ہے تو وہ خبر ہے اور خبر پر شہادت کا
اطلاق نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس کے مطابق فیصلہ کرنا شرعی اصولوں کے خلاف ہے۔

سوال:- اور جو ایسا کرے ان کے ساتھ کیا سلوک برتا جائے؟

مفتی عبدالواجد قادری:- ان کا اجتماعی طور پر بائیکاٹ کیا جائے۔

سوال:- ادارۂ شرعیہ بہار کے آپ ایک عرصے تک صدر مفتی رہے، مگر اب
وہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، اس کا علمی تشخص اور فکری وقار بحال کرنے کے لیے ہمیں
کیا کرنا چاہیے؟

مفتی عبدالواجد قادری:- ادارۂ شرعیہ کی جو تنظیمیں ہیں اور حضرت علامہ ارشد القادری
علیہ الرحمہ نے اسے چلانے کے لیے جو ضابطے ترتیب دیے ہیں اگر اس ضابطے پر عمل کیا
جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا پھر پہلے والا وقار بحال ہو سکتا ہے، لیکن اس وقت میرے خیال
میں ان ضابطوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے، جن ضابطوں کو حضرت علامہ نے ادارۂ شرعیہ
کے لیے تحریر فرمایا تھا، کیونکہ ان کے اغراض و مقاصد پر صحیح طور پر اگر عمل کیا جاتا تو آج جو
بے راہ روی سامنے آرہی ہے وہ نہیں ہوتی، اگر اس پر آج بھی عمل کیا جائے تو ادارۂ شرعیہ کا
وقار بحال ہو سکتا ہے اور اس وقت ضرورت ہے کہ ادارۂ شرعیہ کی جتنی بھی تنظیمیں ہیں اس کو
کھنگالا جائے اور اس کی ذمہ داری دو تنظیموں پر آتی ہے، ایک تو وہ جس کو علامہ نے بورڈ آف
ٹرسٹیز میں شامل کیا ہے اور حضرت علامہ کے بنائے ہوئے دستور کے مطابق یہ بورڈ آف

ٹرسٹیز غیر متبدل ہے اور اس بورڈ کو اختیار کلی حاصل ہے، جن میں

(۱) علامہ ارشد القادری	چیئرمین	جمشید پور
(۲) مولانا اختر رضا خاں ازہری	ممبر	بریلی
(۳) مولانا عبدالحفیظ صاحب	ممبر	مبارکپور
(۴) مولانا خواجہ مظفر حسین	ممبر	پورنیہ
(۵) عبدالواجد قادری	ممبر	دربھنگہ
(۶) مفتی انیس عالم	ممبر	سیوان
(۷) الحاج منے میاں	ممبر	پٹنہ
(۸) محمد سعید	ممبر	رانچی
(۹) ایاز محمود	ممبر	بنارس

شامل ہیں۔ ان حضرات کو بھی اس پر کچھ سوچنے کی ضرورت ہے اور مجلس منتظمہ کو بھی،
اگر یہ دونوں تنظیمیں آپس میں اکٹھی ہو کر ادارے کے لیے کوئی نئی تنظیم تشکیل دیتے ہیں تو ہم
کو امید ہے کہ ادارہ پھر صحیح راستے پر آجائے گا۔ کچھ افراد اس میں ایسے ہیں جن سے
ادارے کا جو فائدہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہو رہا ہے، ادارہ جس مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا وہ
مقصد فوت ہوتا نظر آرہا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے، یا تو ان کی اصلاح کی جائے یا ان کا
اخراج کیا جائے۔

سوال:- حضرت علامہ کے وصال کے بعد کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ بہار و
جھارکھنڈ کے علما اور دانشوران کو صوبائی سطح پر شرعی مسائل کے حل کے لیے اپنے درمیان ایک
باصلاحیت قاضی کا انتخاب کر لینا چاہیے تاکہ اہل سنت کا وقار بحال رہے؟

مفتی عبدالواجد قادری:- ادارۂ شرعیہ میں اس طرح کی دو تین مجلس کا قیام ہو چکا ہے
اور صوبہ کے علما اس میں اپنی پوری توانائی کے ساتھ شریک بھی ہو چکے ہیں، لیکن غالباً وہ اسی
لیے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں کیونکہ ان میں کوئی ایسا حکم کی حیثیت سے نہیں تھا جس کو فیصلہ
کرنے کی صلاحیت ہو اور جس کا فیصلہ تمام علما کے سامنے قابل قبول ہو، ایسی کوئی شخصیت

نہیں تھی اس لیے وہ مجلسیں کارآمد ثابت نہیں ہوئیں تو میرا ابھی یہ خیال ہے کہ ایسے ایک شخص کو چنا جائے جس کا حکم اور جس کا فیصلہ تمام علما کے لیے کم از کم بہار اور جھارکھنڈ کے علما کے لیے قابل قبول ہو، ایسا ہونے میں یقیناً فائدہ ہے اور ایسا ہونا چاہیے۔

سوال:- آخر میں آپ ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟

مفتی عبدالواجد قادری :- یہ تو علامہ کے دیرینہ خواب کی تعبیر ہے اور اس سے یقیناً علامہ کی روح خوش ہو رہی ہوگی کہ علامہ نے اس کو ہمیشہ چلانے کی کوشش کی، ہم جام نور کو جام کوثر کے وقت سے جانتے ہیں کہ جام کوثر جب جام نور بنا اس کا ماحول بھی ہمارے سامنے ہے، کس طریقے سے کلکتہ میں حضرت رہتے تھے اور انہوں نے اس کا اجراء کیا، بہر حال ہم نے تو اب تک اس کو صحیح طریقے سے دیکھا نہیں ہے پھر بھی سرسری طور پر جو مضامین اور عناوین دیکھنے میں آئے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان شاء اللہ یہ رسالہ ایک کامیاب رسالہ ہوگا اور سنیوں کا ترجمان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قائم ودائم رکھے۔□□□

(شمارہ جنوری ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی

لیکچرار: شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

ہندوستان کے مذہبی افق پر نمایاں علمی شخصیات کی اگر فہرست بنائی جائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا نام ابتدائی سطور میں آئے گا - استشراق اور تصوف کے باصلاحیت عالم، اردو، ہندی اور عربی زبان کے ماہر، انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور ماریشش میں بولنے والی زبان کریول Creol سے واقف وآشنا، فقہ وحدیث کے سمندر کے غواص، متوازن اور تعمیری فکر کے مالک ڈاکٹر علیم اشرف ۱۹۶۲ء میں خانوادۂ اشرفیہ کی جائسی شاخ میں پیدا ہوئے، مقامی ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، جامع اشرف کچھوچھہ اور فیض الرسول براؤں سے دینیات کی تکمیل کی، مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی سے لمبے عرصے تک استفادہ کیا، پھر لکھنو یونیورسٹی سے گریجویشن اور ایم اے کیا، عربی زبان وادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لیبیا پہنچے جہاں پھر سے گریجویشن اور ایم اے کیا اور گولڈ میڈلسٹ قرار پائے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے " **أثر اللغة العربية فى اللغة الأردية ووجوهها الأدبية المختلفة**" کے عنوان سے اپنی تھیسس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اب تک ۲۰۰/ سے زیادہ علمی وتحقیقی مضامین ملک و بیرون ملک کے سرکردہ رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں، تصنیفات وتالیفات اور تراجم کی تعداد دو درجن سے متجاوز ہے، جن میں '**فصول فى التاريخ بالهند العربية الاسلاميه**' فرانسیسی زبان میں نصف درجن کتابیں جن میں ۶۰۰ صفحات پر مشتمل 'التذکیر'، شیخ محمد علوی مالکی کی کتاب '**حول الاحتفال بالمولد الشريف**' پر ۳۰۰/ صفحات کا حاشیہ، اقبال اور تصوف کے موضوع پر تنقیدی کتاب 'جائزہ' اہم ترین ہے۔

سوال:-تحقیق کا کام ایک خشک اور پرمشقت کام ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ اس راہ پرخار پر چلنے کے لیے آپ کو کس چیز نے آمادہ کیا اور آپ اس کے لیے کیسے تیار ہوئے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:-تحقیق کی طرف آمادہ کرنے والی چیز بنیادی طور پر ہمارے بزرگوں کا وہ علمی ورثہ ہے جو ہمیں اپنے اسلاف سے ملا ہے، جو سائنٹفک تحقیق کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، آج بھی تحقیق میں جو باتیں ہمیں پڑھائی جاتی ہیں وہ ہمارے اسلاف کے یہاں نہایت واضح انداز میں موجود ہیں، مغرب نے ہمیں کوئی نئی چیز نہیں دی ہے، اس کا حال ویسے ہی ہے ''**ھٰذہ بدعتنا ردت الینا**'' (یہ ہماری ہی ایجاد ہے جسے ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے) یہ ہماری چیز تھی جو اسپین کے ذریعہ یورپ پہنچی اور پھر نئے سرے سے ہم نے یورپ سے حاصل کیا، حقیقت میں یہ ہمارے اسلاف کا ورثہ ہے-

سوال:-اس صحافتی اور میڈیائی دور میں جب کہ تحریر وتقریر میں بے پناہ عجلت اور جلد بازی پیدا ہوگئی ہے، آپ تحقیق کی صورت حال کیسی پاتے ہیں؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:-بنیادی طور پر میڈیا نے زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کیا ہے، تصنیف وتالیف اور تحقیق وریسرچ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں، لیکن میڈیا کا کام عارضی اور فوری ہوتا ہے جب کہ تحقیق وتصنیف کا کام دائمی ہوتا ہے، جو میڈیا کے مقاصد سے بالکل مختلف ہے، میڈیا ہمارے احساسات وجذبات کو مخاطب کرتا ہے جب کہ تحقیق وتصنیف کا تخاطب عقل وشعور سے ہوتا ہے، آج ہم اپنے تحقیقی عمل میں میڈیا کو استعمال کرسکتے ہیں، اس لیے میڈیا سے واقفیت نہایت ضروری ہے-

سوال:-عالمی منظرنامے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا آپ بتائیں گے کہ جماعتی سطح پر کن موضوعات پر تحقیق وریسرچ ازبس لازمی ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:-یہ ایک بڑی اہم بات ہے اور جام نور اپنے صحافتی انداز میں جماعتی مسائل کی طرف برابر توجہ دلا رہا ہے اور مسلسل جام نور ان موضوعات کو اٹھا رہا ہے، یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ موجودہ عالمی منظرنامے میں اپنی ارتقاء کے لیے یا جماعت کی ترقی

کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟ بنیادی طور پر ہماری جماعت کی تشکیل دوسری جماعتوں سے بالکل مختلف ہے، ہماری جماعت نے ابتداءً ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک ایسا نظام برپا کیا جس کے نتیجے میں اہل سنت وجماعت کی گاڑی ایک ایسے انجن سے چلتی تھی جس کا نام خانقاہ تھا، اور وہ انجن جس Fuel (ایندھن) سے چلتا تھا اس کا نام تھا تصوف، چونکہ گاڑی بڑی تھی، سواد اعظم کی نمائندگی کرتی تھی اس لیے ہر انجمن کے بس کی بات نہیں تھی کہ اس گاڑی کو کھینچ سکے، چنانچہ امت نے یہ طے کیا کہ خانقاہیں اس گاڑی کو لے کر چلیں، مگر خود خانقاہوں کے یہ انجن تصوف کے تیل سے چلتے تھے، بدقسمتی سے ان خانقاہی انجنوں کے پاس وہ تیل ختم ہوگیا اور ظاہر ہے جب تیل ختم ہوگا تو انجن رک جائے گا اور جب انجن رکے گا تو پوری گاڑی رک جائے گی-آج بنیادی طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس انجن کو تیل فراہم کریں تا کہ وہ گاڑی متحرک ہوسکے اور اس کو متحرک کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ہم معاشرے میں خانقاہی نظام برپا کریں، خانقاہی نظام سے مراد آج کی خانقاہوں کے رسوم نہیں ہیں، بلکہ اصل خانقاہی نظام اس سے بالکل مختلف ہے، یہ میرا تصوف کے مطالعے کا ماحصل ہے، ممکن ہے موجودہ خانقاہی نظام میں بعض رسوم شریعت کے مخالف ہوں اور اکثر شریعت کے مطابق، لیکن اسے خانقاہیت کا نام نہیں دیا جاسکتا، ہاں! اسے ہم درگاہیت ضرور کہہ سکتے ہیں، کسی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:''خانقاہیں حال سے چلتی ہیں، مدارس قال سے اور درگاہیں مال سے'' اور ان تینوں کے مقاصد الگ الگ ہیں، تینوں کے ذرائع الگ الگ ہیں اور تینوں کے نتائج بھی الگ الگ ہیں، اس لیے آج ضرورت ہے کہ جماعت کے احیاء کے لیے اصل خانقاہی نظام کو برپا کیا جائے-آج ہمارے سامنے جو سب سے اہم مسئلہ ہے وہ ہے غیر مزکیٰ نفوس کا تزکیہ، نفس کے تزکیہ کے بغیر کسی فرد کی صلاح کی امید نہیں کی جاسکتی اور معاشرہ مجموعہ ہے افراد کا، افراد غیر صالح ہوں گے تو معاشرہ بھی غیر صالح ہوگا، آپ چاہتے ہیں کہ معاشرہ صالح بنیاد پر استوار ہو تو ضروری ہے کہ افراد بھی صالح ہوں اور افراد کی صالحیت کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے، انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایسا نفس رکھتا ہے جو **امارۃ بالسوء** ہے، جو

برائی کی طرف لے جانے والا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ جس نے ہمارے نفس کو جب اس صفت سے متصف کیا ہے تو وہی اس کا حل بھی بتانے والا ہے۔"**قد افلح من زکّٰھا**" جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ یقینی طور پر فلاح پائے گا، لہٰذا تزکیہ نفس ضروری ہے، آج ہماری خانقاہوں میں حقیقی تصوف کی روح پھونکنے کی ضرورت ہے، تاکہ وہاں حال کا ماحول پیدا ہو، تزکیہ نفس کا ماحول پیدا ہو، جب یہ خانقاہیں متحرک وفعال ہوں گی اور اپنے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں گی تو پوری جماعت بھی ترقی کی طرف گامزن ہوگی۔

سوال:۔آپ نے جماعتی سسٹم کو رواں دواں رکھنے کے لیے خانقاہوں کو پرانی روش اختیار کرنے کی بات کہی، جب کہ میرا سوال یہ تھا کہ جماعتی سطح پر وہ کون سے موضوعات ہیں جن پر اس وقت ریسرچ اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔ ہاں! کئی ایک موضوعات ہیں، جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے، ان میں ایک تصوف بھی ہے جس کا ابھی میں نے ذکر کیا کہ ہمارا وہ تزکیہ کرے، مگر خود تصوف غیر مزکّٰی ہو چکا ہے، اس لیے تصوف کا تزکیہ کرنا ضروری ہے تاکہ وہ ہمارا تزکیہ کر سکے اور تصوف میں جو خس وخاشاک آگئے ہیں، تصوف کے نام پر جو غیر تصوف عناصر اس میں آگئے ہیں ان کی تحقیق وتفتیش کر کے علما کو حقیقی تصوف کو جماعت کے سامنے پیش کرنا چاہیے، اس کے علاوہ اور بھی موضوعات ہیں جیسے میڈیا، اس کی اہمیت وافادیت کو سمجھیں، مغرب جس میڈیا کو پیش کر رہا ہے اس میں صرف Consumerism (صارفیت) ہے، مگر اسلامی نقطۂ نظر سے میڈیا کے مقاصد مغرب کے مقاصد سے بالکل مختلف ہیں، ہمارے میڈیا کا جو مقصد ہوتا ہے وہ ہے احقاق حق نہ کہ تجارت، تو اسلامی نقطۂ نظر سے ہم میڈیا کو استعمال کریں اور اسے مستحکم کریں۔ ہم اسلام کی پیش کش میں ناکام ہیں، ہم اسلام کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق پیش نہیں کر پا رہے ہیں، چنانچہ مغربی میڈیا جس طرح چاہتا ہے اسلام کو پیش کرتا ہے، جس طرح چاہتا ہے ہم پر الزام لگاتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے ہماری فکر ونظر کی تعبیر کرتا ہے، آج ہمارے علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ مکر کے تین بازو، استشراق، استعمار (نو آبادکاری) اور تبشیر (مشینری) کو سمجھیں اور ان کا پردہ

فاش کریں اور خاص بات یہ ہے کہ انہی کے رنگ وآہنگ میں کریں، مغرب کے خلاف جنگ چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ بنیادی طور پر وہ گم گشتہ راہ ہے، استشراق، استعمار اور تبشیر نے اسلام کی جو تصویر کشی کی ہے اسی کو وہ حق سمجھ رہا ہے، اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ اسلام کی صحیح تصویر اپنے اپنے ذرائع اور وسائل کے حساب سے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

سوال:۔تصوف کو ہم روح اسلام کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، لیکن آج ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اسے منافی اسلام تصور کرتا ہے، آپ کی نظر میں ان کی غلط فہمی کی بنیاد کیا ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔ ان کی غلط فہمیوں کی بنیادیں متعدد ہیں، ایک تو یہ کہ غلط مصادر ومراجع پر بھروسہ کرنا، جس کی وجہ سے ان کو تصوف کے سلسلے میں غلط معلومات ملیں اور ان سے غلط نتائج اخذ کیے، اس کے علاوہ جماعتی تعصب اور عصبیت کی بنیاد پر ان لوگوں نے یہ رویہ اختیار کیا، جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہی تصوف مخالف ہیں، وہ اپنی تربیت کے لحاظ سے ہی تصوف مخالف ہیں اور کچھ وہ ہیں جو تصوف کی موجودہ شکل جس میں خلاف تصوف بہت سی باتیں شامل ہوگئی ہیں، ان کو دیکھ کر تصوف کی مخالفت کرتے ہیں، آج انسان مادیت کے جس دلدل میں ہے اگر تصوف کو اس کے بدل کے طور پر پیش کیا جائے تو پوری امید ہے کہ اسلام کو تصوف کے حوالے سے زبردست کامیابی ملے گی۔

سوال:۔تصوف کی جب بات آتی ہے تو فوراً ہمارے سامنے درگاہی نظام سامنے آجاتا ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ تصوف کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اور مخالفین کے سامنے ہم اسے کس صورت میں پیش کریں؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔تصوف کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، پروفیسر نکلسن نے اپنی کتاب میں اس کی ہزاروں تعریفیں کی ہیں، صوفیہ نے بھی اس کی بہت سی تعریفیں کی ہیں، ویسے تصوف کی مختصر ممکنہ تعریف "تزکیہ نفس" سے کی جاسکتی ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم اسی حیثیت سے تصوف کا تعارف کرائیں جو نفس کو مزکّٰی کرتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچاتا ہے، جس کے نتیجے میں بہت سے فوائد اور ثمرات حاصل ہوتے

ہیں، جیسے کشف، کرامت، الہام وغیرہ، اگر ہم اس کے لیے یہ کہیں کہ یہ نفس کے مجاہدے سے لے کر مشاہدے تک کا ایک سفر ہے تو بجا ہوگا اور اس کے علاوہ تصوف کے نام پر ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ لوازمات تصوف تو ہو سکتے ہیں مگر نفس تصوف نہیں۔

سوال:۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو مخالفین تصوف بھی بڑے کروفر کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ویسے شاہ صاحب کے افکار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ ایک صوفی گھر میں پیدا ہوئے، ایک صاحب حال صوفی کے صاحبزادے تھے، جن کی صحبت میں ان کی نشو ونما اور تربیت ہوئی، جس کی وجہ سے عملی طور پر وہ تصوف کو برتتے تھے، نظریاتی طور پر انہوں نے تصوف سے متعلق بے شمار کتابیں لکھیں ہیں، ہندوستان کی تاریخ کا بڑا المیہ ہے کہ شاہ صاحب جیسے صوفی کو مخالف تصوف کے طور پر پیش کیا گیا، جس سے امت کو بڑا نقصان ہوا اور اس باطل نظریے کی بنیاد پر ہی بہت سے لوگ تصوف سے دور ہو گئے، جس کا وبال ان تمام لوگوں کے سروں پر جائے گا جنہوں نے شاہ صاحب کے تعلق سے ایسی بے بنیاد باتیں لکھیں۔ وہ خالص صوفی تھے، چنانچہ وہ خود اپنی کتاب تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ ''انسان کو چاہیے کہ وہ عالم ہو مگر ایسا عالم جس کو اہل تصوف کی صحبت رہی ہو اور انسان کو صوفی ہونا چاہیے مگر ایسا صوفی جس کی کتاب وسنت پر نگاہ ہو'' تو یہ دیکھیے انہوں نے کتنی متوازن فکر پیش کی ہے۔

سوال:۔لیکن آج دیکھا جاتا ہے کہ مخالفین اہل سنت، نے شاہ صاحب کو اپنا لیا ہے، وہ ان پر تحقیق وریسرچ کر رہے ہیں اور انہیں اپنا ہمنوا بنا کر پیش کر رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔تصوف کی بنیادی تعلیمات میں ایک اہم تعلیم ''خود نگری'' ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ کس نے کیا کیا، یہ دیکھنے کے بجائے ہم یہ دیکھیں کہ ہم نے کیا کیا؟ سب سے پہلے ہم نے شاہ صاحب کو چھوڑا، تو دوسروں نے پکڑا، اگر ہم شاہ صاحب کو پھر پکڑ لیں گے تو دوسرے چھوڑ دیں گے۔

سوال:۔تحریک استشراق کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس کے پس منظر پر آپ کچھ

روشنی ڈالیں گے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔ اہل مغرب کی مشرق سے متعلق علمی نگارشات و تحقیقات کو ہم استشراق کہتے ہیں اور استشراق کا لفظی معنی طلب شرق ہے، لیکن واضح رہے کہ علمی طور پر استشراق کی یہ تعریف مشرق ومغرب کی جغرافیائی بنیادوں پر نہیں ہے، بلکہ صحیح معنوں میں عیسائی مغرب کی غیر عیسائی مشرق کے بارے میں جو تحقیقات ہیں انہیں استشراق کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مراقش جو روس کے مقابلے میں زیادہ مغرب میں واقع ہے، لیکن روس کا محقق جو مراقش کے بارے میں تحقیقات کرے وہ مستشرق کہلاتا ہے لیکن مراقش کا محقق مغرب میں ہونے کے باوجود مستشرق نہیں کہلائے گا، اس لیے استشراق کا تعلق جغرافیائی سے زیادہ علمی وفکری بنیادوں پر ہے۔

استشراق کی دنیا بڑی وسیع ہے اور اس کی کئی نوعیتیں ہیں، سارے مستشرقین کو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی غرض وغایت اسلام دشمنی ہے، بلکہ بعض ایسے ہیں جو صرف حصول زر کے لیے اس میدان میں اترتے ہیں، بعض محض علم وتحقیق کے لیے اس میدان میں آتے ہیں اس لیے ہم آئے دن یہ سنتے ہیں کہ فلاں مستشرق اسلام لے آیا اور اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا، ظاہر ہے یہ وہ مستشرق ہیں جو خالص علمی تحقیق کے لیے اس میدان میں آئے مگر کچھ وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جنہوں نے چرچ کے منصوبے کے تحت اسلام کو سبوتاژ کرنے اور اسلام میں تحریف کرنے کے لیے تحقیق وریسرچ کا راستہ اختیار کیا، ہم جس استشراق کی مخالفت کرتے ہیں اس کا تعلق اسی حصے سے ہے۔

سوال:۔تحریک استشراق کی موجودہ صورت حال کیا ہے، موجودہ مستشرقین کے اہداف اور طریق کار کیا ہیں؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:۔۱۹۷۸ء میں استشراق کی جو بین الاقوامی کانفرنس ہوئی اس میں یہ اعلان کیا گیا کہ استشراق کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور اب مستشرقین علوم انسانی کے نام پر کام کریں گے، حقیقت میں یہ لباس تبدیل کرنے جیسا عمل تھا، حقیقت میں آج بھی مستشرقین کا وہی مشن ہے جن کے بڑے امریکہ کی وزارت خارجہ میں بیٹھ کر کام کر رہے

ہیں اور آج بھی مستشرقین اسلامی ممالک کے بارے میں مغرب کی پالیسیاں وضع کرنے میں مصروف ہیں، البتہ رسمی طور پر استشراق کے دور کا خاتمہ ہو گیا لیکن عملی طور پر آج بھی استشراق کا عمل جاری ہے۔

بنیادی طور پر استشراق کا پرانا ہدف جسے ہم عہد استعمار کی یادگار کہتے ہیں وہ ہے فَرِّقْ وَتَسُدْ Devide and rule (پھوٹ ڈالو حکومت کرو) مگر آج علوم اسلامی کے نام پر استشراق نئے لباس میں ہمارے سامنے آیا ہے، اس نے تمام قدیم اصطلاحوں اور پالیسیوں کو چھوڑ کر نئی اصطلاحیں اور پالیسیاں ایجاد کی ہیں، جن میں سرفہرست ہے، لَفِّقْ وَ تَسُدْ Fabricate and rule من گھڑت باتیں سامنے لائیے، مسلمانوں کو مشتعل کیجیے اور حکومت کریے۔

پہلے استشراق نہایت سنجیدہ و علمی ہوا کرتا تھا، اگرچہ اسلام کی مخالفت کرتا تھا مگر آج کا استشراق نہایت غیر سنجیدہ اور مشتعل کرنے والا ہے، جو غیر تہذیبی اور غیر ثقافتی طور پر اسلام پر حملے کر رہا ہے، جس کے نمونے آئے دن ہم میڈیا کے ذریعے ملاحظہ کرتے ہیں، اسی استشراق کا ایک نمونہ حالیہ دنوں کارٹون کی اشاعت ہے، جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو مشتعل کرتے ہیں اور مسلمان بھی نہایت جذباتی طور پر برانگیختہ ہو جاتا ہے، جو استشراق کے مقاصد کی تکمیل ہے، جنہیں میڈیا کے ذریعہ پیش کر کے اسلام مخالف فضا ہموار کی جاتی ہے۔

سوال :- مستشرقین کی ریشہ دوانیوں کے ردعمل میں علمائے اسلام نے جو کچھ کیا ہے آپ کی نظر میں اس کی کیا اہمیت ہے؟ کیا اس تعلق سے نئے علمائے تحقیق کو آپ کچھ مشورے دیں گے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- بنیادی طور پر کسی بھی جماعت کی ترقی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف اس کے پاس بڑے بڑے اچھے مشائخ اور مفتیان کرام ہیں، جماعت کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس بہت اچھے قلم کار ہوں، بہت اچھے صحافی ہوں، بہت اچھے رسالے اور اخبارات ہوں، محققین ہوں اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین ہوں، چونکہ جماعت کی ترقی فرد کی ترقی سے نہیں ہوتی، بلکہ اجتماعی کوششوں کے نتیجے میں ہوتی

ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ جماعت میں کچھ ایسے لوگ ہوں جو استشراق کے سلسلے میں تخصص رکھتے ہوں، بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ **انفجار معرفی** (Explosion of knowledge) کا زمانہ ہے، آج علم کی شاخیں اتنی بڑھ گئی ہیں اور ان میں اتنی وسعت آ گئی ہے کہ اب یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی ذہین وفطین ہو ہر فن کا ماہر بن سکے، اب تخصص کا زمانہ ہے، اس لیے آج ضروری یہ ہے کہ مختلف علوم وفنون میں الگ الگ متخصص پیدا کیے جائیں اور باہمی مشورے سے جماعت کے اہداف متعین کیے جائیں، آج ہمارے سامنے جو سب سے بڑے خطرات ہیں وہ ہیں استشراق، استعمار اور تبشیر اس لیے ان کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔

سوال :- ہم نے آپ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ مستشرقین کی ریشہ دوانیوں کے ردعمل میں علمائے اسلام نے جو کچھ کیا ہے، آپ کی نظر میں اس کی کیا حیثیت ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- جن لوگوں نے اس سلسلے میں کام کیا ہے اللہ تعالی انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں اب تک کوئی خاص کام نہیں ہو سکا ہے، سچی بات یہ ہے کہ ہماری جو درسگاہیں، خانقاہیں اور درگاہیں ہیں ان کے اہداف میں یہ شامل ہی نہیں ہے کہ استشراق، استعمار اور تبشیر بھی کوئی چیز ہے، جن کے خلاف ہمیں کچھ کرنا چاہیے، اس لیے ضروری ہے کہ جماعت ایسے افراد پیدا کرے جو ان کے اہداف کو ناکام کر کے دنیا کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں۔

سوال :- پچھلی دو صدیوں سے اسلام مسلسل زوال آمادہ ہے، مسلمانوں کا گراف تیزی سے گر رہا ہے، کیا آپ بتائیں گے کہ اس زوال کے بنیادی اسباب کیا ہیں اور ان سے نجات کے راستے کیا ہیں؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کس مفہوم میں زوال کا لفظ استعمال کیا ہے، اس کا استعمال مختلف پس منظر میں کیا جاتا ہے، بعض حضرات زوال کو خلافت عثمانی کے بعد کے دور سے جوڑتے ہیں، کچھ خلافت عباسی کے زوال سے جوڑتے ہیں اور کچھ سقوط بغداد کو اسلام کے زوال کی بنیاد سمجھتے ہیں، میری رائے بھی یہی ہے کہ سقوط

بغداد سے ہی زوال کی ابتداء ہوئی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے بعد بھی ہم نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں، جہاں تک زوال کی بات ہے، قرآن نے کہا ہے کہ زمین پر ان ہی قوموں کو استقرار حاصل ہوتا ہے، جو نفع بخش ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، وہ آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے، تو زبدہ (جھاگ) بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے اور جو نفع پہنچانے والا ہوتا ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے، خواہ موتی کی شکل میں ہو یا میٹھے پانی کی شکل میں- جب تک ہم نفع بخش رہے، سائنس، سماجی اور دینی علوم میں ہم دنیا کی قیادت کر رہے تھے اور دنیا ہم سے فیض حاصل کر رہی تھی اس لیے ہم ترقی کی طرف گامزن تھے، لیکن جب ہم دنیا کے لیے نفع بخش نہیں رہے تو ہمارا زوال شروع ہو گیا، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دنیا کے لیے پھر نفع بخش بنیں اور اسلام کی اس حقیقی روح کو اپنائیں کہ اسلام سب کے لیے رحمت ہے، سب کے لیے نفع بخش ہے، ان شاء اللہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی-

سوال :- بعض حدیثوں میں اس قسم کی باتیں آئی ہیں کہ امت جب جہاد کرنا چھوڑ دے گی تو وہ ذلیل وخوار ہوگی، اس کی روشنی میں آج کے حالات میں جہاد کی اہمیت و ضرورت اور طریق کار کے بارے میں کوئی آپ کی رائے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- جہاد، اجتہاد اور مجاہدہ یہ تینوں ایک ہی مادے سے مشتق ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کبھی بھی ان تینوں سے بے نیاز نہیں رہی ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ جہاد قیامت تک کے لیے رہے گا، اور جہاد کے بغیر کسی صالح امت پر مشتمل معاشرے کے وجود کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا، یہ تو ہوسکتا ہے کہ ہم رہبانیت کی طرف بڑھ جائیں اور ترک دنیا اختیار کرلیں لیکن جہاد کے بغیر عدل اور توازن جو اسلام کے بنیادی مقاصد ہیں، قائم نہیں ہوسکتے، تو عدل وتوازن قائم کرنے کے لیے پہلے جہاد، پھر اجتہاد اور نفس کے تزکیہ کے لیے مجاہدہ ان تینوں کی ہمیں ضرورت ہے-

سوال :- لیکن آج جہاد کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- جہاد اور فساد میں فرق میرے اوپر بالکل واضح ہے، آج

بعض انتہا پسند جو کر رہے ہیں، معصوموں کا خون بہانا اور بے گناہوں کو نشانہ بنانا، ان کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ انتہا پسند وہ ہیں جن کی نگاہ میں دنیا میں صرف چند ہزار لوگ مسلمان ہیں جو ان کی فکر سے ہم آہنگ ہیں، باقی سب واجب القتل ہیں، یہاں نام لیے بغیر بات واضح نہیں ہوگی، یہ سلفی جماعت ہے، جو شدت پسند جماعت ہے، ان کے یہاں پچھلے ۵۰/سالوں سے شدت پسندی کی ہوڑ لگی ہوئی ہے، اس ایک جماعت سے دوسری جماعت نکلتی ہے جو اس سے زیادہ شدت پسند ہوتی ہے اس کا آخری نمونہ القاعدہ اور **التکفیر والھجرہ** ہے، ان کی نگاہ میں ساری دنیا کافر اور واجب القتل ہے، ان کی سرگرمیوں کو ہم جہاد نہیں سمجھتے ہیں، جہاد کا مطلب ہے وہ جدوجہد جو صالح بنیادوں پر اسلام کے نظام کو نافذ کرنے کے لیے کی جائے اور عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے کی جائے، کسی اپنے خاص نظریے کو دنیا پر مسلط کرنے کے لیے نہ ہو-

سوال :- فلسطینی مجاہدین کے بارے میں کیا کہیں گے، چونکہ کہ وہ اپنی جدوجہد کے جواز میں یہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- ان کی بات سو فیصد درست ہے، مغرب کی اجتماعی قوتوں نے زبردستی اسرائیل کا خنجر اسلام کے سینے میں بھونک رکھا ہے، جہاں تک فلسطینیوں کی جدوجہد ہے وہ انصاف پر مبنی ہے اور دنیا کے تمام مسلمان ان کے ساتھ ہیں-

سوال :- آپ عربی زبان وادب پر بھی کافی عبور رکھتے ہیں، جس کے حصول کے لیے آپ نے عرب میں کافی عرصہ گزارا ہے، اس تناظر میں آپ بتائیں کہ مدارس اسلامیہ میں نصاب کے نام پر جو زبان وادب کی تدریس ہو رہی ہے، وہ طلبہ کے لیے کتنی مفید ہے؟ کیا اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی :- نصاب تعلیم ایک ایسے پودے کی طرح ہے، جس کے لیے معتدل آب وہوا، مخصوص زمین اور مخصوص جغرافیائی کیفیت ضروری ہوتی ہے، جس طرح ہر پودے کو زمین کے ہر حصے میں اگایا نہیں جاسکتا اور ہر پودے کو ہر موسم میں لگایا نہیں جاسکتا ویسے ہی نصاب تعلیم بھی ہے، یعنی ایک زمانے کا نصاب تعلیم دوسرے زمانے

کے لیے کار آمد نہیں ہوسکتا، ایک ملک کا نصاب تعلیم دوسرے ملک کے لیے مفید نہیں ہوسکتا، لیکن جو ہماری بنیادی ضرورتیں ہیں وہ زمان ومکان کی قیود سے ماوراہیں وہ کسی بھی تاریخی و جغرافیائی تبدیلی سے نہیں بدلنے والی ہیں، ان کی ہمیں ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں ضرورت ہے اور وہ ہے کتاب وسنت کی تعلیم۔ لیکن کتاب وسنت کی تعلیم دینے کے جو وسائل ہیں وہ ہمیشہ تبدیل ہوتے رہیں گے، اس کے لیے دنیا کی تمام قومیں ہر زمانے میں اپنے نصاب کی تجدید کاری کا کام کرتی رہتی ہیں، ہمارا بھی کبھی نصاب تعلیم تھا جس کے اپنے مقاصد تھے، جو مغلیہ دور میں نہایت مناسب تھے، اور اس عہد کے لحاظ سے Update تھے، کیوں کہ اس نصاب کے ذریعے ہم دینی و دنیوی دونوں طرح کے افراد تیار کرتے تھے، اسی نصاب کو پڑھ کر لوگ حکومت میں عہدے حاصل کرتے تھے اور اسی نصاب کے ذریعہ لوگ مفتی، امام اور محدث بنتے تھے، آج کے زمانے میں ہمارے مقاصد دوسرے ہوگئے ہیں، جب ہمارے مقاصد بدل گئے ہیں تو ظاہر ہے پھر ہمیں اپنے نصاب میں بھی خاطر خواہ تبدیلی لانی چاہیے، ہمارے نصاب کی سب سے دشوار بات یہ ہے کہ ہم ایک ایسی زبان میں کتابیں پڑھا رہے ہیں جس زبان سے ہمارے طلبہ اچھی طرح واقف نہیں اور دنیا بھر کے ماہرین تعلیم کا اس پر اتفاق ہے کہ جب تک جس زبان کو طالب علم اچھی طرح سے نہیں جانتا ہے اس کے ذریعہ نصاب پر وہ عبور حاصل نہیں کرسکتا، لہٰذا سب سے پہلے تو یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنا نصاب عربی اساس (Arabic based) بنائیں، تاکہ بین الاقوامی تناظر میں ہم زیادہ موثر کردار ادا کرسکیں، عربی زبان کے سلسلے میں میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے، جسے میں نے ملک و بیرون ملک میں تعلیم اور بعد میں تدریس کے دوران حاصل کیا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم ایک یا دو سال عملی طور پر پہلے طالب علم کو زبان سکھائیں اور ان عناصر کو ہم نصاب سے ہٹا دیں، جس کی آج کوئی معنویت ہی نہیں ہے۔

سوال:- جام نور کی موجودہ اشاعت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی اصلاح کے لیے کوئی مشورہ یا پیغام؟

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی:- جام نور میرے اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کے خوابوں

کی تعبیر ہے، ہم دوسری جماعتوں کے اچھے رسائل دیکھتے تھے تو ہمارے اندر بھی یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش ہمارے یہاں سے بھی ایسے رسالے نکلتے جن کا انداز روایتی کی بجائے عصری ہوتا، جام نور بر وقت آیا اور اس نے اس ضرورت کو پورا کیا، اس نے بہت جلدی کامیابی کے منازل طے کیے، اس سے جہاں مدیر کی اعلیٰ صلاحیتوں اور ادارے کی محنت و کاوش کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جماعت کو ایسے رسالے کا انتظار تھا- جام نور بے حد خوبیوں کا حامل ہے، لیکن جام نور نے جس خلا کو پر کیا ہے یہ صحافت کی ایک خاص سطح تھی، اس کی ضرورت تھی، لیکن اس سے ہٹ کر آج ایک ایسے رسالے کی بھی سخت ضرورت ہے جو خالص تحقیقی معیار کا ہو، جس میں صرف ریسرچ پیپر شائع ہوں، اللہ تعالیٰ نے جیسے آپ کو اس کام کی توفیق دی، ہمیں امید ہے کہ اس دوسرے کام کے لیے بھی دوسرے فرد کو یا گروپ کو اس کی توفیق دے گا، میں جام نور کے تمام عملہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ اتنا خوبصورت، جامع اور معیاری رسالہ نکال رہے ہیں-□□□

(شمارہ اپریل ۲۰۰۶ء)

شاہ عمار احمد احمدی عرف نیر میاں

سجادہ نشین: خانقاہ شیخ العالم، ردولی، ضلع بارہ بنکی (یوپی)

شیخ العالم حضرت شاہ احمد عبدالحق مخدوم ردولوی کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ہے، آپ کے ہاتھ سے سلسلہ چشتیہ صابریہ کا جو فروغ ہوا ہے اس کی وجہ سے آپ کو مجدد سلسلۂ صابریہ کہا جاتا ہے، آپ کی خانقاہ کل بھی مرجع خلائق تھی اور آج بھی وہاں سے دینی، علمی اور روحانی فیض جاری ہے- اس ساڑھے چھ سو سال قدیم روحانی مرکز کے موجودہ صاحب سجادہ حضرت شاہ عمار احمد احمدی عرف نیر میاں صاحب اپنے عظیم المرتبت اسلاف کی روحانی وراثتوں کی امانت کا حق ادا کر رہے ہیں، آپ کی دینی تعلیم آپ کے محترم نانا حضرت شاہ احمد الفاروقی صاحب کی خدمت میں اپنے نانیہال الٰہ باد میں ہوئی، الٰہ باد یونیورسٹی سے آپ نے پہلے گریجویشن اور پھر وہیں سے پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی، اپنے جدامجد حضرت شاہ آفاق احمد چشتی صابری علیہ الرحمہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے اوراجازت وخلافت سے نوازے گئے -۱۹۸۱ء میں جد محترم کے وصال کے بعد مسند سجادگی کو رونق بخشی، آپ نے اپنی صلاحیتوں، جدوجہد اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر خانقاہ شیخ العالم میں تعلیمی، تعمیری، اصلاحی اور اشاعتی منصوبوں کے تحت بہت کم عرصے میں عظیم خدمات انجام دی ہیں، جدوجہد، عزم محکم، عمل پیہم اور خانقاہ کے احیا وتجدید کے سلسلے میں آپ کی ذات دوسرے مشائخ کے لیے نمونہ ہے- آپ نے خانقاہ کو علم دین سے جوڑنے اور شریعت وطریقت کے جامع افراد پیدا کرنے کے لیے ۲۰۰۰ء میں چشتیہ ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی اور اس کے تحت مدرسہ چشتیہ صابریہ فیض القرآن کی داغ بیل ڈالی- ۲۰۰۱ء اس کا نام جامعہ چشتیہ رکھا گیا اور اسے باقاعدہ دارالعلوم کی شکل دے دی گئی، جس کا سفر جاری ہے-

سوال:- حضرت شیخ العالم اور خانقاہ شیخ العالم کے تاریخی پس منظر پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

نیر میاں:- قطب العارفین حضرت شیخ العالم شیخ احمد عبدالحق ردولوی علیہ الرحمہ کا شمار برصغیر کے صف اول کے اولیائے کرام میں ہوتا ہے- آپ کا اسم گرامی احمد اور پیر و مرشد کا عطا کردہ لقب عبدالحق ہے- والد کا نام شیخ محمد عمر علیہ الرحمہ اور دادا کا نام شیخ داؤد تھا- ہلاکو خاں کے قتل وغارت کے سبب آپ کے جدامجد بلخ سے کچھ لوگوں کی معیت میں ہندوستان تشریف لائے تھے- یہ زمانہ سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت کا تھا-

حضرت شیخ العالم کی ولادت باسعادت ۷۲۹ھ میں ہوئی- بائیس واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت امیر المومنین فاروق اعظم سے ملتا ہے-

اس عہد میں ممالک اسلامیہ سے جو نامور خاندان اور ممتاز افراد ہندوستان تشریف لائے تھے ان کے ذریعہ معاش کے لیے سلاطین کی طرف سے جاگیریں نذ کی جاتی تھیں- چنانچہ آپ کے جدامجد حضرت شیخ داؤ علیہ الرحمہ کو ردولی کی جاگیر ملی تو آپ یہیں قیام پذیر ہو گئے- حضرت داؤد علیہ الرحمہ کو رفعت وکمال اور تقویٰ و پرہیز گاری میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا- آپ کے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام نامی اسم گرامی عمر تھا- آپ بھی اپنے والد بزرگ وار کی طرح بڑے صاحب کمال اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے- آپ کے دو صاحبزادے تھے- ایک کا نام شیخ تقی الدین اور دوسرے صاحبزادے کا نام شیخ احمد تھا- یہی شیخ احمد آگے چل کر شیخ العالم کے نام سے مشہور ہوئے- ہمیشہ آپ جمال حق کے مشاہدے میں رہتے- آپ پر استغراق کا عالم طاری رہتا تھا- استغراق اور محویت کا یہ عالم تھا کہ خادم تین مرتبہ حق حق حق کی آواز بلند کرتے تب کہیں جا کر آپ آنکھ کھولتے -

(مرأۃ الاسرار صفحہ ۱۱۳۹، از عبدالرحمٰن چشتی)

استغراق اور محویت کے اس عالم میں بھی آپ کی نماز پنج گانہ تکبیر اولیٰ کے ساتھ فوت نہیں ہوئی- آپ فرمایا کرتے تھے کہ منصور بچہ تھا ضبط نہ کر سکا خدا کے راز کو فاش کر بیٹھا، اس

وقت ایسے لوگ ہیں کہ سمندر پی جاتے ہیں اور ڈکار نہیں لیتے (اخبار الاخیار، ص۱۲، از حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی) آپ کے پیرومرشد کبیرالاولیاء نے خرقۂ خلافت سونپتے وقت فرمایا تھا کہ بابا عبدالحق حیات وممات میں تمہارے کمالات کی انتہا نہیں دیکھتا- (انوار العیون، ص۱۷۲، از حضرت عبدالقدوس گنگوہی علیہ الرحمہ)

حضرت شیخ عبدالرحمٰن چشتی مرأۃ الاسرار کے صفحہ ۱۱۳۹ پر رقم طراز ہیں کہ سلسلہ چشتیہ میں خواجہ ابومحمد چشتی اور خواجہ بختیار کاکی کے بعد دائرۂ وجود مطلق اور نقطۂ ذات حقیقۃ الحق کے مشاہدہ کا جو دوامی استغراق وتحیر مخدوم عبدالحق کو حاصل تھا، اس سے زیادہ کسی ولی کو میسر نہ ہوا- حاصل کلام یہ ہے کہ فیضان صابر پاک کو عرب وعجم کے گوشہ گوشہ تک پہنچانے میں حضرت شیخ العالم علیہ الرحمہ کو اولیت حاصل ہے اور آپ کے توسل وتوسط سے بے شمار افراد کو سلسلۂ صابریہ اور اس کے انوار وتجلیات سے فیض یاب ہونے کا موقع نصیب ہوا اور آج بھی آپ کی خانقاہ پورے اہتمام کے ساتھ اس سلسلے کو فروغ دے رہی ہے-

۱۵ر جمادی الثانی ۸۳۸ھ ایک سو آٹھ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا- آپ اپنی خانقاہ سے متصل مدفون ہوئے- آپ کا مزار پاک اب بھی فیض بخش عام ہے-

سوال:- شیخ العالم حضرت شاہ احمد عبدالحق صاحبِ توشہ ردولوی علیہ الرحمہ کو مجدد سلسلۂ صابریہ کہا جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

نیر میاں:- ردولی شریف میں حضرت شیخ العالم مخدوم احمد عبدالحق علیہ الرحمہ کی قائم کردہ خانقاہ سلسلۂ صابریہ میں منفرد اور مرکزی حیثیت رکھتی ہے- ہندوستان کے مشہور مؤرخ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی مشہور کتاب 'تاریخ مشائخ چشت' جلد اول میں تحریر کیا ہے کہ چشتیہ صابریہ سلسلہ کا سب سے پہلا مرکز جس کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں ردولی ضلع فیض آباد (موجودہ بارہ بنکی) ہے، شیخ احمد عبدالحق نے اپنے زمانے میں وہاں اپنی خانقاہ قائم کی تھی جب سلسلۂ چشتیہ کا مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا- نظامیہ سلسلے کے بزرگ گجرات، دکن، مالوہ، بنگال وغیرہ میں اپنی خانقاہیں قائم کر رہے تھے- دہلی اور اس کے ارد گرد کا تمام علاقہ چشتی سلسلے کے بزرگوں سے تقریباً خالی ہو چکا تھا- شیخ احمد عبدالحق نے

سیاحت کے دوران نظامی سلسلے کی بعض خانقاہوں کو دیکھا تھا اور حالات کا جائزہ لیا تھا- ردولی میں ان کی خانقاہ رشد وہدایت کا بڑا اہم مرکز بن گئی اور شمالی ہندوستان کے لوگ کثرت سے حاضر ہونے لگے (تاریخ مشائخ چشت، ص۱۷۲) پوری دنیا میں سلسلہ چشتیہ صابریہ کی ۹۰ فیصد شاخیں آپ ہی کے خرمن فیض وروحانیت کی خوشہ چیں ہیں- آپ کی ذات بابرکات اور آپ کے خلفاء ومریدین اور آپ کی بارگاہ سے فیض یافتہ اولیائے کاملین کے ذریعہ سلسلہ چشتیہ صابریہ نے پوری دنیا میں فروغ پایا- یہی وجہ ہے کہ آپ مجدد سلسلہ صابریہ کہلائے-

سوال:- خانوادۂ فرنگی محل کے اجلۂ علما وفضلا خانقاہ شیخ العالم میں نیازمندانہ حاضر ہوا کرتے تھے ان روابط پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

نیر میاں:- فرنگی محل کے علما کا قدیمی روحانی تعلق اس خانقاہ سے رہا ہے- حضرت شیخ عبدالرزاق بانسوی علیہ الرحمہ سے سلسلہ قادریہ فرنگی محل کے علما کو پہنچا اور شاہ محبّ اللہ محدث الہ آبادی شیخ کبیر چشتی صابری کے خلیفہ حضرت شیخ صدرالدین گھاسی سے سلسلۂ صابریہ کی اجازت وخلافت فرنگی محل کے علما کو پہنچی، اس کے بعد فرنگی محل کے علما کا روحانی تعلق خانوادۂ شیخ العالم سے قوی ہوتا گیا- حضرت شاہ التفات احمد ان کے صاحبزادے شاہ حیات احمد اور ان کے بیٹے شاہ آفاق احمد علیہ الرحمۃ والرضوان کی پوری تعلیم فرنگی محل میں ہوئی اور ہر سال بلاناغہ یہ سارے فرنگی محل کے علما وفضلا عرس شیخ العالم میں پابندی سے حاضر ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے- یہ روحانی تعلق رشتہ داری میں بھی تبدیل ہوا- جب حضرت شاہ حیات احمد صاحب کی صاحبزادی کا نکاح حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے صاحبزادے حضرت مولانا جمال میاں کے ساتھ ہوا، لہٰذا جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں یہ قدیم روحانی تعلق اور مضبوط ہو کر رشتہ داری کی شکل میں بھی سامنے آیا-

سوال:- تحریک ندوہ کے زمانے میں اس وقت کے سجادہ نشین حضرت شاہ التفات احمد صاحب علیہ الرحمہ نے علمائے بدایوں کے ساتھ جو خدمات انجام دی تھیں ان کے تعلق

سے آپ کیا کہیں گے؟

نیر میاں:-تحریک ندوہ میں شروع میں اکثر سنی علما متحرک تھے لیکن جیسے جیسے اس تحریک میں بد مذہبوں کی شرکت بڑھتی گئی ویسے ویسے ایک ایک کر کے تمام سنی علما الگ ہوتے گئے خود میرے نانا حضرت مولانا شاہ محمد حسین فاروقی علیہ الرحمہ جو ندوہ کے بانیوں میں رہے ہیں، انہیں سب وجوہات کے سبب تحریک ندوہ سے الگ ہو گئے تھے- چونکہ حضرت شاہ التفات احمد صاحب فرنگی محل میں حضرت مولانا شاہ محمد حسین فاروقی کے شاگرد تھے اور تمام تحریکوں میں ان کے ساتھ رہے ہیں لہٰذا تحریک ندوہ کے سلسلے میں ان کا بھی وہی موقف تھا جو حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر بدایونی کی قیادت میں دوسرے سنی علما بالخصوص حافظ بخاری مولانا شاہ عبدالصمد چشتی سہسوانی صدر مجلس علماے اہل سنت کا تھا، علماے بدایوں سے چونکہ اس خانقاہ کا قدیمی تعلق رہا ہے لہٰذا حضرت شاہ التفات احمد صاحب نے تحریک ندوہ کے سلسلے میں بدایوں کے علما کے موقف کا بھرپور تعاون کیا-

سوال:-آج خانقاہ شیخ العالم سے دعوت وتبلیغ، اصلاح وارشاد، نشر واشاعت اور تعلیمی میدانوں میں کیا خدمات انجام دی جا رہی ہیں؟

نیر میاں:-خانقاہ حضرت شیخ العالم دعوت وتبلیغ اصلاح معاشرہ، نشر واشاعت اور تعلیمی میدان میں پوری طرح سرگرم عمل ہے-خواجہ بندہ نواز گلبرگہ شریف کی خانقاہ کے طرز پر یہاں ۲۰۰۰ء میں چشتیہ ایجوکیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا-شروع میں اس سوسائٹی نے کافی چھوٹے پیمانے پر اپنے تعلیمی اور تصنیفی سفر کا آغاز کیا اور ایک چھوٹے سے مدرسہ چشتیہ صابریہ فیض القرآن کی داغ بیل ڈالی- ایک سال کے بعد یعنی ۲۰۰۱ء کے عرس شیخ العالم میں اس کا نام جامعہ چشتیہ رکھا گیا اور اسے باقاعدہ دارالعلوم کی شکل دی گئی- اس وقت یہ ادارہ مختلف شعبہ جات پر مشتمل ہے-جس کی تفصیل حسب ذیل ہے-

شعبۂ حفظ: چار درسگاہوں پر مشتمل ہے جس میں ۸۰/ سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں-

شعبۂ قرأت: اس میں بروایت امام حفص علیہ الرحمہ جید قراء کے ذریعے مقررہ تین سالہ نصاب کی تکمیل کرائی جاتی ہے- اس کے علاوہ شعبۂ درس نظامیہ میں ۵۰ سے زیادہ

مہمانان رسول زیر تعلیم ہیں- فی الحال یہاں جماعت رابعہ تک تعلیم ہو رہی ہے جو انشاء اللہ جلد ہی دورۂ حدیث تک ہو جائے گی-۲۰۰۹ء کے عرس شیخ العالم میں باقاعدہ خانقاہ حضرت شیخ العالم میں دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا ہے، جس میں ایک مستند عالم دین مفتی کا تقرر کیا گیا ہے تاکہ لوگ اپنے شرعی مسائل کے حل کے لیے خانقاہ کی طرف رجوع کر سکیں- فی الحال یہ دارالافتاء جامعہ کی لائبریری نظامی دارالمطالعہ میں چل رہا ہے- اس دارالافتاء کا نام صابری دارالافتاء رکھا گیا ہے- جامعہ کے قیام کے وقت سے ہی اس ادارے کا اہم مقصد تھا کہ دینی تعلیم کے فروغ کے علاوہ صابریہ سلسلہ کے اکابر علما و مشائخ کی تصانیف منظر عام پر لائی جائیں- اس ادارے نے ۲۰۰۳ میں اپنے تصنیفی سفر کا آغاز کیا اور حیات شیخ العالم پر ہند و پاک کے نامور علما اور مشائخ کے گراں قدر مقالوں کا مجموعہ بنام 'جہان حق' شائع کیا، جس کی علمی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی- اس کے بعد اس شعبہ نے حضرت مولانا شاہ محمد حسین فاروقی کی تصانیف شائع کرنا شروع کی-۲۰۰۴ء میں " **سبیل السلام**" کی اشاعت ہوئی، اس کے بعد حضرت مولانا کا سفر حج "رحلۃ المسکین" شائع کیا- پھر حضرت مولانا ہی کی تصنیف نیل المطالب اور ضیاء الابصار ایک ساتھ شائع کیں- اس طرح سات سال کی قلیل مدت میں اس نے سات کتابیں منظر عام پر لانے کا شرف حاصل کیا- شعبۂ نشر واشاعت کے آئندہ منصوبہ میں حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تفسیر و ترجمہ قرآن مجید جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس وقت آؤٹ آف پرنٹ ہے شائع کرنے کا عزم کیا ہے- جامعہ چشتیہ روایتی دینی تعلیم کے علاوہ عصری تعلیم کے میدان میں بھی متحرک ہے- چشتیہ ہائر سکنڈری اسکول کے نام سے وہ ایک ادارہ چلاتا ہے، جس میں تقریباً بارہ سو سے زائد طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں- اس ہائر سکنڈری اسکول کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں عصری تعلیم کے ساتھ مسلمان بچوں اور بچیوں کو دینی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے- پچھلے تین سالوں سے اس کے ہائی اسکول کا نتیجہ سو فیصد جا رہا ہے-

یہ بات کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں ہے کہ صالح معاشرہ کی تشکیل میں تعلیم یافتہ بچوں سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ بچیاں مؤثر کردار ادا کرتی ہیں- انہیں وجوہات کے مد نظر مسلم

بچیوں کو دینیات کے ساتھ عصری علوم سے آراستہ کرنے کے لیے چشتیہ گرلس انٹر کالج کے قیام کا ارادہ اراکین جامعہ چشتیہ نے کیا ہے اور اس کے لیے چھ بیگھہ زمین خرید لی گئی ہے، جس کا سنگ بنیاد بھی رکھا جا چکا ہے- اس ادارے کو ڈگری کالج تک لے جانے کا منصوبہ ہے- ان تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ خانقاہ میں ہفتہ وار صابری محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے جو بعد نماز مغرب تا عشاء ہوتی ہے- اس میں حلقۂ ذکر، ختم خواجگان، اصلاحی خطاب اور دعا ہوتی ہے- ہر سال خانقاہ حجاج کرام کی تربیت کے لیے تین روزہ حج ٹریننگ کیمپ کا انعقاد کرتی ہے، اس کے علاوہ مختلف دینی اور اصلاحی پروگرام کا اہتمام وقتاً فوقتاً کیا جاتا ہے-

سوال:- خانقاہوں اور بالخصوص چشتی صوفیہ نے برصغیر ہندوپاک میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں مگر آج خانقاہوں کا یہ کردار معدوم ہوتا جا رہا ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟

نیر میاں:- اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں دعوت دین سے متعلق جو کارنامہ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں نے انجام دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے، اپنے تو اپنے تمام اغیار بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں- برصغیر میں اگر اکابر اولیائے کرام کا شمار کیا جائے اور ان کے تبلیغی ودعوتی کارناموں کا تجزیہ کیا جائے تو سلسلۂ چشتیہ کے شیوخ ہر طرف نمایاں نظر آئیں گے- حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے نامور خلفاء جس میں خصوصیت کے ساتھ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین مسعود شکر گنج اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء، حضرت صابر پاک، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت گیسودراز بندہ نواز، حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی، حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی جیسی اہم ترین شخصیات کی خدمات کا کون انکار کرسکتا ہے، مگر آج حالات کچھ دوسرے ہیں، مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ آج اکثر چشتی خانقاہوں کا علمی دعوتی اور روحانی سفر صرف سہ روزہ، دوروزہ، چہار روزہ تقریبات عرس میں سمٹ کر رہ گیا ہے- سال بھر یہ خانقاہیں خاموش پڑی رہتی ہیں-

اس زوال وانحطاط کے اسباب جو بھی ہیں بہر حال وہ تلخ حقائق ہیں ان سے قطع نظر

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان خانقاہوں کو پھر سے متحرک کیا جائے اور ہمارے بزرگوں نے ان خانقاہوں کا قیام جس عظیم مقصد کے لیے کیا تھا، اس کی جانب دوبارہ نئے انداز میں سفر کا آغاز کیا جائے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے عوام بلا تفریق مذہب وملت کل بھی خانقاہوں سے عقیدت ومحبت اور جذباتی تعلق رکھتے تھے اور آج بھی کسی نہ کسی پہلو سے یہ تعلق برقرار ہے، ہم عوام کے اس جذباتی لگاو کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی رہنمائی کریں ان کے دکھ درد کو بانٹیں، ان کی دینی اور روحانی اصلاح کریں اور خدمت خلق کے ذریعے غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کریں-

سوال:- آج ہمیں خانقاہوں اور تصوف کی کتنی ضرورت ہے؟

نیر میاں:- میں تو یہ کہوں گا کہ ہمیں آج تصوف کی جتنی ضرورت ہے اتنی شائد پچھلی صدیوں میں بھی نہیں تھی، مگر وہ تصوف جس کی بنیاد کتاب وسنت کی تعلیمات اور سلف صالحین واولیاے کاملین کے بنائے ہوئے اصولوں پر ہو، اصلاح احوال، ہدایت وارشاد اور اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے تصوف اور اہل تصوف سے بہتر اور مؤثر طریقہ اب تک پیش نہیں کیا جا سکا، ہمارے نوجوان آج دین کے معاملات میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں ان کو بھی اسی ذریعے دین کے صحیح فہم تک لایا جاسکتا ہے، تصوف اور خانقاہوں کی ایک دوسری اہمیت آج کے بدلے ہوئے حالات میں ظاہر ہوئی ہے کہ آج اسلام کو دنیا بھر میں دہشت گرد مذہب کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، لیکن ساتھ میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی وہ تعبیر وتشریح جو اہل تصوف نے کی ہے وہ آج بھی دنیا کو امن وامان دے سکتی ہے، ہمیں موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور تصوف اور خانقاہوں کو مضبوط کر کے عالمی پیمانے پر ان کو تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنانا چاہیے، ہمارے اکابر صوفیہ نے مخلوق خدا سے محبت، خدمت خلق، اپنے اور بیگانے سب سے یکساں سلوک، پریشان حالوں کے ساتھ ہمدردی اور دردمندی، محبت سب سے نفرت کسی سے نہیں کے اسلامی اصولوں پر جو اسلام کا عملی تعارف پیش کیا تھا آج دنیا کو پھر اسلام کے ایسے ہی تعارف کی ضرورت ہے، اسلام کا یہ عملی تعارف کروانا ہمارے صوفیہ اور مشائخ کا حق بھی ہے اور فرض بھی-

سوال:-آج ایک طبقہ اپنی تحریر وتقریر میں پرانے علمی وروحانی خانوادوں کی خدمات کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر نظر انداز کر رہا ہے، اس پر آپ کیا کہیں گے؟

نیر میاں:-یہ ہماری جماعت کا ایک بڑا المیہ ہے، مگر اس پر دوسروں سے شکوہ شکایت کرنے کی بجائے پرانے علمی اور روحانی خانوادوں کے موجودہ وارثین کو میدان عمل میں آکر اپنے اکابر کی عظیم الشان خدمات کو تحریر وتقریر اور نشر واشاعت کے ذریعے خود ہی منظر عام پر لانا ہوگا:

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

خانقاہ شیخ العالم نے اس سلسلہ میں جو پیش قدمیاں کی ہیں اس کا احوال آپ پیچھے سن ہی چکے ہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ پرانے خانوادوں کی علمی خدمات کو نظر انداز کرنے اور ساری خدمات کا سہرا کسی ایک خاندان کے سر باندھنے سے پرانے خانوادوں اور خانقاہوں کے موجودہ وارثین کی نظر میں خود ان ہی لوگوں کی قدر کم ہو رہی ہے اور ایک عجیب بے یقینی، بے اعتباری اور مخاصمت کی فضا ہموار ہو رہی ہے جو یقیناً جماعتی اتحاد کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے، اس طرز عمل اور روش کو بدلنا چاہیے-

سوال:-آج جماعت اہل سنت میں جو انتشار وافتراق ہے آپ کی نظر میں اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اتحاد واجتماعیت کی راہ میں کیا چیز مانع ہے؟

نیر میاں:-یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے حقیقت پسندانہ جواب سے مزید انتشار وافتراق پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس پر میں خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دوں گا-

سوال:-جام نور کے قارئین اور اس کی مجلس ادارت کو آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

نیر میاں:-جام نور میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور پسند بھی کرتا ہوں، جام نور کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے افکار ونظریات کے کچھ ایسے ''بت'' توڑے ہیں جن کی ''پرستش'' پچھلی کئی دہائیوں سے کی جارہی تھی اور مجھ جیسے کتنے گوشہ نشین فقیر کسی ''بت شکن'' کے ظہور کی دعائیں کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید حوصلہ بخشے اور تیز وتند ہواؤں کے

مقابلے میں ثابت قدم رکھے- خدا نے آپ کو ایک بہترین ٹیم عطا فرمائی ہے، اس کے ساتھ نئے آفاق کی تلاش میں سرگرداں رہیں، خواہ مخواہ کی مخالفت نہ خود مول لیں اور نہ کسی کی اس قسم کی اچھل کود کا نوٹس لیں یہی سلامتی کی راہ ہے اور کامیابی کی کلید بھی-□□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی

جنرل سکریٹری: مرکز برکات رضا ایجوکیشنل اینڈ چیری ٹیبل ٹرسٹ، ممبئی

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی جماعت اہل سنت کے ایک نیک خو، خوش فکر اور جفاکش نوجوان عالم دین ہیں اور بقول پروفیسر مسعود احمد کراچی ''اپنی عمر سے زیادہ کام کر چکے ہیں''۔۱۹۷۰ء میں بائسی پورنیہ بہار میں پیدا ہوئے، پرائمری درجات اور پھر ہائی اسکول کے بعد دینی تعلیم کے لیے مبارک پور آ گئے اور الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے ابتدا تا انتہا دینی تعلیم حاصل کی۔ الجامعۃ الاشرفیہ میں زمانہ قیام کے دوران ہی انٹر میڈیٹ اور گریجویشن بھی کر لیا اور بعد فراغت پٹنہ سے ایم اے اور پھر بہار یونیورسٹی مظفر پور سے امام احمد رضا کی مکتوب نگاری پر پی ایچ ڈی کی۔ پہلے جامعۃ الثقافۃ السنیہ کالی کٹ کیرالا میں کئی سالوں تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے بعد ازاں ممبئی آ گئے جہاں اب تک مقیم ہیں۔ ملاڈ ایجوکیشن اینڈ میڈیکل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام قائم ایک اسکول میں دینیات کی کلاسیز لے رہے ہیں۔ فاؤنڈیشن نے آپ کی بہترین تدریسی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ''بیسٹ ٹیچر ایوارڈ'' سے بھی سرفراز کیا ہے، تدریس سے باقی اوقات مجدد اسلام امام احمد رضا اور دیگر اساطین امت کے افکار و خدمات کی تحقیق و تفتیش میں صرف کرتے ہیں، آپ کی نوک قلم سے مختلف موضوعات پر تقریباً دو درجن کتابیں معرض وجود میں آ چکی ہیں، ''رضویات'' ان کا خاص موضوع ہے اور اسی سے ان کی پہچان ہے۔ ۲۰۰۷ء میں اسی موضوع کے حوالے سے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ''ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی پاکستان'' نے آپ کو گولڈ میڈل سے سرفراز کیا۔ ممبئی کی سرزمین پر ۲۰۰۹ء سے انھوں نے مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی خدمات اور افکار کی اشاعت کے لیے سالانہ کل ہند سیمینار کا آغاز کیا ہے۔

سوال:۔سب سے پہلے یہ بتائیے کہ مکتوبات رضا پر پی ایچ ڈی کرنے کے اعزاز میں ادارہ تحقیقات امام احمد رضا سے ایوارڈ حاصل کر کے آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:۔الحمد للہ! دینی اعتبار سے یہ اعزاز ہے اور اس پر مجھے بے پناہ مسرت اور خوشی ہے۔لیکن روحانی اعتبار سے یہ اعزاز میرے خیال میں کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے، اس لیے کہ دوسرے لوگ ایسے اعزاز اور ایوارڈ کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور وہ اسے سستی شہرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، مختصراً یہ کہ امام احمد رضا انٹرنیشنل کراچی سے جو مجھے ایوارڈ ملا اور وہاں کے اہل علم، دانش ور اور معززین شہر کے مابین مجھے یہ اعزاز دیا گیا، بہر صورت مجھے اچھا اور بہتر لگا۔

سوال:۔دورۂ پاکستان سے واپسی پر فکر رضا کے حوالے سے ہند و پاک کی سرگرمیوں پر کچھ روشنی ڈالیں؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:۔فکر رضا کے حوالے سے سرگرمیوں کی دو جہتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو علمی اور تحقیقی سطح پر اور دوسری ترسیل اور طباعت کے حوالے سے، علمی اور تحقیقی سطح پر جو ہند و پاک میں کام ہوا یا ہو رہا ہے یا ہونے کے امکانات ہیں وہ خوش آئند ہیں، اس حوالے سے ہندوستان سے زیادہ سرگرمی ہمیں پاکستان میں نظر آئی، لیکن ہندوستان ہو کہ پاکستان جہاں کہیں کے بھی محققین امام احمد رضا پر کام کر رہے ہیں، ان میں بیشتر کام موضوعاتی اعتبار سے تنوع کے حامل ہونے کے باوجود ان کے بعض گوشوں میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ امام احمد رضا کی نعت گوئی کے حوالے سے بہت سی تحریریں سامنے آئیں، اس طرف لوگوں کا رجحان رہا۔ اب قدرے اس میں تبدیلی آئی ہے کہ لوگ دوسرے پہلوؤں پر بھی توجہ دے رہے ہیں اور کئی دوسرے موضوعات پر کام ہوا اور ہو رہا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر امجد رضا صاحب کے ذریعے ایک کام بہت اچھا اور عمدہ ہوا، اگر چہ ابھی اس میں اضافے اور اس کی تنقیح کی ضرورت ہے، ان کا عنوان تھا ''امام احمد رضا کی تنقیدیں'' اور میرے خیال سے ابواب یوں تھے، علمی تنقیدیں، فکری تنقیدیں، سیاسی تنقیدیں، شعری

تنقیدیں، تو یہ ایک اچھی پیش رفت تھی، ان کو ڈگری ایوارڈ ہوگئی ہے لیکن ابھی میرے خیال میں اس میں مزید اضافے کی گنجائش باقی ہے، ایک دوسرا کام پاکستان سے بھی ہوا ہے، ڈاکٹر مجید اللہ قادری صاحب نے کنز الایمان کے حوالے سے ”کنز الایمان اور معروف تراجم قرآن“ کے عنوان سے کیا ہے- ان کی تھیسس چھپ چکی ہے اور وہ ایک اچھی کوشش ہے، پاکستان جہلم کے ایک اسکالر نے کام کیا ہے ”الزلال الانقی“ پر، یہ کام بھی علمی اعتبار سے قدر و قیمت اور اہمیت کا حامل ہے، اس پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ایوارڈ ہوئی ہے اور مقالہ بھی غنیمت اور قابل اشاعت ہے- ان تمام کاموں کے مابین اور روایتی موضوعات سے ہٹ کر ایک عنوان فقیر نے انتخاب کیا، وہ امام احمد رضا کی مکتوب نگاری ہے اور اس کام کو ہندوستان و پاکستان میں لوگ بنوع جدید دیکھ رہے ہیں، تو علمی اور تحقیقی سطح پر دانشورانہ سطح پر جو کام ہوا اور ہو رہا ہے، اس میں مزید بہتری لانے اور جدید تکنیکی ذرائع کا استعمال کرنے کی ضرورت ہے اور فکر رضا کے جو مختلف پہلو اور گوشے ہیں، ان میں سے ایسے گوشوں پر کام کیا جائے جو ابھی تشنہ ہیں- رہ گئی دوسری شق، یعنی فکر رضا کی ترسیل و طباعت، تو طباعت کے حوالے سے اس کا سب سے بڑا سرچشمہ تو خود فاضل بریلوی کی زندگی میں بریلی کی سرزمین رہی، بعد میں فکر رضا کا ایک مضبوط اور مستحکم پڑاؤ تحفہ حنفیہ پٹنہ کو قرار دیا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد سنی دارالاشاعت مبارک پور کو بھی فراموش نہیں کرسکتے اس نے فکر رضا کا بنیادی ماخذ فتاویٰ رضویہ کی کئی جلدیں اولاً طباعت کر کے سامنے لائیں اور یہ ہماری قوم اور جماعت پر ایک بہت بڑا احسان ہے- فکر رضا کا تیسرا بڑا مرکز مرکزی مجلس رضا لاہور کو ہم قرار دے سکتے ہیں، اس نے جدید خطوط پر کام کیا، ہندو پاک میں ایک نئے ذہن اور ایک نئے دور کا آغاز کیا، سوتوں کو جگایا اور جاگنے والوں کو تیز رفتار کیا، جدید طرز پر لکھنے والوں کو قریب کیا فکر رضا سے جو لوگ منغض یا برگشتہ تھے ان لوگوں کو اس نے قریب کرنے کی کوشش کی اور لوگوں کا ذہن صاف کیا، اس حوالے سے مرکزی رضا لاہور کا بہت اہم رول ہے- دور حاضر میں ہمارے یہاں المجمع الاسلامی مبارک پور نے بڑا اچھا کام کیا اور جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے طلبہ نے بھی اچھا کام کیا- رضا اکیڈمی ممبئی کی

طباعتی سرگرمیاں بھی قابل قدر ہیں، اس بیچ میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے جو کام کیا ہے وہ نہایت اہم اور جدید حالات کے پیش نظر اہمیت کا حامل ہے- ایسے ہی رضا فاؤنڈیشن لاہور جس نے فتاویٰ رضویہ کو جدید ترتیب وتہذیب و تحقیق کے بعد شائع کیا ہے اسے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک دستاویزی اہمیت کا حامل ہے، اس نے تحقیقات رضا سے استفادہ کو آسان کر دیا ہے، ان تمام ترسیلی وابلاغی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے تو ان میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کا کام سرفہرست رکھنے کے قابل ہے- وہ اس اعتبار سے کہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا نے یہ کوشش کی کہ جدید ذہن کو صاف اور قریب کیا جائے- اس سلسلے میں انہوں نے اردو، عربی، ہندی اور انگریزی کا سہارا لیا اور اس تعلق سے انہوں نے رسائل بھی جاری کیے اور بے شمار کتابیں شائع کیں اور دوسروں تک پھیلایا- ادارۂ تحقیقات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کراچی میں ضرور ہے، لیکن اس کا نیٹ ورک پوری دنیا کے رضوی اسکالر کو محیط ہے- جہاں کوئی قابل کارفرد یا جوہر قابل شخص نظر آیا تو اس کے ارکان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی کوشش سے ہم قوم وملت کو کچھ فائدہ پہنچائیں اور وہ کوشش امام احمد رضا کے حوالے سے ہوتی ہے- میری پی ایچ ڈی کے حوالے سے بھی ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کا ایک نمایاں رول رہا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان و پاکستان میں جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں ادارۂ تحقیقات کی کچھ نہ کچھ رہنمائی شامل ہے- ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے بنگلا دیش میں بھی فکر رضا پر کام کرنے کا آغاز کیا، سید وجاہت رسول قادری صاحب نے وہاں کے کئی اسکالرز کو اس کی طرف متوجہ کیا اور میرے خیال سے وہاں دو پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن ہو چکا ہے- اسی طرح انہوں نے ایک پہل یہ کی کہ جامعۃ الازہر قاہرہ میں علمی رسوخ پیدا کیا، وہاں کا سفر کیا اور وہاں علمی نشست منعقد کی اور امام احمد رضا کے تعلق سے تعارف ہوا، کئی اسکالر اس کی طرف متوجہ ہوئے، ہندو پاک کے اسکالرز تو امام احمد رضا سے متعارف تھے ہی لیکن خاص طور سے عربی اور عصری محققین کا متوجہ ہونا ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کی سفارتی کوششوں کا نتیجہ ہے-

من جملہ یہ کہ ہندوستان و پاکستان میں طباعت وترسیل اور علمی و تحقیقی سطح پر جو کام ہو

رہا ہے قابل اطمینان، امید افزا اور خوش آئند ضرور ہے لیکن ابھی اس میں بہت سی تبدیلیاں اور بہت سے گوشوں پر از سر نو اور خصوصاً جدید ذہن، جدید طریقہ تدوین اور جدید معیار نقد و نظر کو سامنے رکھ کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال:-آپ نے فرمایا کہ ہندوستان کے بالمقابل پاکستان میں فکر رضا پر زیادہ کام ہو رہا ہے، حالاں کہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو پاکستان ایک نیا ملک ہے اور وہ امام احمد رضا کا وطن بھی نہیں ہے، تو اس اعتبار سے زیادہ کام تو ہندوستان میں ہونا چاہیے، آخر اس کے برعکس کیوں ہوا؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:-اس کے جواب میں دو باتیں کہنا چاہوں گا،، ایک تو یہ کہ ایسا ہرگز نہیں کہ پاکستان نے اس حوالے سے پہل کی ہو اور اس کی خدمات کو ہم سر فہرست رکھ سکیں، یہ بنیادی طور پر غلط ہے، اعلیٰ حضرت کے تعلق سے ابتدائی کام ہندوستان سے ہوا ہے، تو بنیادی مواد کے تحفظ اور اسے آگے بڑھانے کی جو کوشش ہوئی ہے، اس کی جڑیں ہندوستان سے ہی وابستہ ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تقسیم کے بعد جن لوگوں نے پاکستان ہجرت کی انہوں نے فکر رضا کے حوالے سے سابقہ کوششوں کو جاری رکھا بلکہ اس میں اور تیز رفتاری پیدا کی اور چوں کہ وہاں کی زبان اردو ہے، سرکاری، دفتری، خانگی، اسکولی، ہر سطح پر اردو ہی اردو رہی، لوگوں کا مزاج اور مذاق اردو سے آشنا ہے اس لیے اردو میں ان کی کارگزاریاں زیادہ رہیں اور اس وجہ سے ہر دن کوئی نہ کوئی کتاب امام احمد رضا کے حوالے سے سامنے آتی رہی۔ رضویات کے حوالے سے ہندو پاک کی علمی سرگرمیوں میں جہاں تک تقابل کی بات ہے تو کمیت کے لحاظ سے پاکستان اس میں بہت آگے ضرور ہے لیکن کیفیت کے لحاظ سے یعنی قدر و قیمت کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی کام زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال:-مکتوبات رضا پر پی ایچ ڈی کی تحریک سے لے کر اس کی تکمیل تک کی مختصر روداد بیان کریں؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:- یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ لوگوں میں اس کا ہوا کھڑا ہے۔

اس لیے میں اولاً یہاں پی ایچ ڈی کے صحیح مفہوم پر تھوڑی روشنی ڈالنا چاہوں گا۔ پی ایچ ڈی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسکالر سب سے پہلے اپنی اہلیت کا جائزہ لے پھر موضوع کا انتخاب کرے، پھر موضوع کے تمام پہلوؤں پر نظر کر کے اس کا جائزہ لے کہ میں اس موضوع کا حق کہاں تک ادا کر پاؤں گا۔ اگر نبھانے کی صلاحیت و اہلیت اسکالر کے اندر ہے تو پھر وہ یک سو ہو کر کام کرنا شروع کر دے لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ پی ایچ ڈی کا مفہوم آج بہت سطحیت لیے ہوئے ہے اور ہمارے اسکالر میں اکثریت ان کی ہے جو موضوع کو نبھا نہیں پاتے محض ان کے سامنے ڈگری کا حصول ہوتا ہے، لہٰذا وہ جیسے پاتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ پہلے کے محققین وہ تھے کہ دوڑ بھاگ اور تلاش و جستجو میں ان کے بال سفید ہو جاتے تھے، کئی کئی جوتے اور چپلیں گھس جاتی تھیں، لیکن اب تو بغیر کسی محنت کے ہی ڈگری ایوارڈ ہو جاتی ہے۔

الجامعۃ الاشرفیہ میں دوران تعلیم ہی میرے اندر یہ آرزو پیدا ہو چکی تھی کہ میں امام احمد رضا کے کسی نامعلوم پہلو پر پی ایچ ڈی کروں گا اور جب میری فراغت ہوئی تو اسی سال میں نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور الحمد اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایم اے میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور پھر ہم نے کام کا آغاز کرنا ہی چاہا کہ میرا تبادلہ ممبئی سے کالی کٹ کیرالا ہو گیا جہاں تین سے چار سال تک یہ کام التوا میں رہا۔ بعدۂ حضرت علامہ ارشد القادری، حضرت علامہ اختر رضا ازہری، حضرت ڈاکٹر امین میاں قبلہ، پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی، حضرت مفتی مطیع الرحمٰن صاحب یہ حضرات کالی کٹ کے دورے پر پہنچے تو ان لوگوں سے میں نے مشورے لیے اور میں نے اپنی مصروفیات بتائیں جن کی وجہ سے میرا کام رک گیا تھا۔ ان بزرگوں نے میری ہمت افزائی کی اور کام شروع کرنے کا حوصلہ دیا، حضرت مفتی مطیع الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ آپ بہار یونیورسٹی مظفر پور سے کام کر سکتے ہیں، آپ کے لیے سہولتیں فراہم ہو جائیں گی اور ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی آپ کی بھرپور رہنمائی کر پائیں گے۔ الغرض میں نے وہاں امام احمد رضا کے مکتوبات پر پی ایچ ڈی کا اندراج کرایا اور Out Door ہم نے کام کا آغاز کر دیا۔ اس وقت میں ہندوستان پاکستان کے مختلف شہر، بلاد، افراد تک پہنچا، میری تلاش و جستجو جاری رہی، مرکز الثقافۃ السنیۃ

کالی کٹ سے جو مجھے تنخواہ ملتی تھی اسے میں مصارف سفر اور کتابوں کے خریدنے اور مواد اکٹھا کرنے پر خرچ کردیتا تھا- چوں کہ میرا گھر الحمدللہ! خوش حال ہے، گھر والوں نے مجھ پر بوجھ نہیں ڈالا کہ پیسے دو، بلکہ انہوں نے میرے کام پر خوشی کا اظہار کیا اور یہ کہا کہ جب تک آپ کا یہ علمی سفر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا، آپ اپنی تنخواہ اسی پر صرف کرتے رہیں-

بہرحال! کام کا آغاز ہوا اور میں نے مواد کی تلاش وجستجو ایک طوفانی انداز میں شروع کردی، کالی کٹ سے سفر کر کے رام پور آنا، رضا لائبریری رام پور، بریلی شریف، خدا بخش لائبریری پٹنہ، آزاد لائبریری علی گڑھ، دہلی پبلک لائبریری دہلی، جامعہ ملیہ کی لائبریری اور جامعہ ہمدرد کی لائبریری میں، میں نے ہفتوں ہفتوں گزارا- ان دنوں میری کوشش یہ رہی کہ مکتوبات رضا کے حوالے سے جو مواد بھی مجھے ملے وہ یا تو Real Source ہو یا Secondry Sources یعنی اولین اور ثانوی مآخذ میں ان چیزوں کو جمع کرتا رہا- جہاں کتابیں ملیں خرید لیں، جہاں Rare Books ملیں وہاں فوٹو کاپی کرالی اور جہاں نوٹ کرنے کا موقع ملا میں نے نوٹ کرلیا- لیکن جو کام کی چیزیں اہل سنت کے تعلق سے، تیرہویں چودہویں صدی کے تعلق سے نظر آئیں، ان چیزوں کو بھی میں ایک ذیلی اور ضمنی اشاریے کے طور پر نوٹ کرتا رہا- پاکستان بھی پہنچا تو میں نے مختلف شخصیتوں سے رابطہ کیا اور لائبریریوں اور تحقیقاتی اداروں میں پہنچ کر میں نے بہت سی چیزیں نکالیں- ہندوستان پاکستان کے سفر کے دوران بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ جن گھروں میں مخطوطات پڑے ہوئے تھے خود گھر والوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ قیمتی مخطوطہ ان کے گھر میں موجود ہے- جب میں نے چھان پھٹک کر ان کے سامنے رکھا اور پڑھ کر سنایا (الحمدللہ! میرے اندر مخطوطات رضا پڑھنے کی شد بد ہوگئی تھی) تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ تبرک ان کے گھر میں تھا لیکن خود انہیں پتہ نہیں تھا-

مواد کی تلاش وجستجو کے لیے تین چار سال سفر کر لینے کے بعد جب میں سارا حاصل شدہ مواد لے کر بیٹھا اور پڑھنا شروع کیا تو پھر موضوعاتی اعتبار سے اشاریہ بنانا شروع کیا، اپنی تحقیق کے حوالے سے پوائنٹ الگ نوٹ کرتا اور دیگر موضوعات کے حوالے سے الگ

نوٹ تیار کیا- اس سلسلے میں حضرت پروفیسر مسعود احمد صاحب کراچی کی کامل رہنمائی نے میری دست گیری کی اور ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی کے ارکان نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی- سید وجاہت رسول قادری بھی برابر خبر گیری کرتے رہے، خاص طور سے میرے نگراں حضرت ڈاکٹر فاروق احمد صدیقی صاحب کو جو کچھ بھی میں لکھ کر بھیجتا تھا وہ اسے سراہتے تھے اور بہت ہی معمولی ترمیم کا مشورہ یا اضافے کا مشورہ دیتے تھے، تقریباً 95% بلکہ 99% مواد Ok کردیتے تھے- Duration کم از کم ۲/سال اور زیادہ سے زیادہ تین سال تھا اور 2002ء میں غالبًا یہ صورت حال پیش آئی کہ اگر کوئی Vacancy نکلتی ہے تو اس کے لیے 2002ء تک کے Ph.d holder ہی Apply کرسکتے ہیں، اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ آپ اپنی تھیسس جمع کردیں- چوں کہ میرا مقصد پی ایچ ڈی کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ امام احمد رضا کے تعلق سے وہ گوشے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے اور جن پر اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی ہے اور وہ مواد جو Unseen & Unprinted ہیں میرے سامنے آئے اور جب میں نے ان کا تجزیہ کیا تو ہندوستان و پاکستان کے اہل قلم علما و دانش وران اور جو حضرات ماہرین رضویات کہلاتے ہیں، ان کی تحریریں دیکھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ جو مواد میرے سامنے ہیں وہ کسی کے سامنے نہیں تو مجھے اندرونی طور پر ایسا لگا کہ ان قیمتی ذخائر کو سمیٹنا چاہیے- تو ہماری پی ایچ ڈی پس پشت پڑ گئی اور دوسرے موضوعات پر کام شروع کردیا- چوں کہ میں کوتاہ قلم کوتاہ علم آدمی ہوں، میری تحریر یا تحقیق کیا اثرات مرتب کرسکتی ہے، جو مواد Real Sources ہیں، پہلے ان کو سامنے آنا چاہیے- اس لیے میں ان کے جمع وتدوین میں مصروف تھا کہ میرے گائیڈ کا مجھے حکم ملا کہ اس تاریخ تک آپ اپنا مقالہ جمع کردیں کیونکہ آپ کے مقالے کے بیشتر ابواب بھی لکھے جاچکے ہیں اور جو کچھ باقی ہیں انہیں پورا کرلیں- مجھے ۲۵/دن یا ۲۸/دن کا وقت دیا گیا تھا- جو کچھ تھیسس میں کمی تھی میں نے دوسرے کام چھوڑ کر اسے پورا کیا اور الحمدللہ! بروقت اسے یونیورسٹی میں جمع کردیا، اور اپنے وقت پر Viva ہوا اور ڈگری مجھے تفویض کردی گئی-

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ پی ایچ ڈی ایک بہانہ تھی، میرا اصل مقصد امام احمد رضا کے نامعلوم گوشوں کو سامنے لانا تھا- الحمدللہ! اس میں مجھے بہت ہی زیادہ کامیابی ملی، اس کامیابی میں جہاں علما دانش وران اور ہمارے احباب کا تعاون شامل حال ہے، وہاں میں اپنی والدۂ محترمہ، والد محترم اور اپنے بھائیوں کی قربانیوں کو بھی فراموش نہیں کر سکتا، جنھوں نے اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بھرپور موقع فراہم کیا-

سوال:-مکتوبات رضا پر پی ایچ ڈی کے علاوہ جہان رضا کی نئی جہات کی بازیافت میں آپ نے اور کیا کیا؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:- پی ایچ ڈی کا مقالہ جس پر مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے وہ تقریباً ۵۰۰ رصفحات پر ہے، اس سے ہٹ کر جو میں نے کام کیا اس میں پہلا یہ ہے کہ خطوط امام احمد رضا کو میں نے از سرنو مرتب اور مدون کیا- اعلیٰ حضرت کے خطوط پر جو ایک کتاب علما کے مابین مشہور ہے وہ ہے ''مکتوبات امام احمد رضا'' مرتبہ مفتی محمود احمد قادری مظفر پوری، اس میں خطوط کی تعداد غالباً ۹۱ ر ہے، یہ تعداد میرے کام کے لیے کافی تھی لیکن چوں کہ میری جستجو مزید در مزید کی طرف تھی اس لیے مقالے کی تیاری کے دوران جو امام احمد رضا کے خطوط و مراسلات دریافت ہوئے انہیں میں نے مدون کیا اور متن خطوط رضا کو ترتیب دی، یہ ۳ رجلدوں پر مشتمل ہے- دو جلدیں ''کلیات مکاتیب رضا'' کے نام سے ہند و پاک سے شائع ہو چکی ہیں اور لوگوں کی نظروں کے سامنے ہیں، تیسری جلد غیر مطبوعہ ہے، اس کے علاوہ میں نے ایک بڑا کام اللہ کے فضل و کرم سے یہ کیا کہ جو خطوط اعلیٰ حضرت کے پاس دوسروں کی طرف سے آئے تھے میں نے انہیں الگ مدون کیا اور اس کا نام ''خطوط مشاہیر بنام امام احمد رضا'' رکھا- اس میں ایک معمولی کسان اور مزدور سے لے کر حکمران وقت اور قانون دان، سیاست دان، علما، مشائخ، خانقاہی افراد، یعنی مسلم معاشرے کے ہر شعبۂ زندگی سے متعلق افراد جو امام احمد رضا سے علمی، روحانی استفادہ کرتے تھے، ان سب کے خطوط اس میں شامل ہیں- تدوین و ترتیب اور کتابت کے بعد ۱۱ر سو صفحات پر مشتمل مسودہ میرے پاس موجود ہے-

ایک کام اس حوالے سے یہ سامنے آیا کہ حیات رضا کی نئی جہتیں جو حیات امام احمد رضا یا سوانح اعلیٰ حضرت وغیرہ میں شامل نہیں تھیں، انہیں ہم نے اپنی تحقیق و دریافت کی بنیاد پر ''حیات رضا کی نئی جہتیں'' کے نام سے تیار کیا- اہل علم کے لیے یہ بالکل نئی چیز ثابت ہوگی ان شاءاللہ الکریم- یہ کتاب علمی پبلیشر لاہور سے چھپ رہی ہے-

ایک کتاب میں نے ''تین تاریخی بحثیں'' کے عنوان سے مرتب کی ہے- ایک علم غیب سے متعلق ہے، ایک مسئلہ اذان ثانی سے متعلق ہے اور ایک ندوۃ العلما کے تعلق سے ہے اور یہ تینوں بحثیں ایسی ہیں جو اہل علم کی نظروں سے اوجھل تھیں- مجھے ان کا مسودہ مل گیا- میں نے تینوں بحثوں پر ایک مقدمہ لکھا جس میں ان بحثوں کا پس منظر پیش کر دیا- میرا یہ مقدمہ الحمدللہ! ایک ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے- لیکن مقدمے کے اندر جو باتیں میں نہیں لکھ سکا ''استدراک'' کے عنوان سے کتاب کے آخر میں انہیں شامل کر دیا ہے- یہ کتاب بھی تقریباً ۳۰۰ رصفحات پر مشتمل ہے-

میری ایک کتاب ''ندوۃ العلما - ایک تجزیاتی مطالعہ'' بھی تیار ہے، ندوۃ العلما کے تعلق سے بہت سی غلط فہمیاں رائج ہیں، امام احمد رضا کو مخالف ندوۃ العلما کہا اور گردانا جاتا ہے جب کہ یہ غلط ہے، امام احمد رضا ندوۃ العلما کے مخالف اور معاند نہیں تھے بلکہ موافق اور موید تھے- لیکن ان کو طریق کار سے اختلاف تھا جو لکھنؤ اور کانپور سے اٹھ کر ملکی سطح پر پھیل گیا- ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کے جو مذہبی مراکز تھے جو دینی شخصیتیں تھیں، معاشرہ اسلامی کے جو معززین ہیں ان سب کی حمایت امام احمد رضا کے ساتھ ہے- امام احمد رضا اس محاذ پر تنہا نہیں تھے بلکہ ان سے قد آور شخصیتیں بھی ہمیں ان کے ساتھ نظر آتی ہیں- جیسے حضرت شاہ ابو الحسین احمد نوری رحمۃ اللہ علیہ اور اس زمانے کے اعلیٰ حضرت شاہ تاج الفحول علامہ عبدالقادر بدایونی علیہ الرحمہ اور شاہ حافظ بخاری سید عبدالصمد پھپھوندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ-

تو اس معاملے میں امام احمد رضا نے باریک بینی سے تنقیدی جائزہ لیا اور اس کے طریقہ کار سے اختلاف کیا، جس کے بعد پورا برصغیر ان کے ساتھ ہو گیا تو ندوۃ العلما نے اخلاص کا راستہ چھوڑ کر ایک طرح سے نفسانیت کا راستہ اختیار کر لیا، جس کے دھوکے میں سید

محمد علی مونگیری صاحب بھی آ گئے تھے تو اس کتاب کے اندران تمام گوشوں پر میں نے گفتگو کی ہے اور ایسے حقائق پیش کیے ہیں جو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں-

میری ایک کتاب ''تقریظات امام احمد رضا'' کے نام سے ہے- اس میں اعلیٰ حضرت کی تقریباً ۲۸؍ تقریظات ہیں جو مختلف کتابوں اور رسائل پر آپ نے لکھی ہیں، یہ تقریظات کچھ مطبوعہ اور کچھ مخطوطہ شکل میں مجھ کو مل گئی ہیں، میں نے سب کو جمع کر دیا ہے، میں نے اس میں ترتیب کا نہج یہ رکھا ہے کہ سب سے پہلے میں نے صاحب کتاب کا تعارف لکھا ہے پھر کتاب کا تعارف لکھا ہے، پھر امام احمد رضا کی تقریظ کی اہمیت اور خصوصیت دکھائی ہے- شروع میں ہم نے مقدمہ کے اندر تقریظ نگاری کی روایت اور اس کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی ہے-

ایک کتاب میں نے ''اسفار امام احمد رضا'' کے نام سے تیار کی ہے- اس میں امام احمد رضا کے محدود اسفار کا تذکرہ ہے، اسفار کے معمولات، مشاغل اور قلمی وتصنیفی مصروفیتیں، وظائف، نماز کا اہتمام، احباب سے ملنے جلنے کا انداز اور معمولی یا غیر معمولی، موافقانہ یا مخالفانہ، خوش گوار و ناخوش گوار جو واقعات اسفار کے دوران گزرے ہیں، میں نے ان سب کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے-

اعلیٰ حضرت کے خلفاء کی تعداد ۳۲۵؍ سے زائد ہے، اس موضوع پر جناب صادق منصوری اور ڈاکٹر مجید اللہ قادری کے اشتراک سے ایک کتاب ''خلفائے اعلیٰ حضرت'' کے نام سے ہمارے سامنے ہے، ایک پروفیسر مسعود احمد صاحب کی ''خلفائے امام احمد رضا'' ہے- ایک حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری کی ''خلفاء اعلیٰ حضرت'' ہے- لیکن وہ خلفاء جن کا ذکر ان کتابوں میں نہیں ہو سکا ہے، ہم نے ان کو ''امام احمد رضا کے چند غیر معروف خلفا'' کے نام سے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے- ان میں کئی ایک ایسے ہیں جن کی پہلی دریافت میں نے کی ہے- اس کتاب میں ۱۴؍ غیر معروف خلفاء کا ذکر ہے-

سوال:- ''فکر رضا'' پر آپ پچھلے ایک عشرے سے کام کر رہے ہیں، آپ یہ بتائیں کہ اس کے عوض یا اعزاز میں آپ کو ذاتی طور پر کیا ملا؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:- یہ تو بہت نازک موڑ پر آ گئے- (مسکراتے ہوئے، پھر سنجیدگی کے بعد) دوران تحقیق اس پورے دس بارہ سال کے سفر میں جو میرے سامنے مرحلے آئے یا مشکلیں آئیں، ان تمام مشملات کے باوجود میں نے بھرپور حوصلے سے کام کیا، احباب اور علما کی جانب سے بھی حوصلہ ملا، تعاون ملا، پیار ملا اور کہیں کہیں بے پنا صعوبتوں اور کلفتوں کا سامنا بھی ہوا جن کو میں نے بطیب خاطر برداشت کیا- لیکن بہت سے لوگوں نے تعاون بھی کیا، مواد کی فراہمی میں مدد کی، کتابیں، رسائل اور مسودے عنایت فرمائے- میں تمام حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں- لیکن تصویر کا دوسرا رخ انتہائی کربناک ہے- وہ یہ کہ میں جب کالی کٹ سے الگ ہوا تو کرائے کا مکان لیا اور کام کیا- اس دوران پیش آنے والے تمام ناخوش گوار واقعات کا ذکر کرنا میں مناسب تو نہیں سمجھتا، البتہ چند ایک کی طرف اشارہ کرنا موقع ومحل کے اعتبار سے مناسب ہی معلوم ہوتا ہے- چوں کہ ہمیں ہر جگہ دھتکار و پھٹکار ہی نہیں بہت سی جگہ محبت اور پیار بھی ملا، لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ میرے لیے یہ رہا اور ہے کہ ہم نے اتنا سارا کام یک سوئی اور گوشۂ گمنامی میں بیٹھ کر کیا جس کا لوگوں کو پتہ بھی نہیں تھا، تقریباً یہ سارا کام ہونے کے بعد ہی میں نے پروفیسر مسعود صاحب مدظلہ العالی اور سید وجاہت رسول قادری صاحب کو خط لکھا کہ پی ایچ ڈی کے مقالے کے ساتھ یہ سارے کام ہو چکے ہیں، یہ کام بند کمرے میں ہوا جس کی اطلاع ہم نے اب تک کسی کو نہیں دی ہے- لیکن انہوں نے اپنی صواب دید پر خط کو معارف رضا کراچی کے دسمبر کے شمارے میں شائع کر دیا جس سے لوگوں کو معلوم ہوا کہ غلام جابر نے اتنا کام کیا ہے- اس دوران کوئی شخص میرے سامنے ایسا نہیں آیا جس سے میں اپنی کتابوں کی خرید، دفتری خرچ یا ذاتی مصارف میں اس کی مدد لے سکتا- ذاتی ضرورتوں کے لیے تو مجھے کوئی گلہ نہیں اور نہ یہ بات میرے ضمیر کو گوارہ ہے- اللہ تعالیٰ دست دراز کرنے سے مامون ومحفوظ رکھے- لیکن علمی سطح پر بھی میرے تعاون کے لیے کہیں سے کوئی پیش کش نہیں ہوئی- یہ ایک طرف جہاں تکلیف دہ پہلو ہے، تو دوسری طرف میں اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشی دور سمجھتا ہوں کہ اخلاص وایثار کا اس میں کتنا دخل ہے اور صبر کے ساتھ کتنا کام کر

پا رہا ہوں-

سوال:-گزشتہ نصف صدی سے ہمارے یہاں منظّم یا غیر منظّم طور پر جو کچھ کام ہوا تقریباً سب کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی سے رہا- کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ اس سے ہمارے بہت سے اکابر و اسلاف کی شخصیتیں پردے میں چلی گئیں یا ان سے ہمارا جو جذباتی رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:-تقسیم ہند سے پہلے ہمارے علما سواد اعظم مسلک اہل سنت کے تحفظ میں مکمل طور سے مصروف رہے، اور اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کے تعلق سے جو کتب و رسائل وقت اور حالات کے پیش نظر سامنے آئے ان کی طباعت و ترسیل بھی ہوتی رہی، تقسیم ہند کے دوران اور اس کے بعد ایک عرصے تک ہمارے یہاں ایک طرح کی خموشی، جمود اور تعطل کا دور دورہ رہا- بعد میں چند دہائیوں سے جو کام شروع ہوا ہے وہ واقعی کسی نہ کسی جہت سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے متعلق ہے- دور حاضر میں جو رجحان ہمارے اسکالر اور قلم کاروں کا بنا ہوا ہے وہ تقریباً امام احمد رضا کے حوالے سے کام کرنے کا ہی ہے- اس کا ایک مثبت پہلو تو یہ سامنے آیا کہ امام احمد رضا کی شخصیت جماعت کے سر برآوردہ اور امام و پیشوا کی حیثیت سے سامنے آئی، جیسا کہ خواجہ حسن نظامی نے کہا تھا کہ ''جماعت صوفیہ کی طرف سے امام احمد رضا نے پورے برصغیر میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ تمام صوفیہ کی طرف سے خیر مقدم اور مبارک بادی کے لائق ہے'' تو اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کام ہونا ہی چاہیے تھا- لیکن اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ امام احمد رضا کی معاصر شخصیتیں یا کچھ ما قبل کی شخصیتیں پس منظر میں چلی گئیں- یہ ایک حقیقت ہے جسے ہم فراموش نہیں کر سکتے - اس کا ایک منفی اثر یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے بہت سی خانقاہیں، شخصیتیں اور تحریکیں کبیدہ خاطر ہو گئیں- اس تعلق سے میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں اسکالرز کا مزاج امام احمد رضا کی شخصیت اور کارناموں پر کام کرنے کا بنتا ہے وہیں دوسری شخصیات پر بھی کھل کر اور بھرپور کام ہونا چاہیے- ان تمام خانقاہوں، اداروں اور شخصیتوں کا تعارف بھی دانش ورانہ سطح یعنی یونیورسٹی لیبل پر ہونا چاہیے- اس سے سواد اعظم مستحکم اور منظّم ہوگا-

سوال:-ممبئ کی سرزمین اپنی تمام تر زرخیزی کے باوجود علمی اور تحقیقی کام کے حوالے سے بے فیض واقع ہوئی ہے-لیکن پھر بھی آپ نے اپنے کام کے لیے اسی سرزمین کا انتخاب کیوں کیا اور یہ کہ آپ کا علمی و تحقیقی کام وہاں کس طرح چل رہا ہے؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی:-ممبئ شہر کے کئی رنگ ہیں، کئی چہرے ہیں، یہ شہر بالکل بہروپیا ہے، ایسا نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شہر بالکل مردم خور ہے، علم خور ہے، یا وہ اہل علم و فن کے لیے گورکن ثابت ہوتا ہے، بلکہ وہ علم پرور بھی ہے- چونکہ کہ وہ ایک تجارتی اور مادی شہر ہے، مادیت اور تجارت کا غلبہ ہے- اس حوالے سے وہ متعارف ہے، ہندوستان کی صنعتی و مالی راجدھانی حاصل ہونے کا اسے شرف حاصل ہے-لیکن یہی وہ شہر ہے جس کی رنگینیوں اور شور و شر میں بیٹھ کر قاضی اطہر مبارک پوری غیر مقلد اسکالر نے زبردست کارنامہ انجام دیا، اور وہاں کی رنگینی، وہاں کا شور و شغب، دولت کی فراوانی اور سیٹھ اور ساہوکاروں کی دعوت و ضیافت قاضی اطہر مبارک پوری کی دعوتی و فکری قلمی کاموں کو روک نہیں سکی- تو ایسا نہیں ہے کہ وہ تمام تر زرخیزی کے باوجود علمی و تحقیقی کام کے لیے بالکل ناکارہ ہو-

میں نے کسی منظّم پلاننگ کے تحت ممبئ کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ میں کالی کٹ کیرالا سے ۶ رمہینے کے لیے رخصت پر آیا تھا- مقصد یہ تھا کہ میری تحقیق کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچے- لیکن الحمدللہ! جب میں یہاں آیا تو میرے پاس بہت سی مسجدوں اور مدرسوں سے آفرز آئے لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں دو سالوں تک ملازمت نہیں کر سکتا- میں اپنے حقہ پانی کا انتظام کر کے بیٹھا ہوں، مجھے علمی کام کرنا ہے- اس بیچ میں ملاڈ ایجوکیشن اینڈ میڈیکل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام جونائٹ ہائی اسکول اور جونیر کالج چلتا ہے، اس کی طرف سے پیش کش ہوئی، وہ میری رہائش سے بھی قریب تھی، اور شام کے وقت کلاسیز لینی تھی، اس لیے میں نے بطیب خاطر قبول کیا تو معاشیات کے لیے ہم نے یہ ملازمت اختیار کر لی اور باقی اوقات اپنے علمی و تحقیقی کام کے لیے وقف کر دیا-

ایک بات یہ بتا دوں کہ ممبئ میں جو ذرائع آمدنی ہیں، مثلاً قرآن خوانی، دعا تعویذ، ٹیوشن پڑھانا، سیٹھ حضرات کی مخصوص دعوتوں میں جانا، جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت

کرنا، ان تمام ذرائع کو بے سوچے سمجھے ہم نے اپنے اوپر مسدود کر دیے- اس نقطۂ نظر سے کہ ان سے ہمارے علمی کام کو زک پہنچے گا، اس لیے میں ممبئی میں ہوتے ہوئے بھی ممبئی سے بہت دور ہوں-

سوال :- آج بین الاقوامی سطح پر اہل علم وقلم کا بڑا طبقہ اتحاد امت کے لیے آواز بلند کر رہا ہے اور اس کے لیے کوشاں ہے، لیکن ہمارے یہاں جماعتی اتحاد بھی ہماری کج فہمیوں کی زد میں رہتا ہے، اس تعلق سے آپ کیا کہیں گے، اتحاد کی کیا صورت ہے آپ کے پاس؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی :- ہمارے یہاں جو مشربی اختلافات ہیں، یا جو خانقاہی مشاجرات ہیں، اس تعلق سے بنیادی طور پر یہ بتانا چاہوں گا کہ میں پچھلے پندرہ سالوں کے اختلافات ونزاعات کو دیکھ رہا ہوں، میں اپنے طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان تمام اختلافات کا سرا کہیں نہ کہیں منفعت ومفاد سے ملتا ہے- منفعت ومفاد جہاں خطرے میں پڑتا ہے، وہیں سے اختلاف کا پہلو نکلتا ہے- اس کی بنیادی وجہ اخلاص کا فقدان ہے، مثال کے طور پر یہاں یہ بتانا چاہوں گا کہ ہمارے امام احمد رضا قادری نے حضرت شاہ تاج الفحول عبدالقادر بدایونی کی شان میں قصیدہ لکھا- آپ کا قلبی، ذہنی، روحانی سارا رجحان یہ تھا کہ حضرت تاج الفحول سے بیعت ہوں اور بیعت ہونے کے لیے تشریف بھی لے گئے اور اصرار بھی کیا- لیکن حضرت شاہ عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ اخلاص تھا کہ آپ نے وقت کے سب سے بڑے عالم کو بیعت نہیں کیا اور فرمایا کہ آپ کو وہاں سے بیعت ہونا ہے جہاں سے ہم بیعت ہیں- یہ کمال اخلاص کی مثال ہے، ہمارے مشائخ اور علمائے مستند کے اندر آج اگر اس طرح کا اخلاص اور استغناء پیدا ہو جائے تو یہ اختلاف آن کی آن میں ختم ہو جائے- اختلافات کی وجہ سے ہماری توجہ خارجی حملوں کی طرف نہیں ہو پا رہی ہے اور ہم آپس میں الجھے ہوئے رہ جاتے ہیں- اس سے ایک اور بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ ہم ذاتیات پر اتر کر اپنی خامیوں کو دوسروں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں-

سوال :- ہمارے یہاں علم وتحقیق کا معیار ومزاج کیا ہے اور نئی نسل میں علمی وتحقیقی رجحانات پیدا کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی :- الحمدللہ! ماضی کی بہ نسبت موجودہ عہد میں جو علمی وتحقیقی رفتار ہے وہ قابل اطمینان ہے اور خوش آئند ہے، پہلے جو کچھ ہوا وہ بھی اچھا ہوا اور آج پہلے کے بالمقابل کچھ نہ کچھ بہتری آئی ہے اور جو مزید آگے ہونے والے کام کے امکانات ہیں، اس سلسلے میں اپنے احباب اور نئی نسل تک یہ بات پہنچانے کی کوشش کروں گا کہ ہمارے یہاں قلم کا جو مزاج ہے اور اس میں جو مناظرانہ منہج ہے One sided discuss کا جو طریقہ ہے، جس میں صرف اپنی بات منوانے کی کوشش کی جاتی ہے، تحقیقی دنیا میں یہ انداز مفید نہیں ہے، ہمیں نئی نسل کے اسکالرز کے اندر یہ رجحان پیدا کرنا چاہیے کہ وہ اپنی بات میں معروضیت یا معقولیت لانے کی کوشش کریں اور اپنے مختصر مضمون، یا ریسرچ پیپر یا تھیسس میں ایسے نکات پیش کریں کہ قاری جو درحقیقت جج ہوا کرتا ہے وہ آپ کے دلائل کی روشنی میں صحیح فیصلہ کر سکے- اگر قاری پر اپنی بات تھوپنے کی کوشش کی گئی تو ہماری بات ایک طرح سے رائگاں جائے گی- موقع ومحل کے اعتبار سے کہیں کہیں خود کو مظلوم دکھانے کی بھی کوشش ہونی چاہیے- اس کے علاوہ ہمارے جدید اسکالرز کو فن تدوین کے جو جدید تقاضے ہیں انہیں پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے- اور اپنے موضوع کو اس نداز میں سمیٹنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ بڑے سے بڑا ناقد بھی دلائل کی قوت کے پیش نظر آپ کی بات رد نہ کر سکے بلکہ وہ چیز Applicant ہو، Awaking ہو، جو قاری کے ذہن کو اپیل کر سکے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہوگی جب تحریر میں معقولیت ومعروضیت کے ساتھ مستحکم دلائل کی فراوانی ہوگی-

سوال :- جام نور کے لیے آپ کوئی پیغام دینا پسند کریں گے؟

ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی :- ماہنامہ جام نور کی حیثیت ایک مجلّے کی نہیں بلکہ واقعتاً اس کی حیثیت اور شکل ایک تحریک کی ہے- ماہنامہ جام نور نے اپنی پیدائش سے لے کر اب تک جو کام کیا ہے وہ بلا شبہ قابل قدر ہے اور قابل فخر بھی ہے- اسی لیے جام نور کی صحافت کا اعتراف ہند وپاک کے اہل علم کھلے دل سے کر رہے ہیں-

البتہ جام نور کو مختلف جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ محض یہ ماہنامہ کی شکل میں نہ رہے، ماہنامہ بھی نکلے، اس کا ایک ہفت روزہ بھی ہو، یا کم سے کم پندرہ روزہ ہو-

ہمارے علما کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہیے اور انہیں حسب ضرورت میڈیا کے لیے جواز کی حد متعین کرنی چاہیے تا کہ ہم اپنی آواز دنیا کے ہر گوشے تک پہنچا سکیں- ایک بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم سے مزدوروں اور عوام کا طبقہ وابستہ ضرور ہے لیکن ان کے علاوہ قوم کا ایک بڑا طبقہ جو تاجروں اور صنعت کاروں کا ہے ان کی ہم سے وابستگی مضبوط نہیں ہے اور ان تک ہماری آواز نہیں پہنچ پاتی ہے- ان تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے انگریزی کا سہارا لینا ضروری ہے، اس کی طرف بھی جام نور کو پیش قدمی کرنی چاہیے-□□□

(شمارہ جون ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر غلام زرقانی قادری

سربراہ: حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ، ہیوسٹن، امریکہ

ڈاکٹر غلام زرقانی قادری (پ: ۱۹۶۶ء) جماعت اہل سنت کے ایک ذی علم عالم، روشن خیال دانشور، داعی و خطیب، ادیب و شاعر اور مختلف اداروں کے بانی، مہتمم اور منتظم ہیں- آپ دینی و عصری علوم کے حامل ہیں- اسکول سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد دینی تعلیم کا آغاز کیا، جامعہ فیض العلوم جمشید پور اور دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کے بعد کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (لیبیا) سے اسلامیات کی تکمیل کی، پھر معروف عصری دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ عربی سے ایم-اے اور پی ایچ ڈی کی، آپ کی تھیسس **مساھمة غلام علی آزاد البلگرامی فی اثراء اللغة العربیة** شائع ہو چکی ہے- اس کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی آپ کی متعدد کتابیں آ گئی ہیں- اپنے اشاعتی ادارہ دار الکتاب دہلی سے رئیس القلم علامہ ارشد القادری کی مختلف کتابیں مثلاً اظہار عقیدت، تجلیات رضا، عینی مشاہدات، قرآنی قاعدہ، خطبات استقبالیہ، شخصیات وغیرہ شائع کر چکے ہیں- آپ پچھلے دس سالوں سے امریکہ میں دعوتی و تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں، چند سالوں قبل ''حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ'' کے نام سے ایک دعوتی و تبلیغی ادارہ قائم کیا جس کے تحت امریکہ کی نئی نسل میں بڑے پیمانے پر اسلامی دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کا منصوبہ رکھتے ہیں- علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی اولاد میں قابلیت اور استحقاق کی بنیاد پر حضرت علامہ کی جانشینی ان کے سپرد ہوئی، اس کے بعد علامہ کے قائم کردہ اداروں فیض العلوم جمشید پور، ادارۂ شرعیہ پٹنہ اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی کی ادارت و امارت بھی آپ کے کندھوں پر آ گئی-

سوال:-ایک دہائی سے زائد ہوگیا آپ امریکہ میں بحیثیت مبلغ مقیم ہیں،اس طویل عرصے میں وہاں دعوت وتبلیغ کے حوالے سے کیسا تجربہ رہا؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-اس میں شک نہیں کہ تقریباً دس سال قبل شکاگو سنی مسلم سوسائٹی کی دعوت پر میں امریکہ گیا-مختلف شہروں میں دینی اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے ہیوسٹن پہنچا اور اب تک یہیں ہوں- دیکھئے! امریکی معاشرے میں ہرطرح کی آزادی ہے- ویسے تو بے لگام آزادی کا تصور بڑا بھیانک ہوتا ہے لیکن دعوتی نقطۂ نگاہ سے یہ ہمارے لیے بڑی مفید بھی ہے- وہ یوں کہ جب کوئی شخص مذہب اسلام میں دلچسپی لینے لگتا ہے تو نہ ماں باپ اسے منع کرتے ہیں اور نہ ہی معاشرہ اسے طعن وتشنیع کی نگاہ سے دیکھتا ہے، بلکہ ایسے موقع پر والدین یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے وہ جس طرح اپنے دیگر معاملات کے فیصلے میں آزاد ہے اسی طرح وہ جس مذہب کے زیر سایہ زندگی گزارنا چاہے وہ اسے اختیار کرسکتا ہے- یہی وجہ ہے کہ اسلام کے خلاف یہودی میڈیا کی ہزار زہرافشانیوں کے باوجود آئے دن لوگ اسلام قبول کررہے ہیں- نائن الیون کے حادثے کے بعد اتنی بڑی تعداد میں غیروں نے اسلام سمجھنے کے لیے قرآن حاصل کرنے کی کوشش کی کہ بازار میں قرآن کے نسخوں کی قلت ہوگئی-

سوال:-عموماً ہمارے ہندوپاک کے مبلغین کی دعوتی وتبلیغی سرگرمیاں اپنی کمیونٹی تک محدود ہوتی ہیں،ایسا کیوں؟ وہاں کے غیرمسلموں میں دعوتی کام کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مستحکم پلیٹ فارم کیوں نہیں ہے؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-یہ آپ نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا ہے- میں نے امریکہ میں آنے کے بعد دعوتی سرگرمیوں کا ایک جائزہ لیا اور اسے تین میدانوں میں تقسیم کیا-ایک تو ہم جیسے لوگ جو دینی اساس کے استحکام کے بعد اپنے وطن سے منتقل ہوکر امریکہ پہنچے-دوسرا میدان ان کے بچے جنھوں نے یہیں آنکھیں کھولیں اور تیسرا میدان یہاں کے امریکی غیر مسلم- جہاں تک پہلے میدان کا تعلق ہے تو اس اعتبار سے یہاں خوب کام ہورہا ہے-بس

جغرافیہ بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے ورنہ یہ بھی ہندوپاک کا کوئی شہر لگتا ہے-دوسرے میدان کے اعتبار سے بھی کسی حدتک دینی مراکز میں ہفتہ واری کلاسیں اور یومیہ شام کی کلاسیں ہوتی رہتی ہیں مگر تیسرے میدان کے حوالے سے ہمارے پاس کوئی منظم تحریک نہ تھی-ابتداً ادارہ کی انتظامیہ کے سامنے کئی پروگرام رکھے لیکن جب ان کی کوئی توجہ اس جانب نہ دیکھی تو ہم نے ''حجاز فاؤنڈیشن آف امریکہ'' کی بنیاد ڈالی-اللہ کے فضل وکرم سے سات ایکڑ زمین حاصل کی اور تعمیری منصوبے کے مطابق دعوت وتبلیغ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلی عمارت تیار ہوگئی ہے-تین ہفتہ قبل ہی اس کا افتتاح کیا گیا ہے-ان شاءاللہ عیدالفطر کے بعد ''حجاز اسلامک مشن'' کے نام سے دعوتی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوجائے گا- طے شدہ پروگرام کے تحت مختلف زبانوں کے ماہرین یہاں ہوں گے جو غیرمسلموں کو ان کی زبانوں میں اسلام کی تفہیم میں مدد کریں گے-اسی کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے ہماری یہ درخواست ہوگی کہ وہ جب یہ محسوس کریں کہ کوئی غیرمسلم اسلام میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس سے ہمارا رابطہ کرادیں- ہمارے اسکالر انہیں لٹریچر فراہم کریں گے، ان کے ساتھ میٹنگ کریں گے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچانے میں پوری کوشش کریں گے- یہاں نومسلموں کی ابتدائی تربیت کے لیے بھی ایک شعبہ ہوگا-شروع میں یہ ادارہ آٹھ دس گھنٹے کے لیے کھلے گا لیکن دھیرے دھیرے اسے بڑھا کر چوبیس گھنٹے کا کردیا جائے گا-اس طرح ہماری نئی نسل جو بے جھجک اپنے والدین سے سوالات کرنے کے لیے مشہور ہے، وہ بھی فورا استفادہ کرسکے گی-اس میں ایک شعبہ دینی لائبریری کا بھی ہوگا، جہاں لوگ اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرسکیں گے-اس کے علاوہ گاہے بگاہے ادارہ کے ہال میں غیرمسلموں کے اجتماعات بھی ہوا کریں گے تاکہ اس بہانے ان تک اسلام کا پیغام پہنچ سکے-

سوال:-دیکھا گیا ہے کہ عموماً فکر وقلم کی صلاحیتوں سے لیس علما جب وہاں جاتے ہیں تو ان کی فکری وقلمی توانائیاں ضائع ہوجاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو وہیں تک محدود کرلیتے ہیں،ایسا کیوں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-میں اس بات سے مکمل اتفاق نہیں کرتا-حق یہ ہے کہ وہ علما جو

صرف لگی بندھی ڈیوٹی انجام دینے کے علاوہ کسی فکری، علمی اور تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جذبہ نہیں رکھتے وہ ہندو پاک میں بھی اسی طرح الگ تھلگ رہتے ہیں جس طرح یورپ وامریکہ میں- ہاں وہ جن کی خمیر میں ادھیڑ بن، تحریک وفعالیت اور کچھ کر گزرنے کی لگن ہوتی ہے وہ ہندو پاک کی طرح یہاں بھی مختلف دینی سرگرمیوں میں قابل محسوس حصہ لیتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں-

سوال:-علما اور مذہبی طبقے کے لیے وہاں کی معاشرتی زندگی میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا کتنا مشکل ہے؟ اور وہاں مسلم فیملیز اپنی مذہبی اور مشرقی روایات کی کس قدر حفاظت کر پاتی ہیں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:- یہاں بھی ہندو پاک کی طرح مختلف ذہنیت رکھنے والے مسلمان ہیں-بعض تو اس طرح امریکی معاشرہ میں گھل مل جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ یہیں کے باشندہ ہیں یا کہ اپنے لوگ- دوسری طرف وہ لوگ جو مذہبی ذہنیت کے مالک ہیں وہ یہاں بھی اپنی مشرقی روایات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں- کثرت سے خواتین نقاب پوش نظر آتی ہیں اور مرد چہرے پر داڑھی سجائے ہوئے ہوتے ہیں- یہ تأثر قطعی غلط ہے کہ امریکہ میں اپنے مذہبی اقدار کے تحفظ کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہے- میں کئی ایک لوگوں کو جانتا ہوں جو چہرے پر داڑھی سجائے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں- کئی احباب نے تو مجھے اپنے تجربات بھی بتائے کہ ظہر کی نماز کے لیے جب انہوں نے اپنے امریکی آفیسرز سے گفتگو کی تو انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اجازت دے دی- میرے دوستوں میں سے ایک صاحب ابوذر ہیں جن کی وجہ سے ان کے باس نے خصوصی ہدایت دے رکھی تھی کہ جمعہ کی نماز کے اوقات میں ان کے ساتھ کوئی میٹنگ نہ رکھی جائے- خود میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ مجھے اپنے روایتی لباس میں کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میرے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا ہے- اس سفر میں جب بذریعہ برٹش ائیرویز میں واشنگٹن سے لندن جا رہا تھا تو خود برطانوی ایئر اسٹاف نے میرا لبادہ دیکھ کر کہا کہ کھانے سے فارغ ہولینے دیں اس کے بعد دروازے کے پاس نماز

پڑھ لیجئے گا جب کہ عموماً حفاظتی انتظامات کے پیش نظر دروازے کے پاس زیادہ دیر کھڑے رہنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی-

اسی کے ساتھ یہ تلخ حقیقت بھی ہے کہ بہتر مستقبل کی لالچ میں جو مسلمان امریکہ منتقل ہو رہے ہیں ان کی اکثریت اپنی تہذیب اور اسلامی قدروں کو پس پشت ڈال رہی ہے اور جس طرح مسیحیوں کا دین صرف چرچ اور ان کی مخصوص محفلوں تک محدود ہو گیا ہے، اسی طرح ایسے لوگ جب مسجدوں کا رخ کرتے ہیں تو مسلمان نظر آتے ہیں یا پھر شادی بیاہ، دینی محافل اور ذاتی پروگراموں میں- اس صورت حال سے متأثر ہو کر میں نے ایک نظم لکھی جس کا یہ شعر دیکھیں!

لبادہ ہم نے اپنا اس قدر تبدیل کرڈالا
لباس غیر میں اپنوں کو حیواں دیکھتا ہوں میں
سکھایا جس نے بچوں کو نئی تہذیب کے نغمے
بڑھاپے میں انہیں اکثر پشیماں دیکھتا ہوں میں
بہت تھی آرزو اپنے وطن سے دور رہنے کی
لٹا کر دین وایماں چشم گریاں دیکھتا ہوں میں

سوال:- امریکہ میں تصوف، صوفی شاعری اور صوفی میوزک کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، اس رجحان کے مثبت اور منفی پہلو کیا ہیں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی: - دراصل یہاں کا معاشرہ بڑا ہی سنجیدہ ہے- کسی بھی نئی بات کو سنجیدگی کے ساتھ سننے، سمجھنے اور جاننے کی لگن رگ رگ میں رچی بسی ہوئی ہے- یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ ہر مذہب کو جاننے کی خواہش رکھتے ہیں- طرح طرح کی تہذیب وتمدن کو سمجھنے میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں- کئی بار اتفاق ہوا کہ امریکی میرے سنٹر میں آئے اور صوفی حال (Martial Art) کے فلسفہ کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا- اس میں شک نہیں کہ نائن الیون کے حادثے کے بعد پرتشدد وہابی طرز اسلام کے برخلاف تصوف سے امریکیوں کی دلچسپی خاصی بڑھ گئی ہے- صوفی مشرب میں انہیں رواداری، الفت ومحبت اور انسانیت دوستی

کے جومظاہر ملتے ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتے -ابھی حال ہی میں برطانیہ کے شہزادے نے ترکی کا دورہ کیا تھا اور مولانا رومی علیہ الرحمہ کے حوالے سے اپنے تأثرات میں وضاحت کے ساتھ کہا کہ اہل یورپ کو تعلیمات رومی سے استفادہ کرنا چاہیے-

چونکہ اہل یورپ وامریکہ تصوف کا مطالعہ اپنے دور کے مستند صوفیہ کرام کی تحریروں کے وسیلے سے کر رہے ہیں اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ اس کے کوئی منفی اثرات پڑیں گے بلکہ یہ کہنا حقیقت کی نقاب کشائی ہوگی کہ بسا اوقات طرز تصوف سے ان کی دلچسپی انہیں دین اسلام کے دروازے تک پہنچا دیتی ہے-

سوال :-رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے آپ کو وہاں رہ کر ان کے قائم کردہ اداروں کی سرپرستی ونگرانی کرنے میں دشواریاں پیش نہیں آتیں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-اسے فیضان خداوندی کہیے کہ قائد اہل سنت علیہ الرحمہ کے جذبہ اخلاص ومحبت کی وجہ سے ان کے قائم کردہ اداروں کو مخلص انتظامیہ کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے-یہی وجہ ہے کہ میری غیر موجودگی سے ان اداروں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑ رہی ہے-میں فون کے ذریعہ ہمیشہ رابطے میں رہتا ہوں اور گاہے بگاہے کسی اہم مسئلے پر ٹیلیفونک میٹنگ میں بھی شرکت کر لیتا ہوں-رہا سوال ان کی تحریکوں کا تو کبھی کبھی مجھے واقعی اپنی غیر موجودگی کا احساس ہوتا ہے-یہی وجہ ہے کہ اب میں نے اپنا زیادہ وقت ہندوستان میں گزارنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے-

سوال:-حضرت علامہ علیہ الرحمہ کی قائم کردہ کچھ تنظیمیں اور ادارے پہلے جیسے متحرک نہیں، ان کو فعال بنانے کے لیے آپ کچھ کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی: - اس سوال کا تعلق کسی حد تک سوال گزشتہ سے ہی ہے- جہاں تک دو بڑے اداروں یعنی جامعہ فیض العلوم جمشید پور اور جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی کا تعلق ہے تو وہ بلاشبہ تعلیمی اعتبار سے عروج کی منزلیں طے کر رہے ہیں-تعمیری اعتبار سے بھی حکومت جھارکھنڈ کے مالی تعاون سے فیض العلوم میں تین نئی عمارتیں مکمل ہوچکی

ہیں-یہ اور بات ہے کہ والد گرامی علیہ الرحمہ کی رحلت کے بعد جو خلا پیدا ہوگیا ہے اسے مجھ جیسا ہیچمداں تو کسی طور پورا نہیں کرسکتا-ان شاء اللہ تعالیٰ اب ادارہ شرعیہ کو مستحکم کرنے کا ارادہ ہے-ادارہ شرعیہ دراصل ایک ایسی تحریک کا نام ہے جس کے بینر تلے نونہالان ملت اسلامیہ دینی اقدار کا تحفظ کرتے ہوئے اسلام کی پرکشش شبیہ آنے والی نسلوں تک منتقل کرسکیں-اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس حوالے سے ارباب حل وعقد کا اجتماع کیا جائے گا اور پہلے شمالی ہند کے ہر ضلع میں نمائندہ مرکز کا قیام عمل میں لایا جائے گا-پھر ہر مرکز کو انٹرنیٹ کے ذریعہ مربوط کر دیا جائے گا تاکہ ادارہ شرعیہ کے پلیٹ فارم سے نکلنے والی آواز اطراف وجوانب تک پہنچ سکے-ساتھ ہی ساتھ نوجوانوں کو ادارہ شرعیہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی-

سوال :-حضرت علامہ علیہ الرحمہ کی فکری وقلمی خدمات کی اشاعت کے لیے آپ نے کوئی منصوبہ بنایا ہے؟ اگر ہاں! تو کہاں تک اس کی تکمیل ہوسکی ہے؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-والد گرامی علیہ الرحمہ کی عادت تھی کہ کسی اہم ضرورت کے پیش نظر ہی قلم اٹھایا کرتے تھے-یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک کتاب مکمل کیے بغیر ہی کسی دوسرے پر قلم اٹھا لیا-اس طرح آپ کے وصال کے بعد جب میں نے آپ کے نوٹ بک کے انبار کی ورق گردانی کی تو عقدہ کھلا کہ کئی کتابیں نامکمل رہ گئی ہیں-کہیں کہیں نامکمل مگر بڑے پتے کے نکات بھی ملے-سردست آپ کے مسودات کے یکجا کرنے کا کام دو سالوں سے شروع کر رکھا ہے اور کئی کتابیں منظر عام پر آ بھی گئی ہیں-آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ’’اظہار عقیدت‘‘، فاضل بریلوی پر لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ’’تجلیات رضا‘‘، لالہ زار کے طرز پر لکھی گئی دیگر کہانیوں کا مجموعہ ’’بزبان حکایت‘‘، آپ کے سفر ناموں کا مجموعہ ’’عینی مشاہدات‘‘، اسلاف ملت اسلامیہ کے تذکروں کا مجموعہ ’’شخصیات‘‘ اور تاریخی کانفرنسوں میں پڑھے گئے خطبات استقبالیہ کا مجموعہ ’’خطبات استقبالیہ‘‘ منظر عام پر آچکا ہے جسے قبولیت عام سے مشرف ہونے کا اعزاز بھی مل چکا ہے-عنقریب آپ کے مقالات، مشاہیر کے لکھے ہوئے خطوط، سورہ فاتحہ کی تفسیر اور ڈاکٹر خالد کی لکھی ہوئی کتاب کا جواب جو نامکمل

ہے اسے کسی حدتک قابل مفہوم بنا کر پریس کے حوالے کرنے کا ارادہ ہے-

اخیر میں آپ کی باقی بچی ہوئی غیر مطبوعہ ہر طرح کی تحریروں کو ''کشکول'' کے نام سے شائع کرنے کا ارادہ ہے تا کہ وہ ضائع ہونے سے محفوظ رہ سکیں-آپ کے قلمی اثاثے کے تحفظ کے بعد ایک مبسوط سوانح حیات بھی لکھنے کا پروگرام ہے- دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمت عطا فرمائے-

سوال:-آپ نے مذہبی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کی ہے اور عربی و انگریزی زبان میں بھی آپ کو درک ہے،اس حیثیت سے بتائیں کہ دعوت وتبلیغ کے لیے آج زبان اور عصری تعلیم کا حصول کس قدر ضروری ہے؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-اس سوال کا پہلا حصہ آپ کے حسن ظن سے تعلق رکھتا ہے-اللہ کرے یہ میرے حق میں آپ کی دعا کا لبادہ اوڑھ کر شرف قبولیت سے سرفراز ہوجائے -اس میں دو رائے نہیں کہ انگریزی زبان موجودہ دور کی عالمی زبان ہے اور اب تو ہندو پاک میں بھی ایک بڑے طبقہ کی زبان انگریزی ہوتی جارہی ہے-میں سمجھتا ہوں کہ اگر صرف زبان سیکھی جائے اور تہذیب اپنی مستحکم رکھی جائے تو کسی بھی زبان کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے-ایک داعی اسلام کو حالات کے مطابق اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے عالمی زبان سیکھنی از حد ضروری ہے-اس حوالے سے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نے جو ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے اسے زریں حرفوں میں لکھا جائے گا کہ آج صرف دہلی میں اہل سنت و جماعت کے نوجوان فارغین کی ایک بڑی تعداد عصری جامعات میں حصول تعلیم میں منہمک ہے-فارغین درس نظامیہ کو یونیورسٹیوں کا رخ دکھانے کا سہرا بہر حال جامعہ کو حاصل رہے گا-لیکن معذرت کے ساتھ اپنے نوجوان علما سے کہوں گا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھنے والے دوسرے طلبہ کے ظاہری لبادہ سے مرعوب نہ ہوں بلکہ اپنی تہذیب پر فخر کرتے ہوئے دوسروں کے لیے لائق تقلید بنیں-غور کیجیے اہل یورپ وامریکہ جب ہندوستان آتے ہیں تو کیا وہ اپنی عریاں تہذیب ترک کر دیتے ہیں؟لوگ سڑکوں پر ان کا مذاق اڑاتے ہیں، بچے ہنستے ہیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا-غور کیجیے جب انہیں اپنی بے ڈھنگی تہذیب میں

عار نہیں محسوس ہوتا ہے تو آخر ہمیں اپنی پاکیزہ تہذیب کے اظہار پر شرمندگی کیسی؟

سوال:-جماعت اہل سنت کو آج علمی وفکری حیثیت سے آپ کس مقام پر محسوس کرتے ہیں؟اور اہل سنت کے تبلیغی دائرے کو وسیع تر کرنے کے لیے آپ کے پاس کچھ رہنما خطوط ہیں؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:-دیکھیے یہ موضوع تو بڑا ہی دلچسپ ہے-آپ یہ سوال جس سے بھی کیجیے گا وہ مسائل کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے پیش کردے گا-میرے خیال میں سارے مسائل دو بنیادی نکتے میں سمٹ سکتے ہیں،ایک دینے کی چیز ہے اور دوسری لینے کی-لین کی جو چیز ہے وہ مدارس اہل سنت کے طریقۂ تعلیم میں انقلابی تبدیلی سے تعلق رکھتی ہے-لوگ درس نظامیہ کے نصاب میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں مگر میری نگاہ میں نصاب میں تبدیلی سے زیادہ جو چیز ضروری ہے وہ طریقۂ تعلیم وتربیت میں تبدیلی ہے- ہمارے یہاں جو طریقۂ تعلیم رائج ہے وہ حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی پر قائم ہے-میں نے اس حوالے سے بڑا ہی طویل اور مدلل مضمون لکھا تھا جو کئی ایک اردو رسائل میں چھپ چکا ہے- اختصار کے ساتھ میں ایک مثال دینا چاہوں گا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کے اسکولوں میں صرف گنتی کے بچے ہی ناکام ہوتے ہیں جب کہ ہمارے مدارس میں صرف گنتی کے بچے ہی اچھے اور کامیاب سمجھے جاتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہی ناکامیاب بچے جب امریکہ کے اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں تو حیرت انگیز کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں- آپ گہرائی میں اتر کر جب جائزہ لیں گے تو کہہ اٹھیں گے کہ بنیادی فرق صرف طریقۂ تعلیم کا ہے- یہاں بچے سہمے، ڈرے اور اتنے خوفزدہ سے ہوتے ہیں کہ ان کی اپنی فطری صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں-طلبہ کو خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے تا کہ وہ جب فارغ ہوں تو وسعت نظری کے ساتھ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کرسکیں-دوسری چیز جو ترک کرنے کی ہے وہ تنگ نظری ہے-آپسی رواداری کو فروغ دینا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح ایک کامیاب ملک وہ ہے جو ہر محاذ پر اپنی برتری ثابت کرسکے اسی طرح ایک کامیاب قوم وہ ہے جہاں آخرت میں کامیابی کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر ممکنہ جائز

محاذوں پر کامیابی کے پرچم لہرانے کی صلاحیت ہو سکے-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ڈاکٹر غلام زرقانی:- گزشتہ سات آٹھ سالوں سے جام نور نے اپنے قارئین کو اس قدر ہوشمند بنا دیا ہے کہ میں مزید کسی پیغام کی ضرورت محسوس نہیں کرتا- میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی قلمی تحریک کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ لوگ نہ صرف اسے استحسان کی نظروں سے دیکھیں بلکہ اس کی آواز کو اپنی آواز سمجھنے لگیں، اس کی فکر کو اپنی فکر اور اس کی زبان کو اپنی زبان- ادارۂ تحریر، معاونین، مخلصین اور بہی خواہوں کو مبارک ہو کہ وہ منزل آن پڑی ہے-□□□

(شمارہ اگست ۲۰۰۹ء)

مولانا سید قاسم اشرف کچھوچھوی

آستانۂ اشرفیہ، کچھوچھہ شریف، ضلع امبیڈکر نگر (یوپی)

مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانی اور سادات کچھوچھہ کا علمی، دینی اور روحانی فیضان صدیوں سے ہندوستان اور اس کے باہر کی دنیا پر موسلا دھار بارش کی طرح برستا رہا ہے- آج اس خانقاہ کی درجن بھر سے زائد شخصیات مختلف میدان عمل کے امیر و سربراہ کی حیثیت رکھتی ہیں- خصوصاً شیخ الاسلام مولانا سید محمد مدنی میاں علمیت اور غازی ملت مولانا سید محمد ہاشمی میاں خطابت کے استعارے کے طور پر جانے جاتے ہیں- مولانا سید محمد قاسم اشرف کچھوچھوی اسی خانوادۂ فضل وکمال سے تعلق رکھتے ہیں- موصوف محدث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی قدس سرہٗ کے حقیقی پرنواسے ہیں- آپ کی ولادت یکم/ جولائی ۱۹۶۶ء کو کچھوچھہ مقدسہ میں ہوئی- دارالعلوم دیوان شاہ بھیونڈی اور جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے تحصیل علم کی- آپ کے اساتذہ میں مفتی غلام مجتبیٰ اشرفی اور مفتی عبدالجلیل اشرفی کے نام شامل ہیں- بقول آپ کے حضرت مخدوم اشرف نے آپ کے حصے میں اہل سیاست کو رکھا ہے- آپ کے عقیدت کیشوں میں بڑے بڑے ارباب سیاست و وزارت شامل ہیں- ایسے دور میں جب کہ اہل سیاست کی بارگاہ میں علما کی حاضری قبیح روایت کی شکل اختیار کر گئی ہے آپ کی بے نیازی اور معاملات کو دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے- آپ نے محدث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی کی خدمات وافکار کو عالمی پیمانے پر متعارف کرانے کے لیے ادارہ ''محدث اعظم مشن'' کی تنظیم وترتیب کا منصوبہ بنایا ہے، جس کے تحت دنیا کے مختلف ملکوں اور ہندوستان کے متعدد شہروں میں دینی، تعلیمی اور رفاہی ادارے قائم کرنے نیز کتابوں کی تحقیق واشاعت کا ارادہ رکھتے ہیں-

سوال :-حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی کی تعلیمات جدید دور میں کس قدر بامعنی ہیں؟

مولانا سید قاسم اشرف :-حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے حکومت و اقتدار کو چھوڑ کر روحانیت اور خدمت خلق کو گلے لگایا تھا- یہ دور ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرا رہا ہے،حکومت وسیاست سے لے کر سائنسی تجربہ گاہوں اور علمی دانش کدوں تک ہر جگہ روحانی اضطراب کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے-ایسے میں ضروری ہوگیا ہے کہ علما اور صوفیہ کا ایک گروہ ایسا سامنے آئے جو اس پریشان ماحول میں روحانی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکے،اگر ایسا ہوجاتا ہے تو یہ حضرت مخدوم سمناں کے مشن کا احیا بھی ہو گا،اسلام کی بہت بڑی خدمت بھی ہوگی اور جنگ ،حیوانیت اور درندگی میں مصروف انسانوں کا روحانی اور دماغی علاج بھی-

سوال :-ہندوستان کے تکثیری معاشرے میں دعوتی وتبلیغی عمل کو موثر کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

مولانا سید قاسم اشرف :-ہندوستان حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کی سرزمین ہے،اس سرزمین پر باضابطہ منصوبہ بند طریقے پر اسلامی دعوت وتبلیغ کا آغاز انہی کی کوششوں سے ہوا- ہندوستان کا معاشرہ آج کی طرح اس وقت بھی تکثیری معاشرہ تھا،اس لیے موجودہ تکثیری معاشرے میں دعوت وتبلیغ کے لیے کسی نئے طریقے کی ضرورت بالکل نہیں ہے-آج بھی یہاں پر دعوت وتبلیغ کا مشن حضرت خواجہ کے کھینچے ہوئے خطوط پر ہی کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے-ہم ذرائع کی بات نہیں کررہے ہیں،کیوں کہ جدید وسائل وذرائع کا استعمال حضرت خواجہ کے مشن سے انحراف نہیں ہے،یہاں اصل چیز یہ کہ داعی کی سوچ اور اس کا کردار حضرت خواجہ غریب نواز کی سوچ وکردار سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور وہ کردار مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ دین اسلام پر سختی سے استقامت کے ساتھ اپنے مخاطب سے نہایت محبت اور نرمی سے ملا جائے-

ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ یا تو غزنوی،غوری اور التمش کے ساتھ اپنا ذہنی رشتہ جوڑتے ہیں یا پھر اکبر اور دارا شکوہ کو اپنا آئیڈیل بناتے ہیں-پہلی صورت میں اسلام تشدد اور جنگ سے جڑ جاتا ہے جبکہ دوسری صورت میں الحاد اور صلح کلیت سے-اسلامی دعوت وتبلیغ اس سرزمین پر اس وقت تک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتی جب تک مسلمان تحکمانہ مزاج اور معذرت خواہانہ طبیعت سے باہر نہیں آجاتے-ہمیں حضرت خواجہ غریب نواز اور دوسرے صوفیہ برحق کے نقش قدم پر چلنا چاہیے-ان کو آئیڈیل بنانا ہی در اصل اسلامی دعوت کا نقطۂ آغاز ہے اور انہی کی پیروی سے آج دعوتی اور تبلیغی عمل کامیاب ہوسکتا ہے-

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ جس وقت حضرت خواجہ غریب نواز ہندوستان تشریف لائے وہ اسلام کی بالادستی کا دور نہیں تھا،اسلام ایک اجنبی مذہب تھا،لیکن اس کے باوجود کثرت سے لوگوں نے ان کی اور ان کے اصحاب کی دعوت پر اسلام قبول کیا،مگر دوسری جانب سے ان کی اس شدت سے مخالفت نہیں ہوئی اور نہ اسلام کو منظم طریقے سے برا بھلا کہا گیا جتنا کہ آج مسلمانوں کو مخالفت اور اسلام کو نفرت وعداوت کا سامنا ہے-آخر اس کی وجہ کیا ہے؟غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت خواجہ نے اسلام اور بندگان خدا کے ساتھ مخلصانہ اور داعیانہ رویہ اختیار کیا-نہ اسلام کے نام پر نعرے لگائے اور نہ ہی مشرکین ہند کے خلاف تقریریں کیں،بلکہ نہایت دانش مندی ،خلوص ،محبت ،حسن کردار ،غم خواری وغم گساری،خدمت خلق اور حکمت کے ساتھ دلوں کو جیت لیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مخاطب اگر اسلام قبول نہیں کرسکا تو کم از کم یہ ضرور ہوا کہ وہ اسلام کا دشمن اور بدخواہ نہیں بنا-آج ہم خواجہ صاحب کے اس طریقے کو بھلا چکے ہیں،نتیجہ یہ کہ اسلام کی تبلیغ تو نہیں ہورہی ہے،ہاں!ہم اپنے گفتار وکردار سے لوگوں کو اسلام کا دشمن ضرور بنا رہے ہیں-

سوال :-مشائخ طریقت کا موجودہ طریق کار کہاں تک اطمینان بخش ہے اور حالات کے پیش نظر انہیں اپنے طریق کار میں کس طرح کی تبدیلی لانی چاہیے؟

مولانا سید قاسم اشرف :-مشائخ طریقت کا موجودہ طریق کار کلی طور پر اطمینان بخش

نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ حالات کے مطابق اپنے طریق کار میں تبدیلی نہیں لا رہے ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حالات کی رو میں بہہ کر اپنے اسلاف کی روش سے ہٹ گئے ہیں- مشائخ کرام کو چاہیے کہ وہ اپنا محاسبہ کر کے دیکھیں کہ ان کی روش صوفیہ کے کردار سے کتنی ہم آہنگ ہے- صوفی اس دنیا میں رہتا ہے، اس دنیا کا نہیں رہتا-

جہاں تک مشائخ کے طریق کار میں تبدیلی کا سوال ہے تو میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ مشائخ ایک بار پھر خانقاہی نظام کے قیام و احیاء کی طرف متوجہ ہوں- خانقاہی نظام کا احیاء ہی معاشرے میں مشائخ کو ان کا صحیح مقام دلائے گا-

سوال:- جماعت کے غیر ذمہ دار لوگوں کی بعض حرکتوں سے جماعت کا نقصان کس قدر ہو رہا ہے اور اس کے ازالے کی صورتیں کیا ہیں؟

مولانا سید قاسم اشرف:- غیر ذمہ دار لوگوں کی حرکتیں ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں -آج بھی ایسے لوگوں کی حرکتیں اسلام، مسلمان اور مسلک وملت کے لیے آزار بنی ہوئی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ جماعت کے ذمہ دار ہیں وہ مصلحت اور تحفظات کے نام پر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کر کے ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں- اپنے بعض بڑوں پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ کون شخص ان کے انعام کا مستحق ہے اور کون تنبیہ واصلاح کا-

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جماعت کے ذمہ دار افراد جماعتی اور ملی نفع و نقصان کو صحیح طور سے سمجھیں- جماعتی اور ملی مفاد پر شخصی انا کو قربان کرنے کا حوصلہ پیدا کریں جو افراد، ادارے اور تنظیمیں کسی طور پر جماعت کا کام کر رہے ہیں- اگر ان سے کوئی غلطی یا تساہلی ہوتی ہے تو ان کی حکیمانہ و ہمدردانہ اصلاح کریں اور ان عناصر پر نظر رکھیں جو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اپنی ہی شخصیتوں اور تنظیموں کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں- جب تک محدث اعظم ہند اور مفتی اعظم ہند جیسی شخصیتیں جماعت میں موجود رہیں اس طرح کے شر پسند عناصر کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں مل سکی- یہ وہ لوگ تھے جو مکتب، مشرب اور خطے سے اوپر اٹھ کر صرف مسلکی مفاد کے لیے کام کرتے

تھے اور اس مفاد کے لیے جو بھی رکاوٹ بنتا تھا اس کی بر وقت اصلاح فرماتے تھے- جماعت کے دوسرے افراد بھی اپنے ان بڑوں کی باتوں کا نوٹس لیتے تھے- بریلی اور مبارک پور میں جب بھی کوئی مسئلہ آتا تھا حضرت محدث اعظم ہند وہاں پہنچتے تھے اور مسئلے کا تصفیہ فرماتے تھے، اسی طرح حضرت مفتی اعظم ہند کی رائے کو جماعتی تنازعات میں فیصل کا درجہ حاصل تھا- یہی وجہ ہے کہ حضرت محدث اعظم ہند کے انتقال فرمانے پر سید العلما حضرت سید شاہ آل مصطفیٰ مارہروی علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا کہ: ''ہمارے درمیان سے ایک ثالث اور حکم چلا گیا''- آج بھی جماعت کی بڑی شخصیات کو اسی طرح کا قائدانہ و مصلحانہ رول ادا کرنے کی ضرورت ہے-

سوال:- ''فیورک'' کا مسئلہ زلف جاناں کی طرح دراز کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

مولانا سید قاسم اشرف:- سابق صدر جمہوریہ ہند مسٹر عبد الکلام نے ۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۳ء کو سورت گجرات میں گجرات فساد اور ملک کے فرقہ وارانہ ماحول کے بعد ایک مجلس منعقد کی، اس خصوصی اجلاس میں ملک کے مختلف مذاہب، اسلام، ہندو دھرم، بدھ دھرم، عیسائی دھرم، سکھ دھرم، جین دھرم کے رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی، اس اجلاس میں ڈاکٹر عبد الکلام نے ''سورت روحانی اعلامیہ'' Surat Spritual Declaration جاری کیا، جس کے نتیجے میں جون ۲۰۰۴ء کو نئی دہلی میں تنظیم کا قیام عمل میں آیا، جس کا نام ''فاؤنڈیشن برائے وحدت ادیان اور روشن خیال شہریت'' جسے اختصاراً فیورک (Furec) کہا جاتا ہے- جس کے درج ذیل بنیادی مقاصد تھے: (۱) نظریۂ وحدت ادیان (۲) احترام ادیان باطلہ (۳) تسلیم ادیان باطلہ (۴) غیر اسلامی تہواروں کا انعقاد، اشتراک اور تعاون (۵) مذہبی تہواروں کا مشترکہ انعقاد (۶) مشترکہ لنگر (۷) مشترکہ مذہبی پراتھنا (۸) تمام مذاہب کے آفاقی قدروں کو فروغ دینا اور (۹) تصاویر، مجسموں یعنی پتھر کی مورتیوں وغیرہ کا میوزیم قائم کرنا، وغیرہ-

ایسی تنظیم میں جو لوگ جانے انجانے میں شامل ہو گئے تھے جب انھیں متنبہ کیا گیا اور ایسی تنظیم سے علما و مفتیان کرام نے توبہ و علیحدگی کا مطالبہ کیا تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ

متعلقہ افراد اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور اس سے اپنی براءت ظاہر کرتے، مگر کچھ لوگوں کے اکسانے پر وہ تاویل، توضیح اور جواب در جواب میں لگ گئے- ایسے میں اس مسئلے کو زلف جاناں کی طرح دراز ہونا تھا، وہی ہوا اور بظاہر آئندہ بھی اصلاح حال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی-

سوال :-آپ کی نظر میں مذہب اور سیاست کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ اور ارباب سیاست کے ساتھ اہل مذہب کی قربت کس حد تک درست ہے؟

مولانا سید قاسم اشرف :-مذہب وسیاست کے تعلق سے اسلامی تصور اور مسیحی تصور میں بنیادی فرق ہے- مسیحیت کلیسا اور حکومت میں تقسیم کرتی ہے- وہ خدا کا حق خدا کو اور بادشاہ کا حق بادشاہ کو دینے کا قائل ہے- اسلام کا معاملہ الگ ہے، اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، سیاست جس کا ایک حصہ ہے- اسلام میں سیاست مذہب سے الگ کوئی شئے نہیں- اسلام بیک وقت فرد اور سماج کی اصلاح وفلاح کا علم بردار ہے- اسلام میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی اپنی حیثیت واہمیت ہے- اس لیے کبھی بھی اور کسی حال میں بھی مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا-

رہا یہ سوال کہ اہل مذہب کا ارباب سیاست سے کس نوعیت کا تعلق ہونا چاہیے- تو اس کا طریقہ مختلف حالات میں مختلف ہوسکتا ہے- اسلام کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ حالات سے چشم پوشی کا قائل نہیں- فقہائے اسلام نے تو باضابطہ یہ اصول بنایا ہے کہ حالات کے بدلنے سے شریعت کا حکم بھی بدل جائے گا-

موجودہ حالات میں ہندوستان کی جمہوری اور سیکولر حکومت کے ساتھ ربط وتعلق کا معاملہ نہایت پیچیدہ ہے- ہمیں لگتا ہے کہ اس موضوع پر باتیں تو بہت ہوئی ہیں لیکن اس پر اب تک سنجیدہ غور وفکر نہیں ہو پایا ہے- بہت افسوس ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اب تک اس جمہوری ریاست میں اپنا موقف متعین ہی نہیں کیا ہے- اس حکومت میں ایک مسلمان کا رول کیا ہونا چاہیے یہ مسئلہ علما کی توجہ کا طالب ہے-

سر دست میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ علما کو کسی بھی حال میں سیاست کو شجر ممنوعہ نہیں

سمجھنا چاہیے بلکہ موجودہ سیاست کے ساتھ انہیں گہری واقفیت ہونی چاہیے- وہ جس ملک میں رہ رہے ہیں وہ ملک کن پالیسیوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے، اس کی قانونی، معاشرتی اور معاشی پیچیدگیاں کیا ہیں ان سے واقفیت کے بغیر نہ تو ہندوستان میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا جاسکتا ہے، نہ ہی مسلمانوں کے بنیادی مسائل حل کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی دین وشریعت اور ایمان واسلام کا تحفظ کیا جاسکتا ہے- یہ بات جس طرح قطعی اور یقینی ہے کہ ہندوستانی حکومت اسلامی حکومت نہیں ہے اسی طرح یہ بات بھی قطعی ویقینی ہے کہ اس حکومت میں مسلمانوں کا بھی رول ہے جس سے غافل رہنا صحت مند انداز فکر نہیں ہے- ہاں یہ بات میں ضرور کہوں گا کہ علما کو سیاست کے چکر میں کبھی بھی اپنا وقار اور تقدس مجروح نہیں کرنا چاہیے-

سوال :-آستانۂ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ میں آج کل مذہب، مسلک، ملت اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے تعلق سے کیا کچھ ہو رہا ہے؟

مولانا سید قاسم اشرف :-آستانۂ عالیہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ ہندوستان کے قدیم ترین روحانی، دینی اور تعلیمی مراکز میں سے ایک ہے- صدیوں سے علما نوازی، غربا پروری اور دین وسنت کی اشاعت اس خانقاہ کی پہچان رہی ہے- یہاں کے مشائخ نے جہاں عوام کی دست گیری اور روحانی تسکین کا سامان کیا ہے وہیں علم وفضل سے بھی ان کا گہرا رشتہ رہا ہے- آج بھی یہ آستانہ علمی، فکری، روحانی، دینی ودنیاوی وسائل سے مالا مال ہے- اس کے شہزادگان ومشائخ کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں ہر شخص اپنی صلاحیت ولیاقت کے لحاظ سے خدمت دین اور فلاح انسانیت کے کام میں مصروف ہے- اس وقت آستانے کی بڑی علمی شخصیت حضرت شیخ الاسلام سید محمد مدنی میاں صاحب کی زیر سرپرستی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ''محدث اعظم مشن'' نہایت بڑے پیمانے پر کام کر رہا ہے- جس کے تحت ہندوستان اور دیگر ممالک کے مختلف شہروں میں طلبہ وطالبات کے لیے بہت سے جونیر اور ہائر سیکنڈری اسکول، کالجز، I.T. کالج، اشاعتی ادارے، دینی مدارس، تنظیمی تحریکی اور اشاعتی ادارے چل رہے ہیں- حضرت شیخ الاسلام پچھلے کئی سالوں سے علمی وتحقیقی کام کے لیے خود

کو وقف کر رکھا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی بہت سی علمی تصانیف کے علاوہ قرآن کریم کی ایک جامع تفسیر ''سید التفاسیر'' کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے اور تیسری جلد جلد ہی آنے والی ہے- شیخ اعظم مولانا سید اظہار اشرف صاحب کی زیر سرپرستی بھی ایک عظیم الشان ادارہ ''جامع اشرف'' کے علاوہ کئی مدارس، اسکول و کالجز اور ہاسپٹل چل رہے ہیں- اسی طرح خانقاہ اشرفیہ کے دیگر علما و مشائخ اپنے اپنے وسائل کے اعتبار سے کام انجام دے رہے ہیں- اس مختصر سے انٹرویو میں ان تمام کا احاطہ کرنا مشکل ہے-

سوال:- جماعت اہل سنت میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے ممکنہ راستے کیا ہو سکتے ہیں؟

مولانا سید قاسم اشرف:- علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے کہیں لکھا ہے کہ موجودہ مسالک و مکاتب میں صرف وہ اہل سنت و جماعت ہیں جو پوری دنیا میں کروڑوں میں ہوتے ہوئے بھی نظریاتی اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف یا دوری نہیں ہے، چودہ سو سالہ موروثی عقائد و معمولات نے انہیں ذہنی طور پر ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے، لیکن بدقسمتی سے صرف اہل سنت و جماعت ہی وہ ہیں جن میں تنظیمی اشتراک و اتحاد کا واضح تصور نہیں ہے- حضرت علامہ کی یہ بات بالکل سچ ہے- یقینی طور پر اعتقادی اور مسلکی یگانگت کے باوجود تنظیمی ذہنیت نہ ہونے کی وجہ سے اہل سنت و جماعت انتشار، بدنظمی اور بے سمتی کا شکار نظر آتے ہیں- ہمارے لوگوں میں جماعتی، ملی اور ملکی مسائل میں غور و خوض کی عادت نہ کے برابر پائی جاتی ہے- گزشتہ دو تین سالوں میں اس طرف بڑی تبدیلی آئی ہے خصوصاً شہزادگان مارہرہ حضرت امین ملت کی قیادت میں بڑی خوش آئند پیش رفت کر رہے ہیں- آزادی کے بعد میری معلومات کی حد تک پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ عرس کی مقدس تقریبات میں جماعتی و ملی مسائل کے لیے علمائے اہل سنت اور دانشوران ملت کے اجتماع کی روایت شروع ہوئی ہے- ''فکر و تدبیر کانفرنس'' نے صرف چند ملی مسائل کو ہی حل نہیں کیا ہے بلکہ اجتماعیت کا ایک واضح تصور دیا ہے- میرے خیال میں اتحاد اہل سنت کا موضوع اسی اجتماع میں اٹھایا جانا چاہیے، جب مارہرہ، بریلی، بدایوں اور کچھوچھہ کی اکابر ہستیاں اس

موضوع پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک ساتھ بیٹھ جائیں گی تو اس سے اتحاد اہل سنت کی مستحکم بنیاد پڑ جائے گی، پھر ان بنیادوں پر عمارت کی تعمیر میں تاخیر نہیں ہوگی-

سوال:- کیا اقبال کی یہ بات درست ہے؟

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

مولانا سید قاسم اشرف:- علامہ اقبال یقیناً حکیم الامت تھے، انھوں نے امت مرحومہ کے مسائل پر بہت غور و فکر کیا ہے- ان کی باتیں واقعی اس قابل ہیں کہ ان پر سنجیدہ غور و خوض کیا جائے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ علامہ اقبال کے اندر انفعالیت ہے، وہ بہت جلد کسی چیز سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اپنی بات کہہ جاتے ہیں- خانقاہوں کے حوالے سے جو بات انھوں نے اپنے مذکورہ مصرعے میں کہی ہے وہ بعض خانقاہوں کے ان کے اپنے مشاہدے کی روشنی میں یقیناً درست ہو سکتی ہے، لیکن کلی طور پر اس سے اتفاق کیا جانا مشکل ہے- یہ وہی اقبال ہیں جو حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی مدحت سرائی میں آئے تو جوش عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا کہ......ع

مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

جس طرح حضرت محبوب الٰہی کے لیے اس عقیدت سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خانقاہوں پر اقبال کی اس تنقید سے بھی کلی طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے- سچائی یہ ہے کہ یہ دنیا اہل حق سے کبھی خالی نہیں رہی ہے- آج بھی سیکڑوں شمس تبریز موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر مولانا روم جیسا سوز و گداز اور طلب تو پیدا کریں-

مگو ارباب دل رفتند وشہر عشق خالی شد
جہاں پر شمس تبریزی ست مردے شو چوں مولانا

سوال:- ہم نے سنا ہے کہ آپ حضرات بین الاقوامی سطح پر ''محدث اعظم ہند کانفرنس'' کا انعقاد کرنے جا رہے ہیں؟

مولانا سید قاسم اشرف:- جی! آپ نے صحیح سنا ہے- ہم ''محدث اعظم مشن'' کے زیر اہتمام حضرت شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں کی صدارت میں فروری ۲۰۱۱ء میں گجرات

کے اندر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کرنے جا رہے ہیں ،جس کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں-اس کانفرنس میں برصغیر کے علما،مشائخ اور دانشوران کے علاوہ یمن ،دبئی اور عراق کے علماو مشائخ بھی شرکت فرما رہے ہیں-اس میں پانچ لاکھ سے زائد عوام کی آمد یقینی ہے-اس کانفرنس کا مقصد حضرت محدث اعظم ہند کی دینی ،ملی ،جماعتی اور سیاسی خدمات کی تذکیر وتعارف کرانا ہے تاکہ لوگ جانیں کہ اہل سنت و جماعت میں کیسی کیسی عظیم شخصیتیں تھیں جنھوں نے برصغیر ہند و پاک میں سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی قیادت کی-ہمارے یہاں اگر اپنے اسلاف کا تذکرہ نہ کیا جائے تو لوگ بہت جلد انھیں فراموش کر جاتے ہیں ،جو جماعت کے تحفظ اور اس کی اشاعت کے لیے مناسب نہیں-امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر آپ کی جانب سے حضرت محدث اعظم ہند کی حیات و خدمات پر جام نور کا ایک وقیع اور علمی گوشہ بھی شائع ہوگا-

سوال:-اخیر میں ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مولانا سید قاسم اشرف:-جام نور آٹھ سال پہلے منصۂ شہود پر آیا اور جماعت میں علمی،فکری اور صحافتی انقلاب برپا کیا-ذہن وفکر کے بند دریچے کھلے،حالات ومسائل پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا،سچ بولنے اور سچ سننے کی جرأت پیدا ہوئی-اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ جام نور کی سچائیوں نے اپنے قارئین اور مداحوں کا ایک بڑا گروپ پیدا کر لیا ہے-جام نور کو اپنا یہ مشن جاری رکھنا چاہیے،میری نیک خواہشات اس کے ساتھ ہیں-جہاں تک قارئین کو پیغام دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں ،اس لیے فراست مومنانہ یہ ہے کہ وہ بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق اپنے کردار وعمل سے اسلام اور اپنی اچھی شبیہ پیش کریں،لوح وقلم سے اپنا رشتہ مضبوط کریں اور تعلیم کو اپنا مشن بنائیں،کیونکہ دینی وعصری تعلیم ہی ہماری کامیابی وکامرانی کی ضمانت ہے-□□□

(شمارہ مئی ۲۰۱۰ء)

مولانا قمر احمد اشرفی

بانی وڈائرکٹر:سنی سینٹر،مغل پورہ،حیدر آباد

مولانا قمر احمد اشرفی مصباحی بنیادی طور پر ایک ''داعی خطیب'' ہیں،خطابت ان کی دعوت کا میڈیم ہے اور دعوت ان کی خطابت کا محور-اس عظیم منصب کے جتنے لازم اوصاف ہو سکتے ہیں،مولانا ان کے حامل ہیں-دینی علوم،عصری بصیرت، اخلاص،اونچی سوچ، بلند کردار، دعوتی جذبہ اور عالمانہ وقار ان کی خمیر میں شامل ہے-ذاتی طور پر ان کے جس وصف نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ہے مولانا کا استغنا اور بے نیازی، جو کم از کم موجودہ علما میں نایاب نہیں تو نادر ضرور ہے-مولانا کا وطن بھاگل پور بہار ہے،الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے فارغ التحصیل ہیں، جامعہ نظامیہ حیدر آباد سے کامل و فاضل اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد سے گریجویٹ ہیں-حیدر آباد میں دس سالوں تک ایک دینی درسگاہ کے نظم واہتمام کے ساتھ سنی دعوت اسلامی کے پلیٹ فارم سے اصلاح وفلاح معاشرہ پر دینی و تبلیغی تقریریں کرتے رہے ہیں-ان کی تقریریں کتنی اثر انگیز رہی ہیں اس کی شہادت آج بھی اہل حیدر آباد دے سکتے ہیں-مولانا ۲۰۰۲ء میں تبلیغی ودینی مشن پر تقریباً چھ ماہ کنیڈا اور ۲۰۰۷ء میں تقریباً ایک سال بلیک برن انگلینڈ میں مقیم رہے-وہاں سے واپسی پر مولانا سے یہ انٹرویو لیا گیا-اب جبکہ انٹرویوز کا یہ مجموعہ زیر ترتیب ہے مولانا نے اسی سال ۲۰۱۰ء میں سنی سینٹر کے نام سے مسلمانوں کی مذہبی ومسلکی رہنمائی کے لیے حیدر آباد دکن میں ایک ادارہ بنام ''سنی سینٹر قائم کیا ہے،جس کے تحت وہ اعلیٰ پیمانے پر دین کی اشاعت وتبلیغ کا عزم رکھتے ہیں-اس سے قبل حیدر آباد میں ہی ایک دینی ادارہ بنام ''دارالعلوم محمدیہ'' قائم کر چکے ہیں جو ترقی کی طرف گامزن ہے-

سوال:- برطانیہ میں مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی صورت حال کیسی ہے؟

مولانا قمر احمد اشرفی:- اولاً تو برصغیر سے جانے والے علما کا تعلق یا ربط کسی خاص کمیونٹی سے ہوتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں سے ہوتا ہے، عام طور پر علما جس سینٹر سے وابستہ ہوتے ہیں اسی حلقے میں محدود ہوتے ہیں، اس لیے وہ انھی لوگوں کے حالات سے واقف ہوتے ہیں اور انھی کے حالات کا جائزہ پیش کر سکتے ہیں، وہاں پر ترکی، ملیشیا، انڈونیشیا اور دیگر عرب و افریقی ممالک کے مسلمان بھی ہیں جن سے شاید باید ہی کسی کا رابطہ ہو- برصغیر سے جن مسلمانوں نے ترک وطن کر کے برطانیہ میں اقامت اختیار کی ہے ان کا غالب ترین حصہ ورکروں اور مزدوروں پر مشتمل رہا ہے، وہ لوگ تو اپنے ملک کی تہذیب وثقافت سے بہت حد تک جڑے رہے اور آج بھی جڑے ہوئے ہیں، لیکن نئی نسل جو وہاں کے معاشرے اور اسکول کی پروردہ ہے اس کی صورت حال اخلاقی ہو یا مذہبی تشویش ناک ہے- مادر زاد آزاد معاشرے نے جہاں ایک طرف اسلامی اخلاقی قدروں سے نئی نسل کو یکسر آزاد کر دیا ہے تو دوسری طرف منشیات کے استعمال اور اس کے کاروبار نے مسلم نوجوانوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے- وہاں کے نوجوانوں کو دیکھنے کے بعد میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ساری برائیاں معاشی خوش حالی اور مادی اطمینان کے بطن سے جنم لیتی ہیں- یہی وجہ ہے کہ ہندو پاک میں بھی جن گھرانوں میں دولت و سرمایہ کی فراوانی ہے ان کا حال بھی وہاں کے نوجوانوں سے مختلف نہیں ہے- یہاں پر نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے ترک وطن کر کے برطانیہ میں مقیم ہونے کی اصل غرض و غایت اور نشانہ معاشی استحکام و اطمینان کا حصول اور مادی ترقی کے سوا کچھ نہیں- عوام تو عوام وہاں جانے والے مذہبی افراد کی غرض و غایت بھی اس سے بہت مختلف نہیں- لہٰذا وہ اپنے اصل ہدف کو پانے کے لیے ہر طرح کے اخلاقی و روحانی زوال سے سمجھوتا کرنے پر مجبور ہیں-

رہی مسلمانوں کی سیاسی صورت حال، تو اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں اپنی معلومات کی کمی کا اعتراف کرتا ہوں، میں جہاں تک جانتا ہوں مسلمانوں کی سیاست کا اثر

کونسلر اور میئر بننے تک محدود ہے- دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہاں کا سیاسی محاذ برصغیر سے مختلف ہے- وہاں پر سیاست میں آنے یا اس میں اپنا مقام بنانے سے وہاں کے عوامی مسلم مسائل پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ وہاں پر عوام اور حکومت کے حقوق و فرائض بڑے واضح انداز میں متعین ہیں اور نظام مضبوط و فعال ہے اور وہاں کا سرکاری عملہ اپنے اصول پر عامل اور ہر طرح کے کرپشن سے پاک ہے- اس لیے سیاسی قوت کے حصول یا عدم حصول سے وہاں کے عام مسلمانوں کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا- اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کرپشن، بدعنوانی اور بے عملی ہی سیاسی بازی گری کو ہوا دیتی ہے اور عوام کو سیاسی لیڈروں کا محتاج بناتی ہے اور چوں کہ وہاں پر کرپشن نہیں ہے اور محکموں کے نظام میں کوئی کوتاہی نہیں ہے اس لیے برطانوی مسلم عوام کو مسلم لیڈروں کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی-

سوال :- دینی دعوت و تبلیغ کے لیے برطانیہ میں مبلغین کو ابھی کس طرح کا کام کرنے کی ضرورت ہے؟

مولانا قمر احمد اشرفی:- اس وقت برطانیہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کو راہ راست پر قائم رکھنے کے لیے ایسے مبلغین کی ضرورت ہے جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم میں بھی بصیرت رکھتے ہوں اور بین الاقوامی زبانوں بالخصوص انگریزی زبان پر مہارت رکھتے ہوں، ساتھ ہی ساتھ برطانیہ کی یا مغربی ممالک کی ترفع و آسائش سے مغلوب ہونے کی بجائے دردمند دل کے ساتھ اسلامی جذبے سے سرشار ہوں- عوام کی طرح ان کا مطمح نظر خوش حال زندگی کا حصول نہ ہو بلکہ ان کا طرز عمل عوام کو یہ احساس دلا دے کہ ان مبلغین کا مطمح نظر ہم سے مختلف ہے، یہ دولت نہیں ایمان کے متوالے ہیں- ان کی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں عوام کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ برطانیہ میں ہمارا قیام ہماری اپنی ضرورت کے لیے نہیں ہے، ہم تو یہاں پر کوفت کا احساس کرتے ہیں، ہم صرف تمہاری بھلائی اور خیر کے لیے یہاں مقیم ہو گئے ہیں، تمہارے ایمان و عمل کی اصلاح کی فکر نے ہمیں یہاں رہنے پر مجبور کر دیا ہے-

مبلغین کو صحیح معنوں میں داعی بننے کے لیے ضروری ہے- انہیں مادی فراوانی اور آسائش کو نشانہ بنانے سے گریز کرنا ہوگا وہاں کے حالات کے اعتبار سے جو زندگی کے

لوازمات ہیں انہیں تو بہر کیف اختیار کرنا ہوگا، لیکن اس سے اوپر اٹھ کر ترفع وتعیش سے تنفر ثابت کرنا ہوگا، تبھی جا کر کوئی اپنے آپ کو داعی ثابت کر سکے گا، جس کے بعد دعوت کا عمل شروع ہوتا ہے اور نتائج سامنے آتے ہیں-

اب جہاں تک اس سرزمین پر دعوتی ورک کی نوعیت کی بات ہے تو وہاں پر مسجد کے خطابات سے لے کر لٹریچر، سمینار، سمپوزیم کے ذریعے یہ کام انجام پا سکتا ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے لیے ذاتی رابطے سب سے زیادہ موثر ہیں- یہی کل بھی دعوت کی بنیاد رہے ہیں اور یقیناً آج بھی ہیں- کیوں کہ تمام ذرائع ابلاغ ذہن وفکر کو اپیل کرتے ہیں لیکن ذاتی رابطے براہ راست دل کو متاثر کرتے ہیں، دل کو صاف کرتے ہیں اور اسے قبول حق کے لیے آمادہ کر دیتے ہیں- دعوت کے اس طریقے میں داعی کے کردار اور ذاتی اوصاف اور تاثر روح کی حیثیت رکھتے ہیں-

سوال:- دعوت وتبلیغ کے لیے علما نے جواب تک دورے کیے یا وہاں اقامت گزیں ہوئے، اس سے وہ کام کس حد تک انجام پایا؟

مولانا قمر احمد اشرفی:- اس سلسلے میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جو نہیں ہوا وہ تو اپنی جگہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ انہی کی دین ہے- اب رہے اس کے خاطر خواہ منظم اور مضبوط طریق کار اور اس حوالے سے ان لوگوں کی کارکردگی تو اس کا گہرائی سے جائزہ پیش کرنا مبہم ہی صحیح ان افراد پر تنقید کے زمرے میں آئے گا- اس لیے میں نے وہ کہہ دیا ہے جو ہونا چاہیے، اب کیا نہیں ہو رہا ہے اور کیوں نہیں ہو رہا ہے، مجھے اس سلسلے میں کچھ کہنے کا زیادہ حق نہیں ہے، بلکہ میں اپنی طرف سے کچھ کرنے کی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہوں-

سوال:- برطانیہ میں مقیم برصغیر کی نئی نسل میں مذہبی رجحان کس حد تک پایا جاتا ہے اور وہ اس کی بقا وتحفظ کے لیے کتنی حساس ہے؟

مولانا قمر احمد اشرفی:- برطانوی نئی نسل میں تمام تر اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کے باوجود مذہبی رجحان اور روحانی طلب موجود ہے- اس حوالے سے ایک خاص بات یہ عرض کروں گا کہ ان میں موجود مذہبی جذبات موجودہ مبلغین کی کوششوں کا نتیجہ نہیں کہ وہ انہیں

اپنا کریڈٹ بنائیں، ان جذبات کے پیچھے خود اہل برطانیہ کی ذاتی طلب ہے- اور یہ طلب دراصل عالم اسلام کی موجودہ صورت حال نے پیدا کی ہے- آج سے دس پندرہ سال پہلے مسلم نوجوانوں کا حال بالکل مختلف تھا، دین اور اسلام سے یکسر بے نیازی تھی، غفلت تھی، لیکن موجودہ حالات نے ان کے دلوں میں گرمی پیدا کر دی ہے اور میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ان نوجوانوں کی بروقت صحیح تربیت نہ کی گئی یا دوسرے لفظوں میں ان کی طلب کی تسکین نہ کی گئی تو پھر یہ حرارت رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم بھی ہو سکتی ہے—— یہاں عرض کردوں کہ موجودہ مبلغین کو برطانوی نسل داعی ومبلغ سے زیادہ ضرورت مند سمجھتی ہے، پھر بھی اپنی روحانی طلب کی تسکین کے لیے ان کے پاس آ کر ہدایات لے لیا کرتی ہے، لیکن جب تک مبلغین کا معاملہ بدلے گا نہیں اور وہ ضرورت مند کی بجائے صحیح معنوں میں داعی نہیں بنتے ہیں، وہ برطانوی نسل کے ذہن ودماغ کو متاثر نہیں کر سکیں گے- خلاصہ کلام یہ کہ برطانیہ کی نئی نسل میں مذہبی بیداری ہے، وہ اس کو بیدار تر کرنے کے لیے حساس ہیں، پرانی نسل بھی اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کے حوالے سے جذباتی اور اس کے تحفظ کے تئیں بڑی حد تک بیدار ہے- یہ داعیوں کے لیے سنہری موقع ہے اور یہ ان کے اوپر ہے کہ وہ اس موقع سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں-

سوال:- برطانیہ کے سفر کا اتفاق آپ کو کیسے ہوا اور اب واپسی کے بعد آپ کیسا محسوس کرتے ہیں- یعنی آپ کتنا مطمئن ہیں؟

مولانا قمر احمد اشرفی:- بلیک برن (انگلینڈ) میں محدث اعظم مشن کے تحت ایک ایجوکیشنل سینٹر ہے جہاں پنج گانہ نماز اور نماز جمعہ کے ساتھ بچوں کی دینی تعلیم کا نظم وضبط ہے، وہاں پر ایک عالم کی ضرورت محسوس ہوئی، شیخ الاسلام حضرت مدنی میاں صاحب قبلہ نے اس کے لیے میرے نام کا انتخاب کیا اور مجھے وہاں جانے کا حکم ملا- خدا گواہ ہے کہ میری طرف سے اس کے لیے کوئی طلب یا جدوجہد نہیں تھی، حضرت کے حکم کے بعد بھی کئی مہینوں تک ٹالتا رہا، بالآخر ہمیں تعمیل حکم میں کاغذاتی کاروائیاں بھی کرنی پڑیں اور پھر جانا پڑا- وہاں جا کر میں تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بہت اچھا لگا، لیکن ضرورت کا احساس ضرور ہوا- میں

اپنے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے وہاں بہت کچھ کر دیا ہے، ہاں! اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ کچھ حساس نوجوانوں میں کچھ کرنے کے تئیں جذبات ضرور انگیز کیے ہیں، مجھے یہاں آنے کے بعد ظاہر ہے کہ وطن لوٹنے کا احساس ہے، لیکن میں اس وقت کسی چیز کے کھو جانے کا غم یا پانے کی طلب نہیں رکھتا- آئندہ کے لیے بھی یہی ہے کہ مجھے کچھ بنیادی تیاریوں کے بعد قانونی مرحلے طے کرنا ہے اور واپس وہاں جانا ہے-لیکن یہ طے اور اٹل نہیں ہے-کام اور حالات کچھ بھی فیصلے کرا سکتے ہیں-

سوال :-ملکی اور بین الاقوامی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعوتی وتبلیغی سطح پر کس طرح کی جدوجہد آپ ضروری سمجھتے ہیں؟

مولانا قمر احمد اشرفی:-تبلیغ ودعوت کے جتنے ذرائع اور جتنی سطحیں ہو سکتی ہیں، ہر سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور ہر سطح پر کچھ نہ کچھ ہو بھی رہا ہے، لیکن اس میں جدوجہد، جفاکشی، اخلاص اور بے لوثی کے ساتھ مبلغین و دعاۃ کا اسلامی اخلاق سے آراستہ ہونا ضروری ہے، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ دعوت وتبلیغ کا موثر ترین ذریعہ ذاتی رابطے ہیں اور ذاتی رابطے میں اصل مبلغ کی حیثیت اخلاص اور اخلاق وکردار کی ہے-

سوال:-برطانیہ میں ماہنامہ جام نور کے تعلق سے کس طرح کے جذبات یا خیالات ہیں؟

مولانا قمر احمد اشرفی:-برطانیہ میں بالخصوص وہاں مقیم ہندوستانی عام اردو کتابیں پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، پھر وہ آپ کا جام نور کیا پڑھ سکیں گے؟ اور جو لوگ اردو جانتے ہیں وہ صرف اردو پڑھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ایسے افراد ظاہر ہے کہ وہ کسی معیاری ادبی اور مذہبی رسالے کا مطالعہ نہیں کر پائیں گے- البتہ یہاں مقیم علمائے ہند وپاک میں آپ کا رسالہ مقبول ہے اور ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے-وہاں کی مسلم سوسائٹی میں رسائل کے لیے آسان اور عام فہم انگریزی زبان میں مذہبی رسالے کی ضرورت ہے- جسے اگر آپ کر لے جاتے ہیں تو وہاں کی مسلم سوسائٹی کے اندر اثر ونفوذ ہو سکتا ہے-□□□

(شمارہ فروری ۲۰۰۸ء)

مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی

سربراہ: مولانا اوکاڑوی اکیڈمی، کراچی، پاکستان

بارعب صورت، وجیہ شخصیت، بھاری بدن، خنداں لب، کشادہ جبیں، روشن دماغ، وسیع نظر، وافر علم اور ہر وقت ذکر دین اور فکر دعوت، یہ ہے مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی کی کل کائنات-موصوف ۱۷/اگست ۱۹۵۷ء کو کراچی پاکستان میں پیدا ہوئے-آپ کے والد مولانا محمد شفیع اوکاڑوی پاکستان کے نامور عالم دین اور بے بدل خطیب تھے-اس طرح مولانا کی پرورش ایک دینی وعلمی گھرانے میں ہوئی، ایک ساتھ دینی وعصری علوم سے بہرہ مند ہوئے- چنانچہ جہاں آپ نے انٹر میڈیٹ، بی اے، بی کام، ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا وہیں درس نظامیہ کی منتہی کتابیں بھی پڑھیں-آپ کے اساتذہ کی فہرست میں والد ماجد مولانا شفیع اوکاڑوی ،مولانا سید احمد سعید کاظمی، سید علوی مالکی اور مولانا زید ابوالحسن فاروقی جیسی بڑی ہستیوں کا نام شامل ہے-آپ کو عرب وعجم کے ۱۶/مشائخ کرام سے تمام سلاسل طریقت میں خلافت واجازت حاصل ہے- دنیا کے مختلف گوشوں میں آپ کے ہزاروں مریدین میں ۳۰۰ سے زائد تعداد ان نومسلموں کی ہے جو آپ کے ہاتھوں اسلام لائے-آپ ۱۹۶۷ء سے ریڈیو پاکستان سے براڈ کاسٹ اور ۱۹۶۹ء سے تا حال PTV اور پھر QTV سے ٹیلی کاسٹ کیے جا رہے ہیں-۱۹۸۴ء سے مسجد گلزار حبیب کراچی کی امامت وخطابت کی ذمہ داری بھی آپ کے سر ہے، خطابت کے لیے اب تک تقریباً چالیس ممالک کا سفر کر چکے ہیں، لیکن آپ کا طبعی میلان لوح وقلم کی طرف ہے- دو درجن سے زائد دینی وعلمی تصنیفات کے علاوہ اب تک درجنوں مضامین سے عوام وخواص مستفید ہو چکے ہیں، جن میں ''نعت رنگ'' میں شائع ہونے والے آپ کے علمی خطوط اور تنقیدی تبصرے اہمیت کے حامل ہیں-

سوال:- (۱) QTV پر آپ اپنی اردو اور انگلش اسپیچ کے ذریعے پوری دنیا میں پیغامِ حق عام کر رہے ہیں- آپ سب سے پہلے یہ بتائیں کہ دعوت کے اس جدید اور ہمہ گیر طریقے کی طرف آپ کو کس چیز نے مائل کیا؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:- آپ کی پاکستان آمد پر خوشی ہے- آپ کے دادا جان مرحوم و مغفور سے شرف ملاقات رہا- اس مسجد گُل زارِ حبیب میں انہوں نے جمعہ کے تین اجتماعات سے خطاب فرمایا، مجھ سے اس مسجد کی متعدد تصاویر بھی وہ لے گئے کیوں کہ انہیں اس مسجد کی طرزِ تعمیر اور تزئین بہت پسند آئی تھی- تحریر کے حوالے سے انہیں ''رئیس التحریر'' کے لقب سے یاد کیا گیا، میری معلومات کے مطابق ''ورلڈ اسلامک مشن'' کے بانی اور برطانیہ میں اس کے پہلے اجتماع کے داعی بھی آپ کے دادا جان ہی تھے- ''دعوتِ اسلامی'' کا لائحہ عمل یعنی دستور و منشور بھی آپ کے دادا جان ہی نے تحریر فرمایا تھا اور اس پر میرے والد گرامی علیہ الرحمہ نے دستخط فرمایا تھا- ان دنوں میں افریقی ممالک کے دَورے پر تھا جب آپ کے دادا جان کا وصال ہُوا- ''جامِ نور'' کے ذریعے آپ میدانِ تحریر میں ان کے جانشین ثابت ہو رہے ہیں- بہت کم عرصے میں آپ نے سُنّی رسائل و جرائد میں اپنی الگ پہچان نمایاں کی ہے- اللّٰہ کرے کہ آپ صدق و اخلاص کے ساتھ ''آوازِ حق'' ہی بلند کریں اور کسی طَور متنازع نہ ہونے پائیں-

بہت شکریہ کہ آپ نے اب تک بغیر ملاقات کے بھی مجھ سے رابطہ رکھا اور ''جامِ نور'' میں میرے ایک سفر نامے کا کچھ حصہ بھی شائع کیا، آج آپ سے پہلی ملاقات پر مزید خوشی ہے- آپ نے ''انٹرویو'' کی ٹھانی ہے، آپ معزز مہمان ہیں اس لیے انکار کی مجال نہیں- عرض کرتا ہوں:

QTV کا سلسلہ ابھی نیا ہے اور اس کے مالکان اس سے پہلے ARY ڈی جی ٹل کے عنوان سے اپنا چینل متعارف کرا چکے ہیں، آپ QTV پر میرے روزانہ جو پروگرام ملاحظہ فرما رہے ہیں، یہ نشرِ مکرر ہے یعنی یہ ریکارڈنگ اس چینل پر دوبارہ پیش کی جا رہی ہے- اس

سے قبل یہ تمام پروگرام ARY پر ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں-

شاید آپ کے علم میں نہیں کہ مَیں 1969ء سے ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہوں، ''پی ٹی وی'' (پاکستان ٹیلی ویژن) سے یہ سلسلہ شروع ہُوا- اس دَور ہی سے ریڈیو پاکستان سے بھی براڈ کاسٹ ہوتا رہا ہوں- پرائی ویٹ ٹی وی چینلز کی بہتات گزشتہ عشرے میں ہوئی ہے اب تک یہاں کے سات آٹھ چینلز پر ٹیلی کاسٹ کیا گیا ہوں اور جس قدر پروگرام پیش کیے ہیں بحمدہٖ تعالیٰ انہیں بہت پسند کیا گیا ہے-

''میرے سرکار (ﷺ) کے قدم پہنچے'' کے عنوان سے تیس پروگرام، ''نبوت کا سفر'' کے عنوان سے تیس پروگرام ''سفرِ معراج'' کے عنوان سے 19 پروگرام، ''واقعہ کربلا'' کے عنوان سے گیارہ پروگرام اب تک کئی بار نشر کیے گئے ہیں- ''دُرود شریف کی اہمیت'' کے عنوان سے ایک گفتگو ناظرین کے اصرار پر کئی مرتبہ ٹیلی کاسٹ ہوئی ہے- کیو ٹی وی سے ۱۴۲۴ھ میں ''یومِ عرفہ'' کی 9 گھنٹے کے دورانیے کی مسلسل ٹرانس مشن بھی دنیا بھر میں یادگار رہی- ''قصص القرآن'' کے عنوان سے بارہ پروگرام بھی بہت پسند کیے گئے- پی ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے متعدد اہم پروگرامز کی ایک فہرست ہے، تقریباً دو ہزار پروگرام اب تک ٹی وی چینلز سے پیش کر چکا ہوں- آپ جانتے ہیں کہ میرے والد گرامی علیہ الرحمہ کی وجہِ شہرت میں ان کا منفرد اور مثالی اندازِ خطابت نمایاں ہے- مَیں نے صرف ''ایک شخص'' کو سُننے کے لیے جو ہجوم ان کی خطابت کے جلسوں میں دیکھا وہ اب تک کسی اور کے لیے میرے دیکھنے میں نہیں آیا- کانفرنسوں اور اولیاء اللّٰہ کے اعراس میں بڑے اجتماع ہوتے ہیں لیکن صرف ایک ہستی کو سُننے کے لیے مثالی اجتماع اپنے والد گرامی علیہ الرحمہ ہی کے جلسے میں دیکھا- اس دَور میں ان کے ہر جلسے کے لیے اخبارات میں تشہیر بھی نہیں ہوتی تھی مگر ہجوم قابلِ دید ہوتا- ابھی وہ لوگ خاصی تعداد میں موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ وہ روزانہ کتنی مسافت پا پیادہ طے کر کے ان کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے- شروع میں ٹیکنالوجی کی فراوانی اور ارزانی بھی اتنی نہیں تھی کہ ان کی تمام تقاریر کی ریکارڈنگ کی جاتی- کیسیٹ ریکارڈر کی ابتداء کے بعد ان کی تقاریر کی ریکارڈنگ کا یہ منظر بھی دیکھا کہ اکثر سو سے زائد

کیسیٹ ریکارڈرز اسٹیج کے سامنے نظر آتے اور عشرۂ محرم میں گھانچی پاڑا کی محمدی وعظ کمیٹی کو تین بڑے کمرے ریکارڈنگ کو آنے والوں کے لیے مخصوص کر کے اہتمام کرنا پڑتا- پھر ٹیلی فون سے بھی خطاب سُننے کا اہتمام ہونے لگا- یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ عمدگی سے کہی گئی اچھی بات سُننے کا شوق لوگوں میں کبھی کم نہیں ہوتا اور ''ذرائع ابلاغ'' (باتیں پہنچانے کے ذریعے) شاید اسی لیے بڑھ رہے ہیں کہ ''ابلاغ' ایک اہم ضرورت ہے- وقت اور فاصلوں پر ممکنہ دست رس ہی مادی سائنس کی پیش رفت ہے- انسان نے گویا خود کو پَر لگا لیے ہیں' وہ ناشتہ مشرق میں کرتا ہے تو ظہرانہ مغرب میں پہنچ کر کر لیتا ہے- ٹیلیکس کی جگہ فیکس آیا، ٹیلی گرام کی جگہ ٹیلی فون نے لی اور اب موبائل فون مروّج ہے- پہلے حاجیوں سے وہاں کی باتیں کس چاہ سے سُنی جاتی تھیں اب گھر بیٹھے تمام مناظر بچشم خود دیکھ لیے جاتے ہیں- کتاب اور کمپیوٹر کے احوال دیکھئے- ایک ویب سائٹ میں کتنی کتابیں جمع کر دی جاتی ہیں- اسپول سے کیسیٹ پھر سی ڈی اور ڈی وی ڈی تک سفر کی رفتار دیکھیے- کیمرے کا اب تک کا سفر بھی کم تیز نہیں- تاریخ میں کتنے اہلِ علم کے نام نمایاں ہیں، اکثر کے نام تو زیادہ تک پہنچے مگر کام سے کم ہی واقف ہوئے- کتاب سے ناتا ہر دَور میں زیادہ لوگوں کا نہیں رہا اور خواندگی کے تناسب کی کمی بیشی کے باوجود ہر تحریر بھی ہر کسی تک نہیں پہنچتی- پھر یہ بھی کہ جو لوگ پڑھ نہیں پاتے انہیں کیسے باور کرایا جائے؟ جلسوں میں گھر کا ہر فرد شریک نہیں ہوتا اور شرکت کرنے والا ہر شخص اپنے گھر کے افراد کو اپنی دید شنید نہیں بتاتا- ٹیلی وژن اس لحاظ سے ایک ایسا ذریعہ ہے جو گھر کے تمام افراد تک بآسانی رسائی رکھتا ہے- اس کے ذریعے گھر کے تمام افراد کو بیک وقت وہ بات پہنچ جاتی ہے جو فی الحال کسی اور ذریعے سے شاید نہیں پہنچ سکتی- ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس ذریعے کی طرف مائل ہُوا اور دوسری وجہ بلکہ اصل اور اہم وجہ یہ بنی کہ ہمارے مخالفین نے اپنے فتوے صرف تحریروں اور تقریروں تک رکھے ہیں، ان کا اپنا عمل بھی خود ان کے اپنے فتووں سے خالی ہی نظر آتا ہے- وہ اپنے بیش تر مفادات کی تکمیل میں حرام و ناجائز کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور ہر ذریعہ ''بخوشی'' اپناتے ہیں اور اپنی غلط بات بھی کہنے سے نہیں چوکتے- اگر ہم یہی کہتے رہتے کہ انہیں نہ سُنو، نہ

دیکھو تو یہ بات بھی سب تک نہ پہنچتی اور جو انہیں دیکھتے سنتے وہ حقائق سے ناواقفی یا صرف انہیں ہی سننے کی وجہ سے ان کی بات ہی کو صحیح جان لیتے اور گمراہ ہو جاتے- اس لیے بھی اس ذریعہ کو اپنایا تاکہ اس ذریعے سے حق اور صحیح بات پہنچائی جائے اور ابطال باطل کیا جائے- چناں چہ ٹیلی ویژن کی چالیس سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ بھی ہُوا کہ مَیں نے مخالفین کی کتابیں دکھا کر جواب پیش کیا اور پہلی مرتبہ ان آیاتِ قرآنی کا صحیح ترجمہ وتفسیر بھی بیان کرنے کا مجھے موقع ملا جنہیں غلط ترجمہ وتفسیر سے پیش کیا جاتا رہا تھا- آپ شاید جاننا چاہیں گے کہ مخالفین کی کتابیں دکھانے کا تاریخی واقعہ کیا ہُوا؟

کراچی میں دیوبندی مکتبِ فکر کے جناب احتشام الحق تھانوی خاصے مشہور تھے، ان کے بیٹے احترام الحق تھانوی اس سیاسی پارٹی سے وابستہ ہوئے جس کی سربراہ ایک عورت ہے- ان دنوں وہ سندھ کی صوبائی حکومت میں ''مشیر'' بھی تھے- ''مذہبی مسائل'' کے عنوان سے ایک پروگرام میں ان سے مزارات اور مزارات میں آرام فرما اولیائے کرام سے استمداد وغیرہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو تھانوی صاحب نے نہ صرف غیر ذمہ دارانہ بلکہ گستاخانہ گفتگو کی جس سے بہت اشتعال ہُوا- اہلِ سنّت کے مطالبے پر اسی پروگرام کی دوسری نشست میں جواب کے لیے میرا انتخاب ہُوا، جناب اشرفعلی تھانوی کی کتابیں میں ساتھ لے گیا اور ان کتابوں سے اپنے موقف کی تائید میں عبارات پیش کیں- اس پرگروام کو بڑے اہتمام سے دیکھا سُنا گیا اور بہت مفید اثرات ونتائج مرتب ہوئے- اس حوالے سے میری کتاب ''مزارات وتبرکات اور ان کے فیوضات'' میں تفصیل آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں- اس پروگرام کی ریکارڈنگ بھی محفوظ ہے-

اسی طرح آیاتِ قرآنی **وما اھلّ بہ لغیر اللّٰہ** اور **انما انا بشر مثلکم** کے صحیح ترجمہ وتفسیر کے حوالے سے بھی پہلی مرتبہ بہت واضح بیان کرنے کا شرف حاصل ہُوا- ''بے مثل بشر'' کے عنوان سے پروگرام کی ریکارڈنگ بھی محفوظ ہے-

اس مختصر گفتگو سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تھانوی صاحب کا جواب اگر اسی میڈیم پر نہ ہوتا تو ان تمام لوگوں تک حقائق کیسے پہنچتے جو تھانوی صاحب کی بات سُن چکے تھے-

سوال:- آپ اپنے خطابات کے مثبت اثرات کس حدتک محسوس کرتے ہیں؟اور یہ کہ اس برقی دَور میں دعوت کے لیے برقی ذرائع کا استعمال آپ کتنا ناگزیر سمجھتے ہیں؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-تحدیثِ نعمت کے طَور پر عرض کرتا ہوں کہ بحمدہٖ تعالی اب تک اپنے ہر خطاب کے مثبت اثرات ہی دیکھے سُنے ہیں اور اصلاحِ عقائد و اعمال کے حوالے سے بہت کامیابی ہوئی ہے-خطاب کے لیے سمتوں سے لوگ مسلسل تقاضا کرتے ہیں اور جس کسی جگہ ایک مرتبہ گیا ہوں پھر وہاں سے بار بار تقاضا ہُوا ہے اور کچھ اتنی یلغار رہتی ہے کہ مجھے مہلت ہی نہیں ملتی-یقین مانیے کہ نیند بھی پوری نہیں کر پاتا-خطاب کا مجھے کوئی اتنا شوق بھی نہیں تھا لیکن زیادہ وقت اسی کی نذر ہُوا ہے اور سلسلہ جاری ہے-طبیعت کا زیادہ میلان مطالعہ وتحریر سے ہے اور اب اس کے لیے اسفار اور مشاغل کے کثرت میں بمشکل وقت نکال پاتا ہوں-لوگوں سے خطاب کے لیے معذرت کروں تو وہ اس کی اہمیت اور ضرورت کے کچھ ایسے دلائل خود مجھے سناتے ہیں کہ سنتا رہ جاتا ہوں-ٹیلی فون،خطوط اور ملاقاتوں میں لوگ جب مجھ سے میرے خطابات پر مثبت تبصرے اور تأثرات بیان کرتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ حق کا فیضان میرے ذریعے عام ہو رہا ہے-اللّٰہ کرے کہ یہ محنتیں میری بخشش کا سامان ہوں-

آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا کچھ جواب تو پہلے سوال کے تحت عرض کر چکا ہوں مزید یہ کہوں گا کہ دنیا کو اَب ''گلوبل ویلج'' کہا جا رہا ہے اور اس میں تیزی و تیر رفتاری ہی کا چلن ہے اور کچھ ایسی دوڑ لگی ہے کہ جو اس میں شامل نہیں ہو رہا وہ خود کو پیچھے رکھ رہا ہے-اسکول کے بچے بھی اب ہندسوں کے میزان کے لیے کیلکولیٹر استعمال کرتے ہیں،دنیا کی ہر ایجاد کو ضرورت بنایا جا رہا ہے اور الیکٹرانک میڈیا نے خاصے طبقے کو اپنا اسیر کر لیا ہے، جانے کتنی چیزیں تھیں کہ اپنے وقت میں اہم تھیں مگر اب وہ فرسودہ شمار ہوتی ہیں-ٹیکنالوجی کی شاید یہی روایت ہے کہ پہلی چیزوں کو وہ کالعدم ٹھہرا دیتی ہے-اب کتابت کی بجائے کمپوزنگ ہوتی ہے-لیتھو اور بلاک پرنٹنگ کی بجائے اب کمپیوٹر سے بلاواسطہ کلر پرنٹنگ ہو رہی ہے اور صرف کاغذ ہی پر نہیں ہو رہی-ٹیلی فون کوئی وقت تھا کہ اس کا کنکشن حاصل

کرنا ایک مہم سر کرنا تھا اب ہر ہاتھ میں موبائل فون ہے بلکہ اب تو ہینڈ فری فون بھی کانوں میں اٹکے نظر آ رہے ہیں-ایک ملک سے دوسرے ملک میں ٹیلی فونک خطاب بھی ہو رہے ہیں-یہ فہرست طویل ہے-ایسے میں ''دعوت'' کے لیے ان جدید،آسان اور وافر ذرائع کا استعمال نہ کرنا ''دعوت'' ہی کو محدود کرنا قرار پائے گا-یہاں یہ بھی عرض کروں کہ دین و مذہب کے بارے میں کچھ لوگوں کا تاثر یہ رہا ہے کہ زندگی کے سفر میں دین و مذہب ہی جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا-وہ لوگ ''رجعت پسندی'' کے لفظوں سے دین والوں کو ہدفِ طعن بناتے رہے ہیں-اس بارے میں ان کی دینی علمی کم فہمی ہی ان کا ماخذ رہی ہے-انہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ جدت اور جدید تقاضوں کو سمجھنا اور ان کے نتائج سے آگہی ضروری ہے ورنہ ''اندھی تقلید'' کے لفظوں سے ان مادہ پرستوں پر زبان دراز کی جاسکتی ہے-دین و مذہب کی پابندی تو تہذیب ہی کے لیے ہے اور زندگی کے سفر کو صحیح سمت میں درست اور آسان رکھنے کے لیے ہے-قرآن نے ''**واثمهما اکبر من نفعهما** '' کے الفاظ بیان کر کے جو بات سمجھائی ہے اس پر توجہ کی جائے-ہر ایجاد کو ''رحمت'' قرار دینے والے اس کی ''زحمت'' پر بھی نظر رکھیں اور ہر دو کے تناسب کے حوالے سے بات کریں-ہر سہولت کو ضرورت نہیں بنایا جاسکتا اور ضرورت کے لیے ہر سہولت کو ٹھکرایا بھی نہیں جاتا،شرائط و قیود کو پیشِ نظر رکھ کر ہی فیصلہ کیا جاتا ہے-''دعوت'' وہ فریضہ ہے جس کے لیے غفلت یا کوتاہی جرم ہی کے زمرے میں شمار ہوگی-اور یہ بھی عرض کروں کہ برطانیا میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار مرزا قادیانی کی ذریت نے ٹیلی ویژن کے چینل ''اسلام'' کے نام پر شروع کر رکھے ہیں،اس کے مقابل کسی ٹی وی چینل سے کوئی جوابی کارروائی نہیں ہو رہی-البتہ مساجد میں اہلِ سنّت اور دیابنہ کی سالانہ کانفرنسیں خوب ہوتی ہیں' شاید اس بہانے کچھ لوگوں کو برطانیا کی ''یاترا'' کا ''شرف'' مل جاتا ہے-ان کانفرنسوں کی ''باتصویر'' رُوداد کسی قدر وہاں شائع بھی ہوتی ہے تو اُردو اخبارات میں ہوتی ہے جب کہ قادیانی چینل وہاں کئی زبانوں میں اپنی تبلیغ و ترویج کے لیے ہر گھر تک پیہم کوشاں ہے-گزشتہ پانچ برس سے جوابی چینل کے شروع کرنے کے وعدے اور اعلان مَیں نے بھی سُنے ہیں لیکن تا ایں دم کوئی پیش

رفت نہیں ہوئی-اسے غفلت کہا جائے یا کیا نام دیا جائے؟

موجودہ عہد میں دعوت کے کام کو بڑھانا اور پھیلانا ہے تو برقی ذرائع کے استعمال سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان ذرائع کا صحیح استعمال ہی ان سے دعوت کا کام لینا ہے- یہاں یہ بھی عرض کروں کہ یہود ونصاریٰ کی بیش تر ایجادات ان کے مذہبی پروپیگنڈے اور مقاصد کے لیے ہیں ایسے میں مسلمانوں کی آگہی ورہ نمائی اور غیروں کو دعوت پہنچانے کی ذمہ داری کچھ زیادہ ہوگئی ہے اگر اس کا احساس نہ کیا گیا اور برقی ذرائع کو استعمال کر کے یہ کام نہ کیا گیا تو اس کوتاہی کا وبال سنگین ہوسکتا ہے-

سوال:- تصویر کے ساتھ ٹیلی ویژن پر خطاب کرنے پر علما، دانش وران اور عوام کی طرف سے کس طرح کے ردعمل سامنے آئے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-اس کا مختصر اور فی الواقع صحیح جواب تو صرف اتنا ہے کہ علمائے کرام، مشائخ عظام، دانش وروں اور عوام سبھی نے ٹیلی ویژن پر میرے خطابات کو بہت زیادہ سراہا اور اسے اہم ضرورت کہا، ظاہر سی بات ہے کہ ان سب نے دیکھ سن کر ہی سراہا-کسی ایک شخص کی طرف سے بھی کوئی منفی تاثر اب تک نہیں سُنا، شاید یہ بھی وجہ ہو کہ مَیں نے خود ٹیلی ویژن پر آنے کے لیے نہیں بلکہ حق بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے ٹیلی ویژن کو ذریعہ بنایا اور اب تک کوئی ایسا پروگرام قبول نہیں کیا جس میں حق کی ترجمانی نہ کرسکوں اور جس قدر پروگرام کیے ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی کچھ تفصیل بیان کر چکا ہوں-

اس جواب کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں جان دار کی تصویر کی حُرمت کے حوالے سے واضح شرعی تعلیمات مَیں نے بیان کیں اور نیتِ خیر کے باوجود اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے یہی کہا کہ اپنے اس فعل پر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا رہتا ہوں حالاں کہ اسی پروگرام میں شامل دوسری شخصیت نے اسے بالکل جائز بلکہ ضروری قرار دیا-

واضح رہے کہ وڈیو کے حوالے سے ضرور کچھ جلسوں میں عوام نے استفسار کیا اور کچھ علما نے اعتراض کیا لیکن ٹی وی پر خطاب کی سبھی نے خوب تعریف کی-

سوال:-کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ QTV سے جہاں لوگوں میں دینیات کی تحصیل کا خروش پیدا ہو رہا ہے وہیں ٹیلی ویژن کا غیر معمولی فروغ ہو رہا ہے جس سے بڑے پیمانے پر فحاشی کی بھی اشاعت ہو رہی ہے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-آپ نے صرف QTV کا ذکر کیا ہے شاید اس لیے کہ ابھی تک یہی ایک چینل صرف مذہبی پروگراموں کے لیے ہے اور ''Q'' کا حرف ''قرآن'' کے لفظ کی طرف اشارہ ہے- یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ بھارت میں یہی چینل دیکھا جارہا ہے-

آپ کے سوال کے جواب میں یہی کہوں گا کہ اس چینل پر یقیناً کچھ پروگرام ایسے پیش کیے جارہے ہیں کہ ان کے ذریعے دینیات سے واقفیت اور اس کی تحصیل کا شوق فزوں ہُوا ہے مگر مَیں تحفظات رکھتے ہوئے یہ بھی کہوں گا کہ کچھ باتیں ناروا بھی ہیں-نعت خوانی کے حوالے سے نامناسب انداز اور نادرست کلام اور نہایت متنازع کچھ افراد کی ناروا گفتگو بھی اس چینل پر پیش کی جارہی ہے، لیکن بالخصوص حضرت مولانا محمد عباس صاحب رضوی اور دیگر علمائے اہلِ سنّت نے پیغامِ حق پہنچایا ہے اور حقائق پیش کر کے باطل کا قلع قمع کیا ہے- اس خادم نے بھی کچھ محنت کی ہے- اسی QTV سے جانے کتنے ملکوں میں پہلی مرتبہ دینیات کے حوالے سے پروگرام پہنچے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے گمراہ اور بدظن ہو رہے تھے یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ دین صرف عقائد وعبادات ہی نہیں سکھاتا بلکہ دین ہی دنیا برتنے کا طریقہ وسلیقہ سکھاتا ہے اور دین کی صحیح وغلط تعبیر وتشریح میں فرق بھی انہیں نظر آنے لگا ہے کیوں کہ حق چھپانا اب اہلِ باطل کے لیے آسان نہیں-

ٹی وی کو متعارف ہوئے چار پانچ دہائیاں گزر چکی ہیں- شروع میں بہت سی تکنیکی سہولتیں اس کے لیے ارزاں وفراواں نہیں تھیں اور ہر علاقے کے لیے نہیں تھیں مگر اب تو موٹر کاروں میں اور جیبی سائز کے موبائل ٹی وی سیٹ بھی میسر ہیں اور پانچ سو چینلز ایک جگہ دیکھنے کو میسر ہیں- ٹی وی کے اس فروغ ہی نے پرائیویٹ سیکٹر کو چینلز کے لیے موقع فراہم کیا- یہ بھی واضح رہے کہ متعدد لوگوں نے مخصوص چینلز دیکھنے ہی کے لیے ٹی وی سیٹ اور

کیبل یا ڈش انٹینا وغیرہ اپنے ہاں لگوایا ہے-ٹی وی کا بہتر اور صحیح استعمال یہی ہوسکتا ہے کہ اسے حقائق سے آ گہی کا ذریعہ بنایا جائے اور عمدہ پیرائے میں صحیح پیغام اور معلومات اس کے ذریعہ پھیلائی جائیں-

سوال:- کتابی سلسلہ ''نعت رنگ'' کے صفحات پر آپ نے تنقید کی جونئی طرح ڈالی ہے اس پر آپ کی جتنی تحسین وآفرین کی جائے کم ہے، مگر کیا آپ بتائیں گے کہ اس نئی راہ پر چلنے کی محرک کون سی چیز بنی؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-اگر پوری تفصیل بیان کروں تو بات واضح ہوگی تاہم کوشش کرتا ہوں کہ اختصار ہی میں مدعا واضح ہوجائے-

گزشتہ دو دَہائیوں میں نعت گوئی اور نعت خوانی کے حوالے سے جو فضا دیکھنے میں آئی اس میں جہاں خوش آئند اور خوش گوار باتیں ہوئیں وہیں کچھ باتیں نہایت ناگوار بھی رہیں- مسلکِ حق اہلِ سنّت و جماعت کے اہلِ علم کو مخالفوں کے علاوہ خود ان کے اپنے ''نادان دوستوں'' کی نادانیوں نے کم پریشان نہیں کیا-علمائے حق اہلِ سنّت کو اس حال تک پہنچادیا گیا کہ ان کی توانائیاں مدافعت کے لیے ہوکر رہ گئیں- ہمارے مخالفوں نے خود کو سُنّی ظاہر کرکے ہمارے سادہ لوح افراد اور کچھ اپنے ہی چیلوں کو ہمارے خلاف کچھ ایسی باتیں اور کام سکھائے جو وہ ان کے کہنے سُننے میں آ کر کرنے لگ گئے تھے-ایک طرف تو مخالفوں نے خود غلطیاں کروائیں اور دوسری طرف اپنی ہی سکھائی ہوئی انہی باتوں پر فتوے بھی داغے اور کیا کیا فتنے ڈھائے-صدیوں سے ہمارے اہلِ علم نے علم وعمل ہی سے شغف رکھا اور آج تک جس قدر بھی قابل ذکر علمی سرمایہ اور روحانی اثاثہ ہے وہ ہمارے اسلاف کی یادگار ہے- ہمارے مخالف ہماری علمی وعملی جدوجہد روکنا چاہتے تھے-مخالفوں کی اس چال اور سازش پر ہمارے اہلِ علم نے توجہ نہیں کی بلکہ وہ ان کے داغے ہوئے فتووں کے جواب اور ان کے ڈھائے ہوئے فتنوں سے دفاع میں مشغول ہوگئے-مخالفوں کی یہ چال اس لیے بھی تھی کہ ان کے اپنے کفر وضلال پر لوگوں کی توجہ نہ رہے اور ان کے جرم لوگوں کو یاد نہ رہیں-

کفر والحاد اور زندقہ کے یہ مجرم خود کو آج دین وملت کا ٹھیکے دار اور ذمے دار ظاہر کرنا

چاہتے ہیں اور ہم اہلِ حق کو یہ مشرک وبدعتی بنانے اور بتانے کا مذموم شغل اپنا روزینہ بنائے ہوئے ہیں-یہی نہیں بلکہ ان ظالموں نے دین دنیا ہر ایک میں دورخی اور دوغلی پالیسی ہی اپنا شیوہ وشعار بنائی اور ہر سطح پر بے حیائی ڈھٹائی کا طرزِ عمل رکھا-

نعت گوئی اور نعت خوانی پر تنقید کے بیان میں یہ باتیں اس لیے بتارہا ہوں کہ ان مخالفوں نے اس باب میں بھی ظلم وستم کی خوب مشق کی ہے-خود غلط شعر کہنے، پڑھوانے، چھاپنے اور پھر خود ان کے خلاف لکھنے بولنے کا شغف بھی انہیں بہت مرغوب ہے اور صحیح عقائد اور صحیح اعمال کو غلط کہنا تو ان کا روزگار ہے-جانے کتنی نثری تحریریں بھی اسی طرح ان ہی کا شاخسانہ ہوں گی-ان ظالموں نے کس شعبے اور کس مرحلے میں اپنی اس روش کا دخل نہیں رکھا! عیدمیلادالنبی ﷺ منانے کے یہ مخالفین، میلاد شریف کی ہر محفل میں بھی پہنچے ہوتے ہیں-ایصالِ ثواب کے لیے سوم دہم اور چہلم کے خلاف ان کے فتوے بھی جوں کے توں ہیں اور ان مواقع پر یہ خود نمایاں موجود ہوتے ہیں-نعت خوانی یا میلاد شریف کی محافل ان کے ہاں تو نہیں ہوسکتی تھیں سو ہماری محفلوں میں انہوں نے اپنی شرکت اور دخل اندازی ضروری کرلی اور نعت کے موضوع پر لکھی جانے والی تحریروں میں اور انتخاب نعت کے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی ریشہ دوانی شروع کردی-علاوہ ازیں ان اہلِ قلم ادیبوں شاعروں کو (جو مذہبی اختلافات کے حقائق سے آ گاہ نہیں) یہ لوگ حقائق سے باخبر ہونے نہیں دینا چاہتے اور خود ہمارے بعض ادیب وشاعر حضرات بھی صحیح اور پوری معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اظہار وبیان میں لغزش کرجاتے ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ وہ ناواقفی یا کم واقفی کی وجہ سے اپنے معترض کے سامنے خاموش ہوجاتے ہیں-مخالفوں کی طرف سے اعتراض کی یلغار ہوتی رہی- ہمارے اہلِ علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں جواب دیتے رہے-وہ جوابی تحریریں انہی رسائل وجرائد میں شائع نہ ہوں جہاں معترضہ تحریریں شائع ہوئیں تو ان معترضین اور ان رسائل وجرائد کے قارئین حقائق کیسے جانیں گے؟ اور اعتراض کیسے دُور ہوں گے؟ بہت سے معترض اور کچھ ہمارے اہلِ قلم بھی ایسے ہیں جنہیں اختلافات کی نوعیت اور حقیقت سے آ گہی نہیں ہے-ایک المیہ یہ بھی رہا کہ بغیر دانائی وتحقیق کے اپنے

طَور پر جواب دینے والوں نے بھی تضحیک وتحقیر کا ماحول بنا دیا-

ہمارے اہلِ علم زیادہ تر ایسے ہیں جو رسائل و جرائد کے مطالعے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے اور ان کی اپنی ترجیحات بھی ہوتی ہیں، وہ رسائل و جرائد میں لکھنا غیر ضروری گردانتے ہیں-معترض کو آئینہ نہ دکھایا جائے تو اس کا اعتراض ہی لوگوں میں راہ پا جاتا ہے اور دُھندر ہے تو اجالا نہیں ہو پاتا، پھر حق پسِ پردہ ہی رہتا ہے اور ظلمات سے نور کی طرف لانا وہ ذمہ داری ہے جو اہلِ حق ہی کا حصہ ہے-کتابی سلسلہ ''نعت رنگ'' کا پہلا شمارہ مَیں نے دیکھا تو اسے اپنے موضوع پر دیگر جرائد و رسائل سے مختلف پایا-اس کے تین شماروں تک میں اس کے تسلسل اور اس میں شامل متن کا جائزہ لیتا رہا-میرے مشاغل کی کثرت مجھے اجازت نہیں دیتی تھی کہ مَیں اپنے لیے کام کا اضافہ کروں لیکن نعت رنگ کے مدیر و مرتب محترم سید صبیح رحمانی کے صدق و اخلاص اور نعت شریف سے اپنی قلبی وابستگی پر اس خدمت کے لیے بفضلہٖ تعالیٰ مجھے ہمت ہوئی اور اللّٰہ کریم کے فضل و کرم اور نبی پاک ﷺ کی رحمت وعنایت سے مَیں نے کام یابی پائی-لوگ میرے معمولات و مشاغل کی کثرت میں میرے ان تنقیدی خطوط کی طوالت پر حیرت کرتے ہیں-یقین مانیے یہ میرے کریم و رحیم نبی پاک ﷺ کا فیضان ہی ہے، نعت شریف ہی کا مصرع یاد آ رہا ہے ؎

یہ تو کرم ہے ان کا ورنہ مجھ میں ایسی بات نہیں ہے

سوال:-اہلِ علم نے ادب وتحقیق کے لیے تنقید کو زندگی کے لیے سانس کی طرح ناگزیر قرار دیا ہے، کیا مذہبی ادب وتحقیق کے لیے بھی آپ تنقید کو اتنی ہی ضروری شئے سمجھتے ہیں یا مذہبی ادب اس حکمِ کلّی سے مستثنیٰ ہے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-سوال میں ''حکمِ کلّی'' کے الفاظ محلِ نظر ہیں، یوں کہہ لیجئے کہ ''کیا اس حکم سے کلّی مستثنیٰ ہے؟'' بات یہ ہے کہ ''تنقید'' کا لفظ سنتے ہی بالعموم یہ گمان کیا جاتا ہے کہ ''کوئی منفی رائے'' ہوگی-لوگ یا تو ''تنقید'' کے صحیح معنی و مفہوم سے آگاہ نہیں ہیں یا انہیں تنقید کے نام پر وہ کچھ پڑھنے سُننے کو ملا ہے کہ وہ تنقید کو ناپسند کرتے ہیں -''ادب'' اور ''تحقیق'' کی تعریف کی بات یہاں نہیں کرتا البتہ ''تنقید'' کے معنی اپنی دانست

کے مطابق ضرور عرض کروں گا کہ ''کسی کلام یا بیان کی خوبیاں اور خامیاں ظاہر کرنا'' تنقید کہلاتا ہے-ایک لفظ میں اسے ''پرکھ'' یا ''تمیز'' بھی کہہ سکتے ہیں-غیر جانب دارانہ رائے کو بھی تنقید کہتے ہیں-آپ نے ادب وتحقیق کی سوال میں تقسیم کی ہے اور مذہبی ادب وتحقیق کو الگ بیان کیا ہے-اس وقت اس تقسیم پر بھی گفتگو نہیں کرتا صرف پوچھی گئی بات ہی کا جواب پیش کرتا ہوں-

قرآنِ کریم کلام اللّٰہ تعالیٰ ہے-اس کے ترجمہ وتفسیر کے لیے بھی ہمارے ہاں شرائط وقواعد ہیں-احادیث کے حوالے سے ہمارے ہاں اسماء الرجال کا وہ علم وفن ہے جو کسی اور کے ہاں نہیں-''لغت'' کے حوالے سے بات کروں تو بہت تفصیل ہو جائے گی- جسے آپ نے مذہبی ادب وتحقیق کہا ہے اس بارے میں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ تنقید کے بغیر ہے ہی نہیں، کیوں کہ اس میں بنیاد، ایمانیات ہے، عقائد ہیں-اور اس باب میں تنقید نہ ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا-یوں بھی کہوں کہ ہر وہ بات یا کلام جس کے لیے اصول وضوابط اور شرائط وقواعد ہیں وہ تنقید سے خالی کیسے ہوسکتی ہے؟ کہنے لکھنے والے نے ان اصول و ضوابط اور شرائط وقواعد کا کتنا خیال رکھا اور کس طرح رکھا اسی کے بیان کو تنقید کہا جائے گا- جس طرح سانس، زندگی کے لیے ضروری ہے اسی طرح سمجھ لیجئے کہ مذہب سے وابستگی ثابت کرنے کے لیے ایمان اور صحتِ عقائد لازمی ہے-ہمیں ثواب وعذاب کا یقین بلاشبہ مذہب ہی سے ہے-اور مجھے بتایا جائے کہ یہ مدح وذم کیوں ہوتی ہے؟

قرآنِ کریم کی کتنی ہی آیات ہیں جو واضح کرتی ہیں کہ حسن وقبح کی پرکھ اور تمیز کتنی اہم ہے-میں نے مختصراً اتنا کہا ہے، بہت تفصیل بھی کہہ سکتا ہوں-خلاصہ یہ کہ وہ ادب و تحقیق جس کے لیے تنقید کو زندگی کے لیے سانس کی طرح ناگزیر کہا گیا ہے، اس میں تنقید کی کمی بھی ہو تو دین اور آخرت کا مسئلہ نہ ہوگا لیکن دینی و مذہبی ادب وتحقیق میں تنقید یعنی خوبی و خامی اور صحیح وغلط کی تمیز نہ ہوئی تو ایمان ونجات کے لیے مسئلہ ہوجائے گا-

اس جواب کے بعد یہاں ایک بات مزید کہنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ جو لوگ نعت شریف یا مذہبی موضوعات پر تحریروں کو تنقید سے کلّی مستثنیٰ سمجھتے ہیں وہ جان لیں کہ انسان

،مرکب عن الخطا ہے، خالی از خطا نہیں۔ (نبیوں کی بات نہیں کر رہا) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم کے باوجود توجہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ پیرایہ بیان ناموزوں ہو گیا، یا یہ کہ لفظوں کی نشست و ترکیب صحیح نہ رکھنے میں مفہوم بدل گیا۔ ایسی کئی صورتیں ہو جاتی ہیں۔ تنقید نہ ہو تو خوبی یا خامی کی تمیز کیسے ہوگی؟

سوال:۔ مذہبی ادب میں تنقید کی روایت کتنی قدیم ہے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ موجودہ مذہبی تنقید کی کیا صورت حال ہے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ سے پوچھوں کہ آپ جسے مذہبی ادب فرما رہے ہیں وہ خود کتنا قدیم ہے؟ تاہم عرض ہے کہ:

کلام اللہ تعالیٰ، قرآن مجید کے نزول سے اگر ہم بات کریں تو قرآنِ کریم سے ہمیں اس بارے میں بنیادی تعلیم ملتی ہے پھر ارشاداتِ رسول کریم ﷺ ہماری رہ نمائی کرتے ہیں۔ اصحابِ نبوی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا میرے نبی پاک ﷺ کے حضور گفتگو کرنا اور نبی پاک ﷺ کا انہیں بہتر الفاظ و انداز تعلیم فرمانا، اسی طرح اصحاب کی عمدہ باتوں پر ان کی تحسین فرمانا کتبِ احادیث اور کتبِ سیرت میں ہمیں ملتا ہے۔

مثالیں بیان کروں تو حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو کہا کہ ہم ازواجِ رسول ہیں اور ان میں افضل ہیں اور نبی پاک ﷺ کے قرابت دار بھی ہیں لیکن تم تو یہودیہ ہو۔ تو نبی پاک ﷺ نے حضرت صفیہ کو کیا خوب جواب تعلیم فرمایا۔ الاستیعاب، الاصابہ اور طبقات ابن سعد میں وہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے قارئین کی معلومات کے لیے عرض کرتا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ:
تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ میرے باپ حضرت ہارون، میرے چچا حضرت موسیٰ اور میرے شوہر حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔" حضرت صفیہ کے والد حی بن اخطب جس قبیلہ کے سردار تھے وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔

ایک واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت اسماء بنت زید رضی اللہ عنہا کو مسلمان خواتین نے اپنا ترجمان بنا کر بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں بھیجا۔ اس محترم خاتون نے جب اپنی

بات کی تو رسولِ کریم ﷺ نے اپنا رُخِ انور اپنے اصحاب کی طرف کر کے فرمایا کہ کیا تم اپنے دین کے متعلق اس عورت سے بہتر انداز میں کسی کو سوال کرتے سنا ہے؟ یہ واقعہ بھی علامہ ابن عبدالبر کی کتاب الاستیعاب میں ہے۔

اسی طرح کے متعدد واقعات ہیں۔ تنقید کے حوالے سے اشعار کی اصلاح کا ذکر بھی ہے کہ بہتر لفظ تعلیم فرمایا۔ یوں مختصراً یہ بات واضح ہوگئی کہ تنقید کی روایت کتنی قدیم ہے۔ آپ نے موجودہ مذہبی تنقید کی صورت حال بھی دریافت فرمائی ہے۔

خوشتر صاحب! کیا عرض کروں! موجودہ دَور میں وہ لوگ جنہیں "مذہبی" کہا جاتا ہے اِلّا ماشاء اللہ عزوجل مجھے تو مذہب کے ساتھ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ واضح رہے کہ مَیں نے یہ بات سب کے لیے نہیں کہی ہے۔ بنام علما و مشائخ جانے کہاں کہاں کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ سیاست کاروں نے، شوبز نے اور دنیا کی نیرنگیوں نے "مذہبی" طبقے کے بہت سے افراد کو بھی ان آلودگیوں میں ملوث کر دیا ہے جن آلودگیوں کو معاشرے سے دُور کرنا اس مذہبی طبقے کی منصبی ذمہ داری تھی۔ یہ بات تمام مسالک اور مکاتب فکر کے حوالے سے کہہ رہا ہوں۔ الحق مرّ (سچ کڑوا ہوتا ہے) سچی بات یہ ہے کہ علم و تقویٰ کی پاس داری اب کم ہی نظر آتی ہے اور جو سچے اور اچھے ہیں انہی کے دم قدم سے بات بنی ہوئی ہے۔ آپ کسی "شیخِ طریقت" یا "رہبر شریعت" سے ملقب شخصیت کی تحریر و تقریر وغیرہ پر ذرا تنقید کیجئے اور تماشا دیکھیے۔ مجھے شُبہ ہے کہ آپ کو سخت اور نامناسب سلوک کا مستحق ٹھہرایا جائے گا۔ جانے کیوں ایسا بھی ہے کہ شریعت سے زیادہ شخصیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ موجودہ مذہبی تنقید میں یہ بھی ہو رہا ہے کہ لہجہ و انداز اور الفاظ کا برتاؤ کچھ لوگوں کے ہاں نامناسب ہے۔ دلائل و براہین کی زبان میں مناسب انداز اور تحمل کی بجائے ہفوات، ذاتیات اور لغویات کا چلن کچھ زیادہ ہے۔ کورٹ میں وکلاء کو ایک دوسرے کے مقابل خوش اسلوبی سے دلائل بیان کرتے اور ایک دوسرے کا رد کرتے دیکھا جاتا ہے مگر وہ اس طرح باہم الجھ نہیں پڑتے جس طرح اسمبلی کے ارکان پارلیمینٹ میں یا کچھ مذہبی افراد خانقاہ و درس گاہ میں "حسنِ کلام" کرتے دیکھے جاتے ہیں، دھمکیاں دی جانے لگتی ہیں، پمفلٹس اور پوسٹرز ایک دوسرے

کے خلاف شائع ہونے لگتے ہیں- باہمی مقاطعہ ہی نہیں ہوجاتا بلکہ آبروتک پامال کی جاتی
ہے-میری طرح ہر کوئی دوسروں کے لیے یہ رونا روتا ہے مگر اپنی ذات کو شمار نہیں کرتا-**اتــامــرون الــنــاس بــالبــر وتنسون انفسکم الخ** قرآنی آیت بھی انہیں یاد نہیں رہتی-
میری اس تلخ نوائی کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ تنقید کا کوئی بھی رَوادار نہیں رہا- ایسا ہرگز نہیں
ہے- ایسے لوگ اب بھی ہیں جو صدق و اخلاص سے سرگرم عمل ہیں اور انہیں اپنی ذات اپنی
انا، اپنے مفاد اور اپنی عزت سے زیادہ حق وصداقت اور شریعت وسنّت کا پاس رہتا ہے، وہ
احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہی کے لیے خود کو مشغول ومصروف رکھے ہوئے ہیں اور کسی
ملامت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے - اللّٰہ کریم ہم سب کو ہدایت اور صدق و اخلاص سے
نوازے، آمین:

سوال:- بیس ویں صدی میں شرعی علوم سے بے بہرہ افراد نے شریعت کے باب
میں اپنے موہوم خیالات پیش کرنا شروع کیے، یہ روایت اس وقت اکیس ویں صدی میں
اپنے شباب پر ہے-تنقید کے نام پر اس جاہلانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویے کے امّت پر کیا
اثرات مرتب ہوئے اور ہورہے ہیں اور ان اثرات کے ازالے کی دعوتی تدبیر کیا ہے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:- میرے محترم! یہ بات بیس ویں صدی ہی میں نہیں
اس سے پہلے بھی نظر آتی رہی ہے-فرعون اور نمرود نے خدائی کے دعوے کیوں کر دیئے تھے
؟ لوگوں کی جہالت ہی ایسے دعوے داروں کو راہ دیتی ہے- ہمارے معاشرے میں دینیات
سے آگہی کا جذبہ اور چلن حضرت اورنگ زیب عالم گیر علیہ الرحمہ کے بعد ختم کرنے کی
سازشیں کچھ اس طرح ہوئیں کہ لوگوں کو ان سازشوں کا احساس بھی نہیں ہُوا- برعظیم کے
مسلمانوں نے انگریزی ہی نہیں سیکھی انگریزیت بھی سیکھ لی- اپنے نظریات اور اقدار کو مٹتا
دیکھ کر خود مسلمان بھی برانگیختہ نہیں ہوئے- دین داروں نے آوازِ حق اٹھائی تو انہیں طرح
طرح کے الزام دیئے گئے-مغربیت اور مادر پدر آزادی کی راہ میں آج بھی سب سے بڑی
رکاوٹ دین داروں ہی کو سمجھا جاتا ہے- غلط پروپے گنڈا مسلسل ہو تو کچھ لوگ ضرور متاثر
ہوجاتے ہیں-لوگوں کو سازشی طور پر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پڑھے لکھے اور قابل

وہی شمار ہوتے ہیں جو ڈاکٹر، انجینئر اور پی ایچ ڈی ہوتے ہیں اور معاشی سہولتیں انہی لوگوں
کا حصہ ہوتی ہیں- دین والے تو بیک ورڈ اور رجعت پسند ہیں- دیکھا دیکھی اور سنتے سنتے
جانے کتنے یہی بولی بولنے لگے-''علم'' کی تقسیم اور طریقۂ تعلیم کی تبدیلی نے ماحول بدل دیا
اور سب قبول کرتے چلے گئے- علمائے کرام نے اپنی درس گاہوں کو ایک مختصر نصاب کی
روایتی تعلیم تک محدود کر لیا اور ان میں سے اکثر نے اپنے بچوں کو کالج یونی ورسٹی سے آشنا تو
کر دیا لیکن اپنا ورثہ انہیں بکمال منتقل نہیں کیا اور یوں جانے کتنی خانقاہیں اور درس گاہیں اپنی
آب وتاب برقرار نہ رکھ سکیں- آگہی کا کوئی در بند نہیں ہونا چاہیے لیکن علم کے ساتھ حکمت کا
ذکر بھی ہے- آگہی اور دانائی دونوں لازم وملزوم رہیں-تعلیم کسی قدر رہی مگر تربیت نہ ہوئی
-علم نافع کے ساتھ فہم واقع ہی سینے کو سمندر کرتی ہے-لوگ ماحول سے متاثر ہونے لگے مگر
ماحول کو متاثر کرنے والے کم ہوتے گئے، نتیجے میں دینیات سے بے بہرہ لوگوں نے اپنے
موہوم خیالات کو رواج دینے کی سازش کی- معاشرے میں جہالت نہ ہوتی تو یہ لوگ کبھی
پنپ نہ پاتے-''غیروں'' نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا، آج اس کے شدید اثرات
ہمارے سامنے ہیں- یہ اثرات ایمانی کمزوری، بے راہ روی، بدعملی، اخلاقی بگاڑ اور اقدار کی
پامالی کی صورت میں ظاہر ہوئے- خوشی ہے کہ اس بات کا احساس ہوگیا ہے- مرض معلوم
ہوجائے تو علاج آسان ہوجاتا ہے-ان مفسد اثرات کے ازالے کے لیے ضرورت ہے کہ
ہر مسلمان اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ صحیح اور ضروری
تعلیم عام ہو- مساجد کے ائمہ وخطباء اور مبلغین ومقررین تعلیم یافتہ ہوں، ان کی باقاعدہ
تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ نمازیوں، مقتدیوں اور سامعین کی صحیح رہ نمائی کرسکیں اور مثبت
اثرات مرتب کرسکیں- پاکستان میں جماعتِ اہلِ سنّت مرکزی نمائندہ تنظیم ہے، آپ کے
ہاں بھی کوئی مرکزی تنظیم ہوگی وہ اس کام کو منظّم طور پر کرسکتی ہے-''حکیمانہ دعوتی تدبیر''
میری دانست میں فوری طور پر یہی ہے کہ جن ذرائع اور جس شدومد سے مسلسل غلط پروپیگنڈا
ہو رہا ہے اسی اہتمام اور انہی ذرائع سے حقائق نہایت عمدہ پیرائے میں تسلسل سے پیش کیے
جائیں- پردے اٹھادیئے جائیں تو اجالا روکا نہیں جاسکتا اور حقیقت خود کو منوا کر رہتی ہے-

علم اور کردار کے حوالے سے جو کمزوریاں ہیں وہ دور نہ کی گئیں تو کسی مثبت نتیجے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

خوشتر صاحب! آج معاشرے میں دین و ایمان کی وہ فی الواقع اہمیت نہیں رہی جو ہونی چاہیے۔ہمیں اپنی مساجد و مدارس کو پھر ویسا بنانا ہوگا کہ لوگ ان سے پوری وابستگی پسند کریں۔ مساجد و مدارس معاشرے کی دینی علمی اخلاقی رہ نمائی اور معاونت کے مراکز ہوجائیں تو ان شاء اللہ ہر ایک کی زندگی میں شریعت وسنّت ہی کی عمل داری ہوگی پھر موہوم اور مذموم خیالات پیش کرنے کی جرأت ہی کم ہوگی اور کوئی جسارت کرے گا تو پنپ نہیں سکے گا۔

سوال:- آج یہ وسیع وعریض دنیا، جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ایک چھوٹے گاؤں کی شکل اختیار کرگئی ہے۔آپ اپنی بین الاقوامی دعوتی تجربات کی روشنی میں بتائیں کہ اس ماحول میں نئی نسل کو دعوت وتبلیغ کے لیے کس قسم کی تیاریاں کرنی چاہئیں اور انہیں اپنی سوچ و فکر اور کردار وعمل کو کس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:- آپ کے اس سوال کے جواب میں پہلے تو یہ کہوں گا کہ انسان کو باور کرایا جائے کہ یہ ساری کائنات اس کے لیے ہے وہ ان سب کے لیے نہیں ہے، یہ بات بہت اہم ہے کیوں کہ ٹیکنالوجی سے متاثر اور اس کا اسیر ہونے والا انسان آج خود اپنی پہچان نہیں رکھتا - وہ دیکھے کہ یہ ٹیکنالوجی انسانی عقل کی کرشمہ کاری ہے۔ اسے خالق عقل رب تعالیٰ کی معرفت کی طرف راغب کرنے کے لیے سائنسی ایجادات اور کرشماتی ٹیکنالوجی ہی کے ذریعے حقائق باور کروائے جائیں۔ امریکا کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں ''ایئر اینڈ اسپیس میوزیم'' کو دیکھ کر وہاں کی جارج میسن یونی ورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے مجھے دینی حقائق سمجھانے میں بہت آسانی ہوئی۔ جغرافیا کی مقدور بھر معلومات کی وجہ سے سمتِ قبلہ اور اختلاف مطالع اور رویتِ ہلال پر بات کرسکا، اپنے تمام تجربات بیان کروں تو بات طویل ہوجائے گی - ان تجربات کی روشنی میں تیاریوں کے لیے بات کرتا ہوں۔

● نئی نسل کو اپنی مادری زبان کے علاوہ عربی اور انگریزی زبان اتنی ضرور سیکھنی چاہیے کہ مطالعہ و گفتگو ہوسکے۔
● اپنے اسلاف قابل ذکر اسلامی اسکالرز کے علمی تحقیقی کارہائے نمایاں کی معلومات ہونی چاہئیں۔
● دینی حقائق اور اسلامی تعلیمات کو عقلی دلائل کے ساتھ بھی سمجھانے کی اہلیت پیدا کرنی چاہیے۔
● تقابل ادیان کے حوالے سے ضروری معلومات ہونی چاہئیں۔
● دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور ایجادات سے آگہی رکھنی چاہیے۔مگر ان سب سے پہلے اسلامی اعتقادات اور حقانیت اسلام کی شرح صدر تک یقینی آگہی اور ان پر شدید پختگی ضروری ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ داعی و مبلغ کو کسی اللہ والے کا فیضان تربیت اور روحانی توجہ حاصل ہو کہ اس کے بغیر اثر پذیری نہیں ہوتی۔

کردار وعمل اور سوچ وفکر کے حوالے سے عرض کروں کہ ضبطِ نفس اور صدق و اخلاص از بس لازمی ہیں اور مطالعہ وتحقیق سے شغف مسلسل رہے۔ ہمارے علمائے ربّانی صوفیہ کرام ہمارے لیے فکری وعلمی بہترین نمونہ ہیں کہ وہ ایمان وتقویٰ اور شریعت وسنّت پر استقامت کے پیکر جمیل تھے۔ دل نواز سخن، دل گداز محبت اور عمل پیہم سے انہوں نے انقلابی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان کی سیرت وسوانح کا دلچسپی سے مطالعہ بھی اثر کرتا ہے۔ یاد رہے کہ اب گلوبل ولیج کہلانے والی اس دنیا میں ٹیکنالوجی کی بہتات نے انسان کو وہ راحت وتسکین نہیں پہنچائی جس کے لیے وہ سرگرداں ہے۔ یہ آسودگی اور طمانیت ایمان و روحانیت ہی کے دامن میں ہے اور ایمان وروحانیت کی یہ دنیا محض کسی پوشاک یا کچھ رسوم کا نام نہیں یہ تو قلب وذہن کی تہذیب وتطہیر کرنے اور للّٰہیت کا پیکر بن جانے کا نام ہے اور بحمدہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے دنیا خالی نہیں۔

سوال:- آج اسلامی دعوت کو مغرب سے کتنا خطرہ ہے؟ خصوصاً 11 ستمبر کے حادثے کا اس پر کیا اثر مرتب ہُوا؟

مولانا کوکب نورانی اکاڑوی:-محترم خوشتر نورانی صاحب! میرا خیال ہے کہ اسلامی دعوت کو مغرب سے کوئی خطرہ نہیں، البتہ مسلم معاشرے کو ضرور خطرہ ہے کیوں کہ آسائشوں میں مسلمان کے جوہر نہیں کھلتے - لفظ مغرب کے حوالے سے ایک جملہ پہلے بھی کہیں لکھا تھا، آپ کے قارئین کے لیے پھر کہتا ہوں: ''سورج روزانہ مغرب میں غروب ہوکر یہ پیغام دیتا ہے کہ ''مغرب'' کی طرف جانے والو ڈوب جاؤ گے-'' مجھے وہ حدیث شریف بھی یاد آ رہی ہے جو بخاری شریف، کتاب المغازی میں ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اپنی امّت سے شرک کا خوف نہیں مگر اس کا خدشہ ہے کہ میری امّت دنیا کو پسند کرنے لگے گی - یعنی دنیا کی رغبت زیادہ ہوجائے گی - احوال ہمارے سامنے ہیں - ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی مگر آپ کسی کو دنیا کی کسی چیز سے روک کر دیکھیے اور پھر سنیے کہ کیسے کیسے جواب ملتے ہیں - مغرب کی ظاہری چمک دمک نے خود مسلمان کہلانے والے جانے کتنوں کو دین اور تقوی سے دُور کیا ہے - رہے ''غیر'' تو وہ گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد اس غلط پروپیگنڈے کے زیر اثر ہیں جو سازش کے تحت سامراجی قوتیں کر رہی ہیں مگر ''**الانسان حریص علی مامنع**'' (انسان اس کی حرص کرتا ہے جس سے اس کو منع کیا جائے) - غیروں کا یہ سازشی غلط پروپیگنڈا ہی ان کے اپنوں کو حقیقت جاننے کی طرف مائل کرے گا اور ایسا ہو رہا ہے -

نائن الیون کا سانحہ تو عالم اسلام کے لیے (ویک اپ کال) wake up call صدائے بے داری تھی لیکن مجھے اظہار ملال کے سوا چارہ نہیں کہ بے حسی اور بزدلی ہی کا مظاہرہ ہُوا - آپ نے دیکھا ہوگا کہ ''سونامی'' کے سانحے پر توبہ کی بجائے ناچ گانے ہی کی محفلیں سجائی گئیں - آج مسلمان **رحماء بینهم** اور **اشداء علی الکفار** کی بجائے اپنوں سے معاندانہ اور دشمنوں سے دوستانہ رویہ اپنائے نظر آتا ہے - ہر چند کہ سبھی کا یہ حال نہیں تاہم جس قدر بھی ہے قابل افسوس ہے - گیارہ ستمبر کے حادثے سے فوری طور پر یہ نقصان پہنچا کہ وہ مغرب جہاں مسلمان مقیم و مسافر آسانی اور آزادی سے گھومتا پھرتا رہتا اور اپنی عبادات ادا کرتا تھا اب اس کے لیے وہ آسانی اور آزادی نہیں رہی - ہر مسلمان کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا اور اس کے بارے میں رائے منفی ہوگئی - باشرع لباس و انداز میں حضرات و خواتین کا

سرِ عام نکلنا وہاں خاصی حد تک غیر محفوظ ہوگیا - کہیں کہیں اس شدت میں کچھ کمی ہوئی ہے لیکن اب وہاں اسلامی دعوت دینا خود کو مشکلات میں ڈالنا سمجھا جاتا ہے اور اس سانحے کے بعد دنیا بھر میں داعیوں اور مبلغوں کو دشواریاں ہیں - اکثر و بیش تر صرف یہی واضح کرنے میں مشغول ہیں کہ ہم امن پسند ہیں اور دہشت گردی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، یعنی انہیں اپنا تعارف اور تعریف منوانے کی ضرورت پڑ گئی - بلاشبہ اسلام اور مسلمان سلامتی اور امن ہی سے عبارت ہیں مگر مسلمان کہلانے والوں میں ''اسلام'' ان کا دین عملاً نظر آنا چاہیے اور مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کا ہر طرح مسلسل عملی مظاہرہ کرنا چاہیے - جہاد کی بات کرنے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے بلکہ جہاد کے خلاف غلط پروپیگنڈے کو بے نقاب کرنا چاہیے -

سانحے رونما ہوتے ہیں تو خوابیدہ قوتیں بے دار اور غفلتیں دور ہوتی ہیں اور صحیح سمت میں قوتِ عمل تیز ہوتی ہے - لیکن ملتِ اسلامیہ کو سچی اور مخلص قیادت شاید میسر نہیں اور ذہن سازی کرنے والی تبلیغ نہیں ہو رہی - اس سانحے کے بعد اسلامی دعوت کا کام زیادہ اور بھرپور ہونا چاہیے تھا - مروجہ طریقِ دعوت میں پائے جانے والے اسقام و معائب دُور کر کے صحیح اور مؤثر انداز اپنانے چاہیے تھے مگر لگتا ہے کہ اس سانحے سے بے داری نہیں لوگوں میں بے زاری آئی ہے - وہ جو کہا جاتا ہے کہ ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے - غیروں کا تشدد اور ظلم خود ان کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور ان شاء اللّٰہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش بے نقاب اور ناکام ہوگی -

سوال:- جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب:-''جام نور'' کو اپنے نام اور عنوان کا مکمل آئینہ بنایئے - روشنی راستہ بناتی بھی ہے اور راستہ بتاتی بھی ہے - روشنی ہی سے سفر آسان اور درست رہتا ہے - روشنی ہی غفلتوں اور تاریکیوں کو دُور کرتی ہے - اتنی روشنی پھیلایئے کہ ہر تاریکی دم توڑ دے - اللّٰہ کرے کہ آپ کا یہ مجلّہ ملّت کی بے داری میں نمایاں کردار ادا کرے اور واقعی ملت کا ترجمان ثابت ہو - □□□

(شمارہ جون ۲۰۰۵ء)

مولانا مبارک حسین مصباحی

مدیر اعلیٰ: ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ (یوپی)

الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے استاذ، ماہنامہ اشرفیہ کے مدیر اعلیٰ، درجن بھر کتابوں کے مصنف مولانا مبارک حسین مصباحی (پ: اکتوبر ۱۹۶۷) ملک گیر شہرت کے حامل ہیں- زبان وقلم پر یکساں قدرت ہے- آپ کی تحریر وتقریر میں زیادہ اچھا کیا ہے، یہ فیصلہ کرنا کبھی کبھی مشکل ہوجاتا ہے- زبان میں شائستگی، اسلوب میں سادگی و روانی اور فکر میں پختگی ہے- آپ کی کتاب 'افتراق بین المسلمین کے اسباب' (۲۰۰۲) برصغیر میں پیدا ہونے والے مذہبی فتنوں اور مسلکی تعصّبات پر سنجیدہ علمی کوشش ہے- اب تک ہندو پاک سے اس کی کئی اشاعتیں ہوچکی ہیں- اس کے علاوہ آپ کی دوسری کتابیں 'شہر خموشاں کے چراغ'، جہان رئیس القلم، اسلام اور ہندوستانی مذاہب، عشق رضا کی سرفرازیاں، مدارس اسلامیہ اور خلیج کا بحران بھی مذہبی وعلمی حلقوں میں مقبول رہی ہیں- ۱۹۸۹ء میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور سے آپ کی فراغت ہوئی- بعد ازاں مگدھ یونیورسٹی گیا سے ایم-اے کیا اور پھر ایک ساتھ تحریر، تدریس اور تقریر کے ذریعے دینی وملی خدمات سے وابستہ ہوگئے، جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے- مبارک پور میں المجمع المصباحی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ اور شاہ آباد رام پور میں جامعہ طیبہ کے نام سے ایک دینی وتعلیمی ادارہ بھی چلا رہے ہیں- چند سالوں قبل الجامعۃ الاشرفیہ میں تنظیم ابنائے اشرفیہ کا قیام عمل میں آیا، آپ کو جنرل سکریٹری کا منصب دیا گیا- یہ تنظیم بھی موصوف کی قیادت میں اپنی بساط بھر کام کررہی ہے- اس کے علاوہ آپ کو ۲۰۰۹ء میں قومی وملی مسائل کے حل کی نمائندہ تنظیم 'آل انڈیا مدرسہ کوآرڈی نیشن کمیٹی' دہلی کا کنوینر بھی بنایا گیا ہے-

سوال:- الجامعۃ الاشرفیہ کی حالیہ علمی، دینی وتبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ روشنی ڈالیں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور اپنے علمی، دینی اور تبلیغی کارناموں کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہے اور مقام مسرت ہے کہ اس کا دائرہ دین ودانش کے مختلف شعبوں میں روز افزوں اور ترقی پذیر ہے- جامعہ کا تعلیمی نظام مختلف شعبوں پر مشتمل ہے- درس نظامی کے بعد شعبۂ تقابل ادیان ہے، شعبۂ تخصیص فی الفقہ ہے، شعبۂ تربیت تدریس ہے، شعبۂ تربیت افتا ہے اور تمام شعبے متحرک وفعال ہیں جن کے حوصلہ افزا نتائج دن بدن سامنے آرہے ہیں- یہ ایک سچائی ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ جامعہ کے ابنائے قدیم اور حالیہ فارغین علمی فکری اور اخلاقی اعتبار سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں سنّیت اور مصباحیت کا نقش چھوڑ جاتے ہیں- تعلیمی نظام کے علاوہ جامعہ میں مجلس شرعی ہے جس کا سالانہ فقہی سیمینار ہوتا ہے- سیمینار میں جدید فقہی مسائل پر اہل علم اور اہل افتاء مقالات پیش کرتے ہیں، گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں اور اتفاق رائے سے مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے- اب تک کامیاب سولہ سیمینار ہوچکے ہیں- حل شدہ مسائل کی تفصیل ماہنامہ اشرفیہ کے خصوصی شماروں میں دیکھی جاسکتی ہیں- مقالات اور فیصلوں کی ترتیب واشاعت کا کام محقق مسائل جدیدہ مفتی محمد نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتاء جامعہ اشرفیہ کی نگرانی میں بڑی تیزی کے ساتھ ہورہا ہے-

آپ بخوبی واقف ہیں کہ اب تک اہل سنت کی درس گاہوں میں غیر اہل سنت کے مکتبوں کی مطبوعہ کتابیں داخل درس تھیں اور انہیں کے حواشی پڑھائے جاتے تھے جو پوری جماعت کے لیے شرم کی بات تھی بفضلہٖ تعالیٰ دیگر علمی امور کی طرح اس سمت میں بھی جامعہ اشرفیہ نے پیش رفت کی- امین ملت پروفیسر سید محمد امین میاں برکاتی سجادہ نشین خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کی سرپرستی میں ''مجلس برکات'' کا قیام عمل میں آیا- علامہ محمد احمد مصباحی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ کی نگرانی میں درسی کتابوں پر نظر ثانی اور اہل سنت کے حواشی کے

ساتھ اشاعتی سلسلہ شروع ہوا اور علماے اہل سنت کے جدید وقدیم حواشی کے ساتھ قریب قریب موجودہ مکمل نصاب منظر عام پر آچکا ہے- عصری تقاضوں کے پیش نظر نئی کتابیں بھی تصنیف واشاعت کے دور سے گزر رہی ہیں- تنظیم المدارس کا قیام بھی جامعہ اشرفیہ کا ایک اہم اقدام ہے- اس کا بنیادی مقصد ملک بھر کے مدارس میں یکساں نظام ونصاب کو رواج دینا ہے- اسی کے تحت بدلتے حالات کے پیش نظر ایک نصاب تعلیم مرتب کیا گیا ہے جو امسال سے جامعہ اشرفیہ اور ملک کی دیگر درس گاہوں میں جاری بھی ہوگیا ہے- تبلیغی میدان میں بھی جامعہ اور اس کے فرزندوں کی خدمات بڑی اہم اور حوصلہ افزاں ہیں- جامعہ اشرفیہ کی علمی، دینی اور تبلیغی خدمات کا ایک عالم معترف ہے- مزید تفصیل کا یہاں موقع نہیں-

سوال:- کیا الجامعۃ الاشرفیہ کو آج یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ امام احمد رضا فاضل بریلوی اور سواد اعظم علماے اہل سنت کے مسلک عشق وعرفان کا ترجمان ہے؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- آپ کا یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ کیا سورج کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اس سے روشنی پھیلتی ہے- امام احمد رضا قدس سرہ اور اسلاف کے مسلک عشق وعرفان کی ترجمانی جامعہ اشرفیہ کا بنیادی مقصد ہے- ایک صدی کے دامن پر پھیلی ہوئی اس کی خدمات گواہ ہیں کہ اس نے امام احمد رضا محدث بریلوی کے ملک عشق وعرفان کے لیے صرف نعرے نہیں لگائے اور نہ اس نے مسلک اعلیٰ حضرت کا استعمال اپنے مخفی مفادات کے تحفظ کے لیے کیا ہے- بلکہ رضویات کے حوالے سے جامعہ اشرفیہ اور فرزندان اشرفیہ نے مخلصانہ ٹھوس علمی خدمات انجام دی ہیں- فتاویٰ رضویہ جو امام احمد رضا کا سب سے اہم علمی اور قلمی شاہ کار ہے اس کی ترتیب وتحقیق اور اولین اشاعت کا کارنامہ جامعہ اشرفیہ ہی نے انجام دیا ہے- ایک بار حضور مفتی اعظم ہند نور اللہ مرقدہ الجامعۃ الاشرفیہ تشریف لائے، اساتذۂ اشرفیہ نے عرض کیا حضور! فتاویٰ رضویہ کی ترتیب واشاعت ہونا چاہیے- حضور مفتی اعظم ہند نے ارشاد فرمایا اس اہم کام کے لیے آپ حضرات سے بہتر کون ہوگا- حضور مفتی اعظم ہند کے اس ارشاد کے بعد حضور حافظ ملت اور ان کے تلامذہ نے سنی دار الاشاعت قائم کیا- اور حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب نائب شیخ الحدیث

جامعہ اشرفیہ فتاوی رضویہ کی ترتیب واشاعت میں لگ گئے- ان کے بعد جامعہ کے شیخ الحدیث بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی صاحب نے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا- آج فتاویٰ رضویہ کی جو ۱۲ جلدیں منظر عام پر ہیں ان میں سے اکثر جلدوں کی ترتیب وتحقیق اور اولین اشاعت کا کریڈٹ جامعہ اشرفیہ کو جاتا ہے- اس کے علاوہ جدُّ الممتار کی ترتیب واشاعت، کنز الایمان اور حدائق بخشش پر نظر ثانی کا کام بھی فرزندانِ اشرفیہ نے انجام دیا- بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں امام احمد رضا قدس سرُّ ہ کے تعارف میں جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں ایک بڑا حصہ فرزندان اشرفیہ کا قلمی وفکری کارنامہ ہے- علامہ بدر الدین مصباحی، مولانا نسیم بستوی مصباحی، علامہ محمد احمد مصباحی، علامہ یٰسٓ اختر مصباحی اور علامہ عبد المبین نعمانی وغیرہ فرزندان اشرفیہ نے رضا شناسی کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا- المیز ان ممبئی کا امام احمد رضا نمبر بھی ایک مصباحی فرزند کا کارنامہ ہے، اور آج بھی نئے فارغین میں جو رضویات کے حوالے سے کام ہو رہا ہے ان میں اکثریت مصباحی ارباب قلم کی ہے-

سوال:- کچھ عناصر الجامعۃ الاشرفیہ کی علمی قیادت، دینی خدمات اور مسلکی حمیت پر سوالیہ نشان کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایسے افراد کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- الجامعۃ الاشرفیہ کی علمی قیادت، دینی خدمت اور مسلکی حمایت شمس در کف حقیقت ہے- سورج پر گرد اڑانے سے سورج کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ گرد اڑانے والوں کے چہرے خود گرد آلود ہو جاتے ہیں- خلیفۂ صدر الشریعہ حضرت علامہ شاہ امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا- ''جو اشرفیہ کی مخالفت کرے گا، ذلیل ہوگا، ذلیل ہوگا، ذلیل ہوگا-'' سوالیہ نشان کھڑے کرنے والے بے وقعت افراد ہیں، جن کی نہ علمی حیثیت ہے نہ سماجی عزت- ان کا مقصد جماعتی سطح پر کچھ مسائل کھڑے کر کے اپنی روٹیاں سینکنا ہے- ہم یہاں ان کا ذکر کر کے ان کی روزی روٹی پر لات نہیں مارنا چاہتے-

سوال:- آج سے تقریباً دو سال قبل تنظیم ابنائے اشرفیہ کی تجدید واحیا آپ کی قیادت میں عمل میں آئی، اس بیچ قومی اور ملی سطح پر بہت سے بڑے بڑے مسائل سامنے

آئے مگران میں تنظیم ابنائے اشرفیہ کہیں بھی نظر نہیں آئی، آخر کیوں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی :- تجدید واحیا نہیں، بلکہ عزیز ملت حضرت مولانا شاہ عبدالحفیظ صاحب سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کی قیادت میں قیام عمل میں آیا- میری حیثیت ایک معمولی خادم کی ہے- جہاں تک کارکردگی کا سوال ہے، تنظیم اپنی بساط کے مطابق مسلسل سرگرم عمل ہے- وہ ہر اہم مسئلے پر آواز بلند کرتی رہی ہے- آپ کو اس کا علم نہیں حیرت ہے- تنظیم اپنے طے شدہ نشانوں پر عمل کے لیے کوشاں ہے- ابھی تک ہماری زیادہ توجہ ضلعی شاخوں کے قیام پر مرکوز رہی ہے- دہلی، کلکتہ اور ممبئی کے بعد پورے اتر پردیش میں ہم شاخوں کے قیام کا عمل تقریباً مکمل کر چکے ہیں- اب ملک کے دیگر صوبوں کی جانب پیش رفت کر رہے ہیں- شاید آپ جس انداز سے نظر آنے کی بات کر رہے ہیں اس سلسلے میں دو چیزیں حائل ہیں- جماعتی افراد میں تنظیمی مزاج کا فقدان اور مسائل کے حل کے لیے وسائل کا فقدان- مگر ہم مایوس نہیں ہیں تنظیمی ڈھانچہ کھڑا کرنے کے لیے دو سال کی مدت ہی کیا ہے- اس کے لیے ابھی برسوں درکار ہوں گے-

سوال :- تنظیم ابنائے اشرفیہ کے بینر تلے آپ کس طرح کے کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس تنظیم کو فعال بنانے میں کس طرح کی رکاوٹیں درپیش ہیں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی :- تنظیم ابنائے اشرفیہ کے اغراض ومقاصد طے شدہ ہیں- جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں- تنظیم کا بنیادی مقصد دعوت وتبلیغ اور دین وملت کی صاف وشفاف خدمت ورہنمائی ہے- جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ ہمارے یہاں مل بیٹھ کر مسائل حل کرنے اور کاندھے سے کاندھا ملا کر آگے بڑھنے کا مزاج نہیں- اس سلسلے میں ہم مسلسل ذہن سازی کر رہے ہیں اور نئی نسلوں سے بڑی حد تک پرامید ہیں-

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں پیروں، خطیبوں، عرسوں اور مدرسوں کے لیے پیسہ خرچ کرنا تو ثواب سمجھتے ہیں اور قومی اور ملی مسائل کے لیے پیسہ خرچ کرنا عبث تصور کرتے ہیں- جب کہ غیر اہل سنت میں اس مد پر بھی کثیر سرمایہ خرچ کرنے کا مزاج ہے- سب سے اہم مسئلہ ہمارے سامنے کثیر سرمایہ کا فقدان ہے-

سوال :- مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ سے اشتراک کے ساتھ یا انفرادی طور پر کیا تنظیم ابنائے اشرفیہ کو قابل قدر پیش رفت نہیں کرنی چاہیے؟

مولانا مبارک حسین مصباحی :- تنظیم کو مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ سے اشتراک کی کوئی ضرورت نہیں- ان کا الگ پلیٹ فارم ہے اور ہمارا الگ، وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اور ہم اپنے طور پر آگے بڑھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں-

سوال (۷):- آپ کے زیر ادارت الجامعۃ الاشرفیہ کا علمی ترجمان ماہنامہ اشرفیہ بڑی کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے- آپ اپنے تجربات کی روشنی میں بتائیں کہ ایک کامیاب رسالہ نکالنے کے لیے کس طرح کی صلاحیت اور محنت درکار ہے اور اس راہ میں کتنی دشواریاں درپیش ہوتی ہیں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی :- بفضلہٖ تعالیٰ جامعہ اشرفیہ کا علمی ترجمان ماہنامہ اشرفیہ گزشتہ ۳۲ برس سے پوری پابندی کے ساتھ جاری ہے اور دن بدن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے- ایک کامیاب رسالہ نکالنے کے لیے قلمی صلاحیت، فکری، بلندی، بیدار مغزی، وسیع النظری کی ضرورت ہے- دینی اور علمی رسالہ نکالنے کے لیے ایک اچھے عالم ہونے کے ساتھ ضروری ہے کہ اس کی نظر بساطِ سیاست اور ملی مسائل پر بھی گہری ہو- صحافت انتہائی دشوار رہ گزر ہے- ہر ماہ قارئین کو دل ودماغ کا تازہ خون دینا پڑتا ہے- مذہبی رسائل کو اشتہار بھی نہیں ملتے- غیر شرعی اشتہارات سے وہ خود گریزاں رہتے ہیں اس لیے سب سے اہم مسئلہ سرمایہ کی قلت کا ہوتا ہے- اسی وجہ سے اکثر رسائل وجرائد بند ہو جاتے ہیں اور تمام لوگ اس ڈگر پر چلنے کی ہمت نہیں کرتے-

حضرت حافظ ملت فرماتے تھے- ''سب سے آسان کام تقریر، اس سے مشکل تدریس اور سب سے مشکل تحریر ہے'' اور ظاہر سی بات ہے کہ پرنٹ میڈیا تحریر وقلم ہی سے عبارت ہے- اس لیے صحافت انتہائی مشکل میدان ہے- جو لوگ اس راہ میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں وہ قابلِ مبارک باد ہیں-

سوال :- ابنائے اشرفیہ، الجامعۃ الاشرفیہ کے بانی حافظ ملت مولانا عبدالعزیز

محدث مرادآبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور سربراہ اعلیٰ مولانا عبدالحفیظ صاحب قبلہ کی امیدوں پر کتنے اتر رہے ہیں-یعنی آپ اپنے ابنا سے کتنے مطمئن اور پرامید ہیں؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- حضور حافظ ملت اس عالم میں دنیا سے تشریف لے گئے کہ وہ اپنے تلامذہ سے خوش تھے-حضرت عزیز ملت کی امیدوں پر ابنائے اشرفیہ کتنے پورے اتر رہے ہیں یہ سوال آپ ان ہی سے کریں ویسے مجموعی اعتبار سے جامعہ اشرفیہ اپنے فرزندوں سے مطمئن اور پرامید ہے- اس لیے کہ فرزندانِ اشرفیہ کی اکثریت جامعہ کی وفادار ہے اور وہ ملک و بیرون ملک میں دین و دانش کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں- اور یہی حضرت عزیز ملت کی شب و روز محنت کا مقصد بھی ہے- جہاں تک غداروں کی بات ہے تو وہ کم و بیش ہر جماعت میں ہوتے ہیں-

سوال:- جماعت اہل سنت میں اتحاد و اتفاق وقت کی ضرورت ہے-آپ فرمائیں کہ اس کار عظیم کو کیسے کیا جائے؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- حافظ ملت فرماتے تھے: ''اتفاق زندگی ہے اور اختلاف موت'' یہ تو سچ ہے کہ آج جماعت میں انتشار ہے مگر اس انتشار کی بنیاد اخلاص کا فقدان، اور اپنے اپنے مخفی مفادات کا تحفظ ہے- ہر شخص صف اول میں رہنا چاہتا ہے- اگر اخلاص ہو اور ہر شخص دوسری صف میں کھڑے ہونے کے لیے تیار ہو جائے تو یہ انتشار بڑی حد تک ختم ہو سکتا ہے، مگر واضح رہے کہ اس انتشار میں ملوث کم لوگ ہیں- اکثریت آج بھی فکری اور عملی اعتبار سے متحد ہے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف عمل ہے دراصل بعض لوگ اس فطرت کے ہوتے ہیں کہ دینی اور جماعتی فلاح و بہبود کے لیے نہ خود کچھ کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں- حالیہ انتشار کے تعلق سے ایک بزرگ سے میں نے اپنے درد کا ذکر کیا تو بڑی سنجیدگی سے انہوں نے جواب دیا کہ اس قسم کے سازشی ذہن رکھنے والوں سے گفتگو کے ذریعہ اتفاق کی کوئی امید نہیں بس اتحاد کی ایک ہی صورت ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ انہیں اخلاص و ہدایت عطا فرما دے یا انہیں زمین سے اٹھا لے-

سوال:- ملی قیادت کی سطح پر ہماری نمائندگی کیسے ہو؟ کیا دشواریاں ہیں اس راہ کی

اور آپ کی نظر میں ان کا حل کیا ہے؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- ملی قیادت کے حوالے سے جہاں تک ہماری نمائندگی کا سوال ہے تو آزادی سے پہلے علمائے اہل سنت کی نمائندگی بھرپور تھی خاص طور پر انقلاب ۱۸۵۷ء میں علمائے اہل سنت ہی ہر محاذ پر پیش پیش رہے مگر آزادی کے بعد اکثر باصلاحیت افراد پاکستان منتقل ہو گئے- جو بچے وہ اپنے مدارس، اپنی خانقاہوں اور اپنے مذہب کے تحفظ میں لگ گئے- عام طور پر ملی اور سیاسی میدانوں سے علمائے اہل سنت کنارہ کش رہے، انفرادی طور پر جو ملی سیاست میں آئے انہوں نے جماعت کی نمائندگی کم اور پارٹیوں کی وفاداری زیادہ کی اور اس سلسلے میں غیر اہل سنت کے سیاسی علما بھی مبرّا نہیں- اس جمہوری دور میں ملی قیادت کی نمائندگی کے لیے تنظیمی ڈھانچہ ضروری ہے جب تک مضبوط تنظیمی پلیٹ فارم نہیں ہوگا ملی قیادت کی سطح پر ہماری بھرپور نمائندگی کا فقدان رہے گا-

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

مولانا مبارک حسین مصباحی:- جام نور کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیں اور قارئین سے گزارش ہے کہ جام نور کو مشائخ اہل سنت کی سرپرستی حاصل ہے- یہ ملت کا بے باک ترجمان ہے- اس میں حدیث و قرآن اور فقہ کے حوالے سے اہم مضامین ہوتے ہیں، اصلاح امت کا سامان بھی ہوتا ہے- اس کو خرید کر پڑھنا اور دوسروں تک پہنچانا باعث اجر و ثواب ہے-□□□

(شمارہ مئی ۲۰۰۹ء)

مفتی محمد خان قادری

سربراہ: جامعہ اسلامیہ، لاہور، پاکستان

نئے عہد میں مذہب کی قدیم روایت کو اس کے جدید تقاضوں کے ساتھ پیش کرنے کے لیے جن جواں عزم ہستیوں نے قدم بڑھایا ان میں مفتی محمد خاں قادری کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے- آپ جہاں ایک باصلاحیت عالم دین اور مفتی وفقیہ ہیں وہیں ایک روشن خیال دانشور اور محقق بھی ہیں- ۱۹۴۹ء میں ضلع نارووال (پاکستان) میں پیدا ہوئے، مڈل تک اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دینی علم کی تحصیل میں مصروف ہوئے، حفظ قرآن کے بعد درس نظامیہ کا آغاز کیا- مولانا عبدالحکیم شرف قادری اور مولانا احمد اشرف سیالوی کے زیر سایہ ۱۹۶۷ء میں اپنی تعلیم مکمل کی، سالہا سال تک روایتی تدریس وتقریر کے بعد دور جدید کے تقاضے کی تکمیل اور قدیم و جدید علوم کی اشاعت کے لیے پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری کے ساتھ مل کر مدرسہ منہاج القرآن قائم کیا، مگر اپنی دانست میں مشن کو ناکام ہوتا دیکھ کر ۱۹۹۱ء میں اس سے الگ ہوگئے، پھر اپنی ذاتی کوششوں سے جامعہ اسلامیہ لاہور کی بنیاد رکھی جہاں نئی نسل کی بہتر تعلیم وتربیت کا کام اعلیٰ پیمانے پر جاری ہے- اس وقت آپ کا شمار پاکستان کے چند معتبر اور سرکردہ علما میں ہوتا ہے- آپ درجنوں علمی وتحقیقی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں، معاشرے کی اصلاح، قدیم وجدید میں ہم آہنگی اور اعتدال اور تعمیری لٹریچرز کی اشاعت آپ کی زندگی کا مشن ہے اور آپ اس کے لیے مسلسل کوشاں ہیں- آپ کی زیر نگرانی علمی، فکری اور قلمی تربیت پانے والے بہت سے تلامذہ آپ کے اسی مشن پر کام کر رہے ہیں، جن علمی وقلمی کاوشیں مختلف شکلوں میں منظر عام پر آ رہی ہیں-

مولانا منشا تابش قصوری

استاذ: جامعہ نظامیہ، لاہور، پاکستان

دیوبندی جماعت کے اکابر کی متنازع عبارتوں کو ہندو پاک کی جن معتبر شخصیتوں نے عوام کی عدالت میں پیش کیا ان میں مولانا منشا تابش قصوری کی شخصیت بھی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے- ''دعوت فکر'' آپ کا وہ معروف ومقبول رسالہ ہے جس نے اکابر دیوبند کی کتابوں کی تقریباً سبھی متنازع عبارتوں کا عکس ایک ساتھ عوام وخواص کے سامنے پیش کر دیا اور بمصداق ''آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا'' دن کے اجالے میں ان عبارتوں کی حقیقت بے حجاب ہوگئی- اس سلسلے کی عالمی شہرت کی حامل کتاب ''زلزلہ'' کی پاکستان میں اولین اشاعت کا سہرا بھی آپ ہی کے سر جاتا ہے- آپ تقسیم وطن سے ۳؍سال قبل ۱۹۴۴ء میں ہری ہر ضلع قصور (حالیہ پاکستان) میں پیدا ہوئے- میٹرک کے بعد دینی تعلیم کی طرف مائل ہوئے، ۱۹۶۳ء سے تعلیمی فراغت کے بعد مختلف انداز میں خدمت دین سے وابستہ ہیں- مرکزی مجلس رضا لاہور اور رضا اکیڈمی لاہور کی اشاعتی سرگرمیوں میں بھی آپ کا خاصا علمی تعاون ہے- آپ جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں شعبۂ فارسی کے استاد اور شعبۂ نشر واشاعت کے ناظم ہیں- اس کے علاوہ کئی دینی، علمی، اشاعتی اور اصلاحی تنظیموں، تحریکوں اور اداروں سے منسلک ہیں- ترجمے، ترتیب وتدوین اور تصنیف وتالیف کے حوالے سے آپ کے متعدد کام ہیں، جن میں موطا امام مالک کا اردو ترجمہ، میلاد النبی کا انقلاب آفریں پیغام، تذکرۃ الصدیق اور مطالب القرآن آپ کی اہم قلمی کاوشیں ہیں- دعوت وتبلیغ کے جدید تقاضوں کے حوالے سے مذکورہ دونوں علما سے مشترکہ انٹرویو لیا گیا ہے، جو اپنی حیثیت میں منفرد بھی ہے اور دلچسپ بھی-

سوال:-تصنیف وتالیف سے آپ کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے، آپ بتائیں کہ آج کے ماحول میں کس طرح کی کتابوں کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے؟

مفتی محمد خان قادری:-لٹریچر کی ضرورت تو ہر دور میں رہی ہے، آج بھی ہے، لیکن ہر دور کے جداگانہ تقاضے ہوتے ہیں، مختلف ضرورتیں ہوتی ہیں- آج ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کون سی زبانیں زیادہ رائج ہیں، کس کو لوگ زیادہ بولتے اور پڑھتے لکھتے ہیں- ہمارے یہاں جو زبانیں بولی جاتی ہیں مثلاً اردو، پشتو، ساحلی، ہندی ان میں زیادہ سے زیادہ صالح لٹریچر کی ضرورت ہے، پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اہم موضوعات اور ایشوز کیا ہیں، ہمیں اہم موضوعات ہی پر قلم اٹھانا چاہیے، صرف رسم نبھانے کے لیے نہیں لکھنا چاہیے، مثلاً آج ایک سلگتا موضوع جہاد اور دہشت گردی ہے، اس پہ لکھا جائے- اسی طرح امت کے مستقبل کے حوالے سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں؟ ہمارے اہل قلم کو ادھر بھی متوجہ ہونا چاہیے-

مولانا منشا تابش قصوری:- ماشاء اللہ! حضرت صاحب زادہ خوشتر نورانی صاحب! آپ نے جدید دور کے تقاضے کے مطابق تصنیف وتالیف سے متعلق سوال کیا- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ”تلک الایام نداولھا بین الناس“ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر دور میں انقلاب ہو، کتابوں کی تصنیف و تالیف اور اشاعت میں بھی انقلاب آنا چاہیے- آج ضرورت ہے کہ خاص طور سے جدید طبقے کو ایسا مواد دیں کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں اور انہیں اسلام سے رغبت ہو-

سوال:- میرا مطلب تھا کہ کس طرح کے موضوعات پر اس وقت ہمارے مصنفین کو کتاب لکھنے کی ضرورت ہے؟ ہمیں آج مسلم معاشرے کو کیا دینا چاہیے؟

مولانا منشا تابش قصوری:-ہمیں اس وقت اصلاح معاشرہ کی جانب زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، معاشرہ دن بدن بگڑتا جارہا ہے، الحاد و دہریت بڑھتی جارہی ہے، اسے روکنے کے لیے زبان وقلم کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونا چاہیے، معاشرے کی اصلاح میں علما کی بھی تربیت ہونی چاہیے، آج نئے علما جو فارغ ہوکر آرہے ہیں ان کی دعوتی تربیت نہیں

رہتی اور اصلاح و دعوت میں وہ ناکام نظر آتے ہیں- فراغت کے بعد نئے طلبہ جو تحریر، تدریس یا تقریر کے میدان میں آتے ہیں ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ جتنا انہیں پڑھایا گیا رہتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھتے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ الحاد و دہریت اور فحاشی کے موجودہ سیلاب کے خلاف کھل کر لکھ یا بول سکیں- آج ایسی فکر کو زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے جس میں اپنی اصلاح کے ساتھ قوم وملت کی خدمت کرنے اور اصلاح کرنے کے جذبے کو فروغ دیا جائے- ایسے ہی آج سیرت، اخلاقیات اور معیشت پر بھی کتابیں لکھنے کی بڑی سخت ضرورت ہے-

سوال:- آج دعوت واصلاح کے لیے کس قسم کے اسلوب کو آپ زیادہ مفید سمجھتے ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- دعوت واصلاح کا جو اسلوب قرآن وسنت نے متعین کیا ہے، اس سے بہتر کوئی اسلوب نہیں ہوسکتا- اس لیے ضرورت ہے کہ ہم پہلے دعوت کے قرآنی اسلوب کو سمجھیں، ہم میں جو لوگ مبلغ بنتے ہیں، بہت ایسا ہوتا ہے کہ خود انہیں معروف و منکر میں تمیز نہیں ہوتی- ارشاد باری ” ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر “ کے تحت امام رازی نے بڑی نفیس گفتگو کی ہے- مبلغین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہمارے درمیان جو واعظ کہلانے والے لوگ ہیں ان میں بیشتر مبلغ نہیں ہیں اور جو مبلغ ہیں ان میں صفات تبلیغ یا شرائط تبلیغ نہیں پائی جاتی-

سوال:- یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے پچاس سالوں میں برصغیر میں جو خاص طور پر اردو میں لکھا گیا ہے، اس میں بے پناہ شدت ہے، رد میں بھی اور دعوت میں بھی- آخر ہمارے یہاں حکمت کے تقاضوں سے اس قدر گریز کیوں ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- حدیث قدسی ہے ”سبقت رحمتی غضبی“ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے- اس طرح قرآن میں بھی جہاں عذاب اور قہر وغضب کا ذکر ہے وہاں خدا کی بے پناہ رحمتوں کا ذکر ہے- ” عذابی اصیب بمن اشاء و رحمتی وسعت کل شیء“ میرا عذاب اس کو پہنچتا ہے جس کو میں چاہوں اور میری رحمت ہر شئ

سے بڑھ کر ہے- سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بھی رحمت کا غلبہ ہے، اس لیے جو بھی اس راستے پر نہیں ہے اس کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے-

سوال:- یعنی آپ اس اسلوب کے قائل بالکل نہیں ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- یہ کوئی اسلوب ہی نہیں، میں اسے اسلوب کیوں کہوں؟

مولانا منشا تابش قصوری:- اس کے لیے سب سے پہلے اپنے ماحول کا جائزہ لینا چاہیے، اگر ماحول انتہائی درجہ بگڑ چکا ہے تو اس کے لیے انتہائی نرم لب ولہجہ اختیار کرنا چاہیے اور جہاں ملے جلے فرقے ہیں وہاں مخالف فرقوں کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ ہم انہیں تبدیل کیسے کر سکتے ہیں، اگر کوئی غیر مسلم یہودی یا عیسائی اپنے مذہب سے تائب ہوکر اسلام قبول کرتا ہے تو اس کا تو ہم استقبال کرتے ہیں، خوب خوب آؤ بھگت کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی بدعقیدہ اپنی بدعقیدگی سے تائب ہوتا ہے تو ہم صحیح طور سے اس کی عزت نہیں کرتے، اسے اپنے درمیان مناسب جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا ہمیں بھی وہی طریقہ اپنانا چاہیے-

سوال:- ہم دیکھتے ہیں کہ علماے اہل سنت کی تحریروں میں بے پناہ تشدد ہے، گزشتہ پچاس برسوں کا جائزہ لیجیے تو اردو کے اندر رد میں صرف زلزلہ ایسی کتاب نظر آئے گی جس میں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے سنجیدہ اور معقول اسلوب اختیار کیا، جس کی وجہ سے اسے عالمی سطح پر مقبولیت ملی، ورنہ ایسا لگتا ہے کہ تشدد ہماری شناخت ہی بن گئی ہے؟

مولانا منشا تابش قصوری:- واقعی علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے ایک منفرد اسلوب اختیار فرمایا اور تشدد سے مکمل گریز کیا، اس کا اتنا مثبت نتیجہ سامنے آیا کہ ''زلزلہ'' کے رد میں بیسیوں کتابیں سامنے آئیں مگر کسی سے اس کا صحیح جواب نہیں بن سکا اور یہ ایسی سچائی ہے جس کا اعتراف خود ہماری مخالف جماعت کو بھی ہے- یہاں علامہ نے ایک طرح سے ہمیں یہ سبق بھی دیا اور یہ فکر بھی دی ہے کہ آج ہمیں مثبت انداز میں اپنی فکر کو عام کرنا چاہیے، مگر افسوس کہ آج بھی جو پاکستان میں کتابیں آ رہی ہیں ان میں بالعموم روایتی تشدد ہے،

جو مسلکی حوالے سے مفید نہیں ہے-

سوال:- بعض حلقوں سے آج یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ اب تردید وتنقید کا دور نہیں رہا، صرف سادے انداز میں اپنے افکار ونظریات کی اشاعت ہونی چاہیے، رد کا کام بھی اسی سے ہو جائے گا- آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟

مفتی محمد خان قادری:- تنقید تو خود قرآن نے کی ہے، اس لیے تنقید کرنے میں آج بھی کوئی حرج نہیں، لیکن تنقید برائے تنقیص نہ ہو، اس لیے جو آدمی کسی چیز پر تنقید کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس کا متبادل دے، صرف تنقید سے تو کام نہیں چلنے کو ہے- معاشرے محاسبے سے بدلتے ہیں، تنقید سے نہیں، اس لیے آدمی کو دوسرے پر تنقید کرنے کے ساتھ خود اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیے، تنقید کا معنی اگر صرف یہ لیا جائے کہ آدمی دوسرے کو سخت وسست کہہ لے تو یہ کوئی بات نہیں ہوئی، اس میں علمی پہلو اس قدر ہونا چاہیے کہ مخالف اسے پڑھ کر محسوس کرے کہ مجھ سے واقعی علمی یا فکری طور پر غلطی ہوئی ہے، ایسی تنقید صرف تنقید نہیں ہوتی وہ ایک طرح کا مثبت عمل ہوتی ہے-

سوال:- تحریر میں ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کا رد کیا جاتا ہے اور دوسرا یہ ہوتا ہے کہ صرف اپنی بات پیش کر دی جاتی ہے، کسی کا رد نہیں کیا جاتا- آپ ان دونوں میں کس کو زیادہ مضبوط ومستحکم اور بہتر سمجھتے ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- اصل میں دیکھنا چاہیے کہ ضرورت کیا ہے، لیکن یہ تو اٹل بات ہے کہ آپ اگر کسی معاملے میں اختلاف بھی رکھتے ہیں تو پہلے مثبت انداز میں اس معاملے کو پیش کریں، اس کے لیے پہلے ضروری یہ ہوتا ہے کہ آپ خود سمجھیں کہ وہ معاملہ کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اختلافی گفتگو کرتے ہیں وہ خود یہ نہیں سمجھتے کہ آخر اختلاف ہے کیا؟

مولانا منشا تابش قصوری:- ہاں! یہ بالکل صحیح ہے، تشدد کو روکا ہی جانا چاہیے- اللہ رب العزت کا فرمان ہے '' **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ**'' یعنی دعوت کے لیے حکمت عملی کو اپناؤ، اس کی پہلے بھی ضرورت رہی اور آج بھی ہے- صلح حدیبیہ اور میثاق مدینہ سے ہمیں حکمت کو اپنانے کا سبق ملتا ہے، آدمی پر جب ابتلا

اور آزمائش کا دور آئے تو اسے اس رخ کو بھی اختیار کرنا چاہیے اور آج ہم پر یہ وقت آ چکا ہے کہ رد کے بجائے اپنی بات کو مثبت انداز میں پیش کیا جائے-

سوال :- ہندو پاک کی علمی، قلمی اور تصنیفی سرگرمیوں میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- اس حوالے سے میں نے زیادہ کبھی غور نہیں کیا، تاہم میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان میں زیادہ کتابیں لکھی اور شائع کی جاتی ہیں-

مولانا منشا تابش قصوری:- دیکھیے! ہندوستان میں بھی کام اچھا ہو رہا ہے، مگر وہاں انفرادی طور پر ہو رہا ہے، اجتماعی طور پر نہیں ہو رہا ہے- الجامعۃ الاشرفیہ کے فارغین نے اچھا کام کیا ہے اور کر رہے ہیں، ان کے قلم میں طاقت ہے، وہ مثبت انداز میں تحریری کام کرتے رہیں تو بہت اچھا کر سکتے ہیں- ہندوستان کے اندر موضوعاتی تنوع بھی نہیں ہے، بس وہی پرانے رسائل، بزرگوں کے عقیدے، گیارہویں اور بارہویں کے اثبات، یہ وہ موضوعات ہیں جن میں ہمارے مخالفین نے ہمیں الجھا دیا ہے اور ہم ان میں الجھ کر اپنے دیگر افکار کو مثبت انداز میں پیش نہیں کر پا رہے ہیں- پاکستان میں اختلاف پر بھی بہت سی کتابیں آئیں ہیں، لیکن دیگر نئے موضوعات کی طرف ہمارے پاکستانی اہل قلم تیزی سے رخ کر رہے ہیں- یہاں اجتماعی طور سے کام ہو رہا ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں جیسا ہونا چاہیے ویسا ابھی پاکستان میں بھی نہیں ہو رہا ہے-

سوال :- آپ ایک طویل تدریسی تجربہ رکھتے ہیں، اس کی روشنی میں بتائیں کہ آج طریقۂ تدریس اور نصاب تعلیم میں کس قسم کی تبدیلی ہونی چاہیے؟

مفتی محمد خان قادری:- ہاں! نصاب کے تعلق سے تو ذہن نہایت واضح ہونا چاہیے، اس کے کچھ اصول ہوتے ہیں، ہم نے غلطی سے کتابوں کے نام کو نصاب سمجھ رکھا ہے، حالانکہ جو کتابیں مثلاً ہندوستان میں لکھی گئیں وہ دوسرے ملکوں میں تو نہیں پڑھائی جاتیں، نصاب تو دراصل کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جاتا ہے، کتابیں اس کے لیے

معاون ہوتی ہیں- اب نصاب میں ایک بار جن کتابوں کو شامل کر لیا گیا انہی کے ساتھ چمٹے رہنا بالکل غلط ہے- طلبہ کو نحو وصرف آ جائے، عربی ادب آ جائے، فقہ، حدیث اور اصول سے آگاہ ہو جائیں، یہ مقصد ہے- یہ مقصد تو نہیں کہ ان کو عبارات میں الجھائے رکھیں، گزشتہ دنوں اصول حدیث پر ایک بڑی اچھی کتاب آئی ہے "**تیسیر مصطلح الحدیث**" یہ ڈاکٹر محمود الطحاوی کی ہے، جو غالباً دمشق کے ہیں- کوئی مدرسہ ایسا شاید اب ہمارے یہاں نہ ہو جس میں یہ کتاب شامل نہ ہو، حتیٰ کہ پچھلے دنوں تنظیم المدارس کے نصاب میں بھی میں نے اسے شامل کرایا- اس سے پہلے اصول حدیث میں "**شرح نخبة الفکر**" پڑھائی جاتی تھی، جو طلبہ کی سمجھ سے بالاتر ہے- اسی طرح اصول فقہ میں "اصول الشاشی" پڑھائی جاتی ہے، جو ایک مشکل ترین کتاب ہے، اس سے پہلے اردو میں کوئی نہ کوئی کتاب پڑھائی جانی چاہیے- اب میں درمیان میں عرض کروں کہ جو مشکل کتابیں ہمارے یہاں پڑھائی جاتی ہیں مثلاً اصول الشاشی، نور الانوار، حسامی، مسلم الثبوت، توضیح وتلویح، ان سب میں جو چار مباحث ہیں، کتاب اللہ، سنت، اجماع اور قیاس- ان میں جب کتاب اللہ تک پہنچتے ہیں تو سال ختم ہو جاتا ہے، حکم کس کو کہتے ہیں، حکم کے اقسام کیا ہیں، یہ بچے سمجھ نہیں پاتے ہیں، حتی کہ بچوں سے اگر پوچھ لیا جائے کہ حاکم کون ہے؟ تو ممکن ہے کہ وہ دو چار منٹ رک کر کہیں اللہ، حالانکہ یہ تو ابتدائی چیزیں ہیں- ایسی ہی "الفوز الکبیر" تفسیر کی ایک مشکل ترین کتاب ہے، حالانکہ اس کو پڑھنے کے بعد آدمی باقی دوسری کتابوں کو پڑھ لے تو اس کے بعد شاہ صاحب کی بات سمجھ میں آتی ہے، اس لیے اصول تفسیر میں بھی کوئی ابتدائی کتاب ہونی چاہیے-

سوال:- مطلب یہ کہ آپ جزوی تبدیلی کے قائل ہیں!

مفتی محمد خان قادری:- جزوی نہیں، میں تو کلی تبدیلی کا خواہاں ہوں، میں تو کہتا ہوں کہ دس دس بیس بیس پرانی کتابیں آپ کیوں پڑھاتے ہیں؟ ہر موضوع پر بہترین جدید کتابیں آ گئی ہیں- انہیں پڑھانے میں ہمارے لیے کون سی شرعی قباحت ہے؟ مولانا! نصاب کے حوالے سے ہمیں بڑے کھلے ذہن سے بیٹھنا چاہیے-

سوال:-تو آخر کیا بات ہے کہ فن کی جدید کتابوں کی طرف ہمارے ذمہ داروں کی نظر نہیں ہوتی ہے، آخراب تک درس نظامیہ میں تبدیلی کے لیے ہم کیوں نہیں تیار ہوئے؟ یہاں پر بھی اور ہندوستان میں بھی-

مفتی محمد خان قادری:- درس نظامیہ تو ایک نام پڑ گیا ہے، یہ تو ایک اصطلاح ہے، ہم چاہیں تو اس نام کو بھی بدل سکتے ہیں- اب ملا نظام الدین نے اپنے دور کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ایک نصاب مرتب کیا، ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے دور کی ضروریات کے پیش نظر بہتر سے بہتر نصاب مرتب کریں اور جہاں تک تبدیلی کی بات ہے تو یہ تو تھوڑی بہت ہو ہی چکی ہے، جو تبدیلی کے بالکل مخالف ہیں وہ بھی کر چکے ہیں، لیکن یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوا ہے، آج عقل وشعور کو کام میں لاتے ہوئے سنجیدہ طور سے نصاب پر غور کرنا چاہیے-

مولانا منشا تابش قصوری:-تبدیلی کی بہر حال ضرورت ہے، پاکستان میں اس سلسلے میں پیش رفت بھی ہوئی ہے، مگر ہندوستان میں اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی، میری معلومات کے مطابق وہاں حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ اور کچھ علما نے توجہ فرمائی تھی اور ابتدائی درجات کے لیے ''لسان الفردوس'' کی ترتیب دی تھی، مگر اس سیریز کو وہ آگے نہ بڑھا سکے، غالباً ارباب مدارس نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی ہوگی- آج اس بات کی سخت ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ مختلف فنون پر مشتمل نئی ترتیب کے ساتھ مدارس کا نصاب تیار کیا جائے، جو عصری تقاضوں کو پورا کر سکے-

سوال :- ہندو پاک کے علما کے مابین آج ایک وسیع خلیج پائی جاتی ہے- آپ کی نظر میں اس کو پاٹنے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

مفتی محمد خان قادری:- میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ اسلام کا جو روحانی تصور ہے وہ کسی حدود و قیود کا پابند نہیں ہے، مسلمان خواہ ہندوستان میں رہے یا پاکستان میں، لیکن ہمارے درمیان آپس میں ایک مضبوط روحانی رشتہ ہے، جو مذہب کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے، اس حیثیت سے ہم آپس میں جڑے ہوئے ہیں، ورنہ میں تو مخلوق خدا کا قائل ہوں کہ مخلوق کے اعتبار سے ہمارے رشتے اور وحدتیں بہت بلند ہیں- اصل میں مسئلہ کشمیر کی وجہ

سے جو دونوں ملکوں میں سیاسی اختلاف ہے اس کی وجہ سے بہت سی الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں، مذہبی لوگ بھی اس کی وجہ سے مل نہیں پا رہے ہیں، سیاسی حضرات مذاکرات کے ذریعے آپسی روابط کو بڑھا رہے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی قدم اٹھانا چاہیے اور خاص طور سے علما کو یہ کام زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے-

مولانا منشا تابش قصوری:-اس کے لیے اللہ کا فرمان'' **واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا**'' خدا کی رسی مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو، ہماری بہترین رہنمائی کرتا ہے، یہ اہل ایمان کے لیے حکم ہے، وہ جس ملک کے بھی رہنے والے ہوں انہیں اس پر عمل کرنا چاہیے- رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد'' **کل مومن کنفس واحدۃ**'' (ہر مسلمان ایک جان ہیں) بھی ہمارے پیش نظر ہونا چاہیے- مطلب یہ کہ مسلمان کہیں کا بھی ہو وہ مسلمان ہے، اسے دوسرے مسلمان کے دکھ درد کو یکساں محسوس کرنا چاہیے اور غم وخوشی میں شریک رہنا چاہیے، سرحد کی لکیریں ہمارے ملک کو بانٹتی ہیں لیکن وہ ہمارے روحانی رشتے کو ختم نہیں کر سکتیں-

سوال:-''سیاست میں علما کی شرکت'' موجودہ دور کا ایک اہم موضوع بحث ہے، اس بارے میں آپ کا اپنا نقطۂ نظر کیا ہے؟

مفتی محمد خان قادری:- جہاں تک میں سمجھتا ہوں سیاست بھی ایک خدمت ہے- قوم کی بھی اور دین کی بھی، لیکن یہ جو موجودہ سیاست ہے اس کے تقاضے بڑے عجیب سے ہیں، اس کے لیے بہت سی دولت چاہیے اور اچھے روابط بھی ہونے چاہیے، اس میں آج وہ کام کرنا پڑتا ہے جو غنڈے اور بدمعاش کیا کرتے ہیں، تاہم علما کو یہ بات ضرور سامنے رکھنی چاہیے کہ اقتدار پر ہمیں نیک لوگوں کو لانا ہے، لیکن اس کے جو تقاضے ہیں ان میں پہلا افراد کی تیاری کرنا ہے- ایسے افراد ہوں جو ملک کی باگ ڈور کو ہاتھ میں لے کر صحیح طور سے اسے چلا سکیں، ان کو تیار کرنے کے لیے آج تک کسی نے نہیں سوچا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ بہتر نظام قائم ہو تو اس کے لیے اچھے افراد تیار کرنے ہوں گے، اگر آپ کے پاس اچھے افراد ہوں تو آپ ضرور لائیں کیوں کہ پورے عالم اسلام پر آپ نظر ڈالیں تو اچھے لوگ حکمراں

نہیں ہیں، اس لیے یہ راستہ خالی چھوڑ دینا تو کوئی دانش مندی نہیں ہے، اگر اقتدار حاصل کرنا مشکل ہے تو کم از کم سیاست پر ہمارا اتنا اثر تو ضرور ہونا چاہیے کہ جو انسانی اصول اور اقدار ہیں ان کے خلاف کوئی قانون پاس نہ ہو سکے۔

مولانا منشا تابش قصوری:- سیاست میں علما کو شامل ہونا چاہیے، حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے ہمیں اس کا سبق دیا ہے کہ مذہب و شریعت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ مرکز اقتدار تک ہماری رسائی ہو۔ مثال کے طور پر ہندوستان کی پارلیمنٹ میں آپ کے نمائندے نہیں ہوں گے تو آپ کی بات وہاں تک کیسے پہنچے گی، آپ باہر رہ کر تو وہ کام کر نہیں سکتے، اس لیے علما اگر مذہب کے لیے سیاست کریں، ذاتی مفادات کے لیے سیاست نہ کریں تو اس کا بڑا فائدہ ہوگا، ورنہ بقول اقبال......ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سوال:- پاکستان ایک اکثریتی سنی ملک ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی طرح یہاں کے سنی حضرات بھی ملی اور سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کے بالمقابل بہت پیچھے نظر آتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

مفتی محمد خان قادری:- نہیں میں یہ نہیں مانتا، جماعت اسلامی کے افراد ہی دو چار سو ہیں تو وہ منظّم رہیں گے ہی اور سنی جو لاکھوں کروڑوں ہیں تو اب آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سب ایک ہی پلیٹ فارم پر نظر آئیں۔ پیپلز پارٹی میں بھی وہ نظر آئیں گے، وہ مسلم لیگ میں بھی نظر آئیں گے اور دیگر تنظیموں اور تحریکوں میں بھی ان کی شمولیت ہوگی، لیکن اگر کسی فرقے کے افراد تعداد میں کم ہیں تو ان کا متحد رہنا آسان ہوتا ہے، یہی حال جماعت اسلامی کے ساتھ بھی ہے۔

سوال:- لٹریچر کے حوالے سے کافی انہوں نے کام کیا ہے اور اس کی وجہ سے پڑھے لکھے طبقے میں ان کے اثرات کافی دکھائی دیتے ہیں؟

مفتی محمد خان قادری:- انہوں نے دراصل اردو اور انگریزی زبانوں میں کافی کام کیا ہے، جو زبانیں برصغیر میں بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہیں اس لیے میں یہ بات پہلے

بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہل سنت کو بھی مختلف عصری موضوعات پر ان میں اپنا لٹریچر قوم کو مہیا کرنا چاہیے، کیوں کہ ہمارے یہاں جسے تعلیم یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے وہ ظاہر ہے عربی تو پڑھ نہیں سکتا، اس لیے جماعت اسلامی نے ان دونوں میں خوب کام کیا جس کا اسے بھرپور فائدہ ملا۔ ہمیں بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے فکر و مزاج کو سامنے رکھ کر تحریری میدان میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی طرف اپنے لوگ کافی متوجہ بھی ہیں اور اپنے طور پر کچھ کر بھی رہے ہیں۔ پہلے کے بہ نسبت ماشاء اللہ بہتر کام ہو رہا ہے۔

مولانا منشا تابش قصوری:- بات دراصل یہ ہے کہ یوں تو پوری دنیا میں سنی اکثریت میں ہیں، لیکن ہمارے آپسی انتشار نے ہمیں اور ہماری صلاحیتوں کو منقسم کر دیا ہے، پھر ایک چیز یہ بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ہمارے لوگوں کو کہیں بلایا جاتا ہے تو وہ ایسی جگہوں پر نہیں جاتے ہیں، جہاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ عصری تقاضوں کے مطابق ویسے ہی ہمارے یہاں صلاحیتوں کی کمی ہے لیکن ہم میں جو صلاحیت کے مالک ہوئے، ماشاء اللہ انہوں نے بڑے بڑے تاریخی کام انجام دیے، پاکستان میں مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا عبدالستار خان نیازی دور حاضر میں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس طرح کی شخصیتیں تھیں اور آج بھی ہیں، انہیں کھل کر آگے بڑھنا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرنا چاہیے۔

سوال:- ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

مفتی محمد خان قادری:- جام نور کے کچھ شمارے میں نے پڑھے ہیں۔ خاص طور پر آپ کا ''جہاد نمبر'' مجھے کافی پسند آیا۔ جام نور کی کارکردگی بہتر ہی نہیں بلکہ نہایت معیاری ہے۔ قارئین سے میری گزارش صرف یہی ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ علمی راہوں پر چلیں اور علمی رائے ہی اختیار کریں۔ یہی اسلام کا صحیح راستہ ہے، تاکہ ہم انسانیت کے کام آئیں، ملت کے کام آئیں اور ہمارا وجود نافع بنے، کیوں کہ اسلام کا قانون ہے کہ '' **فاما من ینفع الناس فیمکث فی الارض**'' جو انسانیت کے لیے نافع ہوتا ہے اسے ہی زمین پر تمکن ملتا ہے۔ اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اپنی زندگی بسر کرنی

چاہیے تاکہ ہمارے لیے بھی بہتر رزلٹ آئے اور امت کے لیے بھی اور دیگر مخلوق خدا کے لیے بھی۔

مولانا منشا تابش قصوری:۔''جام نور'' کے لیے آپ کی مساعی جمیلہ کو میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور قارئین سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے طور پر اس تحریک کو مضبوط بنائیں، تاکہ ہمارے ہندو پاک میں تیزی سے ابھرنے والے اس جماعتی آرگن کو مزید پائداری ملے۔ ہمارے بیشتر رسائل مالی کمزوریوں کی وجہ سے بند ہوگئے، اگر اس طرح کے زندہ رسائل بھی مالی کمزوریوں کی وجہ سے دم توڑتے ہیں تو یہ جماعت کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔□□□

(شمارہ جولائی ۲۰۰۵ء)

مفتی محمد مکرم احمد نقشبندی

شاہی امام: شاہی مسجد فتح پوری، دہلی

نبیرۂ مفتی محمد مظہر اللہ مجددی، مفتی محمد مکرم احمد نقش بندی کی متنوع شخصیت ارباب علم کے درمیان ہمیشہ نمایاں رہی ہے، کیونکہ موصوف بیک وقت دینی وعصری علوم کے فیض یافتہ ہیں۔ آپ کو اپنے وقت کے اکابر علما و مشائخ مثلاً مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں، محدث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی اور صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی علیہم الرحمہ کی صحبت حاصل رہی ہے۔ مذکورہ بزرگوں کی صحبتوں اور دعاؤں کے اثر سے آپ نے قرآن کریم حفظ کیا، درس نظامیہ کی تکمیل کی، فقہ وافتا میں درک حاصل کیا اور شاہی مسجد میں خطابت وامامت کے مستحق قرار پائے۔ آپ عصری درسگاہوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ آپ نے دہلی یونیورسٹی سے عربی وزبان وادب میں B.A. اور M.A کیا اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پی. ایچ. ڈی کے لیے ''المسرحية الشعرية لعزيز عباده'' پر ایک ضخیم مقالہ لکھا جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ بعد ازاں مذکورہ یونیورسٹی میں بحیثیت استاذ مقرر ہوگئے۔ آپ نے مذہبی اور ملی مسائل پر بہت سی کتابیں اور مقالات بھی تحریر کیے ہیں جن میں ''فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ رضویہ کا تقابلی مطالعہ'' کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کے خانوادے کو علمی وروحانی امتیاز حاصل ہونے کی وجہ سے مغلیہ حکومت نے شاہی مسجد فتح پوری دہلی کی امامت سونپی جس کے موجودہ شاہی امام آپ ہیں، جہاں سے پچھلی کئی دہائیوں سے آپ قوم وملت کی رہنمائی کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ قومی سطح کی کئی بڑی تنظیموں اور تحریکوں سے بھی وابستہ ہیں۔

سوال :-آپ ایک عرصے سے شاہی جامع مسجد فتح پوری سے لوگوں کی رہنمائی اور ان کی اصلاح وفلاح کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں-آپ مسلم معاشرے کی ترقی اور فلاح وبہبود میں کس چیز کو سب سے زیادہ مؤثر مانتے ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:-تقریباً ۳۱،۳۲ سال سے میں اس مسجد کی امامت،خطابت اور دیگر ذمہ داریوں کو اللہ کے فضل وکرم سے انجام دے رہا ہوں،میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ روز بہ روز اسلامی معاشرے میں تنزلی آرہی ہے اور مسلمانوں کا جو معیار زندگی ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سماجی برابر گرتا جارہا ہے-مجھے اس موقع پر آقائے دوجہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خطبہ یاد آرہا ہے جس میں آپ نے مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''دیکھو! مجھے تم سے یہ ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد کافر ومشرک بن جاؤ گے بلکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ بیماریاں تمہارے اندر نہ آجائیں جن کی وجہ سے کتنی قومیں ہلاک ہوگئیں''-آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''ایک ہے گھمنڈ اور ایک ہے پیسے کی محبت یا دنیا کی محبت'' آج جو چیز ہمارے معاشرے کے اندر بہت زیادہ آگئی ہے،وہ یہ کہ نماز کی طرف،اپنی باتوں کی طرف اور تعلیم واخلاق کی طرف دھیان بہت کم رہ گیا ہے اور ہر ایک انسان دنیا داری یا پیسے کی طرف دوڑ رہا ہے اور اس کے اندر ایک عجیب سا غرور اور گھمنڈ آگیا ہے،جس کی وجہ سے وہ معاشرہ میں بالکل ایک بیکار سا ممبر بن کر رہ گیا ہے،نہ تو وہ دوسروں کے کام آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے کام کوئی آسکتا ہے-لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ معاشرے کی ترقی اور فلاح وبہبود کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلیں اور کتاب وسنت کے مطابق اپنی زندگی ڈھالیں تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں-

سوال:-تاریخ ہند میں جنگ آزادی کی تحریک میں بے شمار علما ومشائخ کے بے بہا کارنامے ملتے ہیں اس کے باوجود ان کے اسمائے گرامی کو موجودہ سیاست میں عمداً نظر انداز کیا جارہا ہے-اس کے اسباب کیا ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:-اس کے اسباب تو بہت سے ہیں،کچھ اسباب تو یہ ہیں کہ جن

اسمائے گرامی کو سیاست میں نظر انداز کیا جارہا ہے ان کے عقیدت مندوں اور ان کے ماننے والوں نے بھی اس طرف دھیان نہیں دیا،انہوں نے خود بھی ان کو بھلا دیا-نہ تقریروں میں نہ تحریروں میں اور نہ ہی کتابوں میں کسی کو بتایا کہ تحریک آزادی میں ان کا کیا رول رہا ہے-دوسری بات یہ کہ جن علمائے کرام کو نظر انداز کیا گیا ہے وہ زیادہ تر علمائے اہل سنت ہیں-ایک طبقہ تو ایسا ہے جو علمائے اہل سنت کو مشہور نہیں ہونے دینا چاہتا اور سب سے زیادہ یہ کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کو ہی وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کا نام لے یا ان کی شہرت ہو-اس میں کچھ کمی تو ہماری خود کی ہے اور کچھ کمی ان لوگوں کی ہے جو حقائق کو نظر انداز کر کے یہ چاہتے ہیں کہ سارا کریڈٹ (Credit) ہم لے لیں اور ایسا لگے کہ ہندوستان کو آزاد کرانے میں ہمارا ہی کردار ہے اور دوسرے لوگ یا تو بالکل بیکار ہیں یا وہ آزادی نہیں چاہتے یا وہ پاکستان نواز ہیں-اس طرح کے مختلف الزامات لگا کر انہوں نے علمائے اہل سنت کو قعر گمنامی میں ڈالنے کی کوشش کی ہے،لیکن بہر حال سچائی تو بہت دنوں تک چھپی نہیں رہ سکتی-مجھے امید ہے کہ اگر ہمارے قلم کار علما اور اہل سنت کے اداروں نے اس طرف توجہ کی تو یہ کمی پوری ہوجائے گی-ہونا یہی چاہیے کہ بغیر کسی کو الزام دیے ہم ایک اچھی شروعات کریں جس کی وجہ سے آزادی ہند میں علمائے اہل سنت کا رول واضح ہوکر سامنے آئے اور وہ لوگ جو مذہبی صحافت سے وابستہ ہیں اور رسائل وجرائد نکال رہے ہیں یا جو اسٹیج پر تقریریں کر رہے ہیں دوسروں کو الزام نہ دے کر اس طرف مثبت توجہ دیں-

سوال :-کیا واقعی آج کے اس ہندوتو دور میں اپنے مذہب وملت کی بقا وتحفظ کے لیے علما کو میدان سیاست میں آنے کی ضرورت ہے؟

مفتی محمد مکرم احمد:-ہاں بالکل ضرورت ہے،علمائے کرام کو میدان سیاست میں بھی آنے کی ضرورت ہے،مگر جھوٹ اور مکر وفریب والی سیاست نہیں بلکہ سیاست کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی شعور پیدا ہو،اب خواہ وہ ائمہ کرام ہوں،علمائے عظام،مذہبی وتعلیمی ادارے یا مدارس اسلامیہ ہر ایک کو اس طرف توجہ دینی چاہیے-میدان سیاست سے ہماری لاتعلقی کی وجہ سے دوسرے لوگ بہت آگے بڑھتے جارہے ہیں-بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ

مسلمان ہمیشہ سوسال پیچھے کی سوچتا ہے- جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آرہا تھا اور سرسید احمد خاں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ شروع کیا تو مسلمانوں نے انگریزی کی بہت زبردست مخالفت کی، اب سو برس کے بعد وہی مسلمان انگریزی کی طرف زیادہ توجہ دے رہا ہے- آج کمپیوٹر اور سائنس کا دور ہے جب دوسرے لوگ اس میدان میں آگے بڑھ چکے ہوں گے تب سو برس کے بعد ہم کمپیوٹر اور سائنس کی طرف توجہ دیں گے- آج ہمارے مقابلے کے جو افراد اور تنظیمیں ہیں وہ بہت آگے ہیں، مگر ہماری بے حسی ہمیں خواب غفلت سے بیدار ہونے کا موقع نہیں دے رہی ہے نتیجتاً مسلمان ہر چیز میں پیچھے رہ گئے ہیں- میرا ماننا یہ ہے کہ علمائے کرام کو سیاست سے دور نہیں رہنا چاہیے بلکہ وہ مسلمان جو سیاسی میدان میں تجربہ رکھتے ہیں، جن کے دل میں ملت کا درد ہے، ان کے ساتھ مل کر ایک شوریٰ بنانا چاہیے، یہ ضروری نہیں کہ شوریٰ ہی ہو بلکہ شوریٰ کی طرح مل بیٹھ کر سب لوگ سوچیں کہ اس نیا کو کیسے پار لگایا جائے-

سوال :- ہمارے مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے آپ کسی مسلم سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:- اگر مسلم سیاسی جماعت ہوتی تو بہت اچھا ہوتا اور ہندوستان میں مسلم سیاسی جماعت کی ضرورت بھی ہے، مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ناممکن سی بات ہے، جب سے خلافت کا زوال ہوا ہے اس وقت سے لے کر اب تک مسلم سیاسی جماعت کا وجود تو اب بہت مشکل لگتا ہے، کیونکہ جب تک علما اور اکابرین مل کر نہیں بیٹھیں گے اور ان میں اتحاد قائم نہیں ہوگا ایسا ہونا ناممکن ہے، اگر ان میں اتحاد و اتفاق ہو جائے اور آپسی انتشار، خود غرضی اور مفاد پرستی سے بالاتر ہو کر ہر چیز میں متفقہ فیصلہ لینے لگیں تو یہی بہت بڑی خدمت ہوگی- فی الحال مسلم سیاسی جماعت سے زیادہ اخلاق، ایثار اور اتحاد کی ضرورت ہے-

سوال:- آج جب کہ موجودہ عصری نصاب تعلیم وغیرہ میں خود ساختہ تاریخیں شامل کی جارہی ہیں اور کسی حد تک اس میں ترمیم و تبدیلی بھی کی جارہی ہے جس میں اسلام کی شبیہ کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے- ایسے میں علما کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

مفتی محمد مکرم احمد:- اس میں علما اور دانشوران ملت دونوں کو زبردست سوجھ بوجھ رکھنے کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ ابھی تک ہمارے یہاں مسلمانوں میں ایسی کوئی جماعت یا کمیٹی نہیں ہے جو نصاب کو پڑھ سکے، حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ مسلمانوں سے متعلق جو نصاب آرہا ہے اس کو متعلقہ کوئی جماعت یا کمیٹی پڑھ لے اور اگر اس میں کوئی خامی ہو تو اس کی طرف بھر پور توجہ دلائے- آپ کو تعجب ہوگا کہ آگرہ یونیورسٹی کے اندر B.A,II year میں اسلامک اسٹڈیز Islamic Studies کا ایک سوال تھا مجھے بر وقت حوالہ تو یاد نہیں ہے کہ وہ کس کتاب میں تھا، مگر اس پر تحریک اسلام کی طرف سے وزیر اعظم کو میمورنڈم وغیرہ دیا گیا تھا اور اس پر زبردست احتجاج بھی ہوا تھا- سوال یہ تھا کہ اللہ کے مشہور پیغمبر کون کون ہیں؟ جواب تھا ''موسیٰ، عیسیٰ، چوسا، ابراہیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم''- جواب میں لفظ ''چوسا'' بڑھا دیا اور بڑھانے کے بعد اپنی تعلیمی گائیڈ میں اس کی تشریح یوں کی کہ چوسا چوسنا سے بنا ہے جیسے آم وغیرہ کو چوستے ہیں اور وہ نبی بہت خوبصورت گورا چٹا تھا اور بہت ہی عیاش تھا، نعوذ باللہ اور کیا کیا لکھا ہوا تھا- آگرہ بھی بہت دور نہیں ہے اور یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہو جانا بھی آسان بات نہیں ہے، مگر ابھی بھی وہ کمیاں پائی جارہی ہیں اگر کسی ایک بات کی طرف یا کسی خامی کی طرف توجہ دلا دو تو ہنگامہ کرتے ہیں، لیکن ہونا یہ چاہیے کہ اگر جیسے ہی کوئی نصاب سامنے آئے ہماری کوئی کمیٹی ہو جو اس کو پڑھے تاکہ ہمیں اندازہ ہو جائے کہ اس میں کیا ہے اور خامیوں پر بر وقت نوٹس لے سکے اور اس کی خبر گیری کر سکے اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم مسلمانوں کی رہنمائی بھی کر سکتے ہیں اور حکومت کو آگاہ بھی کر سکتے ہیں- اس طرح وہ افراد جو اسلامی نظریات کو نصاب کے ذریعے غلط رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ باز رہیں گے، بس ہمارے علمائے کرام اور مسلمانوں کو بہت زیادہ چوکنّا رہنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ لوگ مذہب اسلام کی ساخت کو مسخ نہ کر سکیں اور مسلمانوں کی کردار کشی بھی نہ ہو، مگر ایسا لگتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں ابھی ہم نے کوئی کام کرنے کی شروعات ہی نہیں کی-

سوال :- ہندوستان میں ۲۰ رکروڑ مسلمانوں کی آبادی ہے مگر نہ ہی ہماری کوئی سیاسی جماعت ہے اور باتفاق رائے نہ ہی ہم کسی کو اپنا قائد ماننے کو تیار ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

مفتی محمد مکرم احمد:- سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ کی تعلیم سے ہم اب تک نابلد ہیں اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس کی طرف ہمارا کوئی دھیان بھی نہیں ہے- جب تک یہ نہ ہو میں سمجھتا ہوں کہ انسانی کردار سنبھل نہیں سکتا- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **من اصبح ولم یھتمّہ بامور المسلمین فلیس منا** (جس کی صبح اس حال میں ہو کہ اسے مسلمانوں کے مسائل کی فکر نہ ہو تو وہ ہم میں سے نہیں ہے-) مگر آج کل انسانوں کو اپنی فکر رہتی ہے، روزی روٹی کی فکر رہتی ہے، جب کہ حضور فرما رہے ہیں کہ ہر ایک کو قوم کی، مسلمانوں کی اور امت کی فکر رکھنی چاہیے- جب تک اس طرح کا رجحان پیدا نہیں ہوگا، امت میں تنظیم، اتحاد اور قیادت کا فقدان رہے گا- اور یہ جبھی ہوگا جب آپس میں اتفاق اور محبت **أشداء علی الکفار رحماء بینھم** کے قرآنی جذبہ سے ہو- آج کل جگہ جگہ دشمنی ہے، منافقت ہے، پڑوسی پڑوسی کو نہیں دیکھ سکتا، جس کی وجہ سے لوگ نہ خود ہی کامیاب ہیں اور نہ دوسروں کو کامیاب ہونے دیتے ہیں، کسی کو اپنا قائد ماننا تو بہت مشکل ہے- اگر آپ شمالی ہند میں بنالیں گے تو لوگ اسے جنوبی ہند میں نہیں مانیں گے، جنوبی ہند میں بنالیں گے تو کہیں اور اسے نہیں مانیں گے، قائد تسلیم کرنا تو بہت مشکل ہے، لیکن ہم یہ مانتے ہیں کہ آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی قائد مانا جائے اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اخلاص اور باہمی محبت و یگانگت کے ساتھ اگر ہم کوئی کام کریں گے تو مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کامیابی ضرور ملے گی-

سوال:- آپ نے جنگ آزادی کے بعد سے لے کر موجودہ مسلم معاشرہ کے نشیب وفراز کو ملاحظہ کیا ہے، جنگ آزادی سے اب تک ہمارا یہی گلہ رہا کہ ہمیں کما حقہ ہمارا حق نہیں ملا، کیا ہماری گلہ مندیاں جائز ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:- یہ گلہ بالکل بجا، درست اور جائز ہے، کیونکہ اگر آپ دستور ہند یا آئین (Constitution) پڑھیں گے تو اس میں اس طرح کی بات ملتی ہے کہ ہم مساوات رکھیں گے، مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں رکھیں گے، سروسیز وغیرہ میں برابر کا حق دیں گے، مذہبی آزادی دیں گے، لیکن اس قانون میں ایک دفعہ یہ بھی لگائی ہوئی ہے کہ

اگر کوئی SC,ST (شیڈول کاسٹ یا شیڈول ٹرائب) کا آدمی اپنا مذہب چھوڑ کر بدھ مذہب میں چلا جاتا ہے تو اس کو تمام مراعات (Facilities) ملتی رہیں گی پھر بعد میں ان لوگوں نے (Amendment) کر کے یہ بڑھا دیا کہ اگر کوئی اپنا مذہب چھوڑ کر سکھ مذہب میں بھی چلا جائے گا تو اس کو بھی تمام مراعات ملتی رہیں گی، لیکن وہیں پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی اپنا مذہب چھوڑ کر مذہب اسلام یا عیسائیت کو اپنا لے گا تو اس کو تمام سہولتیں ملنا بند ہو جائیں گی- ایک طرف تو آپ مساوات اور مذہبی آزادی کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف اس طرح کا تعصب بھی رکھتے ہیں- اب اگر کوئی نچلی ذات کا آدمی مسلمان بننا بھی چاہے تو نہیں بن سکتا، کیونکہ وہاں پر حکومت کی طرف سے ایک بندش ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ایسا امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے کہ کہیں مسلمان آگے نہ بڑھ جائیں- ہم الیکشن میں بھی دیکھتے ہیں کہ جہاں مسلم اکثریت ہے، جہاں مسلمانوں کے ووٹ زیادہ ہیں، صرف ان ہی جگہوں پر مسلمانوں کو ٹکٹ دیے جاتے ہیں، یہ کیا بات ہوئی؟ اگر دینا ہی ہے تو 100 میں سے 25% فیصد ٹکٹ مسلمانوں کو آبادی کے حساب سے دیجیے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں مسلم اکثریت ہے وہاں پر صرف آپ مسلمانوں کو ہی ٹکٹ دیں اور ہندؤں کو نہ دیں- اس طرح کہیں ٹکٹ دینے میں، ووٹنگ کے اندر، کہیں دوسرے معاملوں میں، یعنی زندگی کے تمام شعبوں میں حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے- اگر بر وقت ہم ان کی نشاندہی کر دیں، ان کمیوں کی طرف توجہ دلائیں، اس پر احتجاج کریں تو مجھے امید ہے کہ ان کو غیرت ضرور آئے گی اور جو ناانصافی 50% فیصد ہو رہی ہے اس میں کمی آئے گی-

سوال:- مذہب اور سیاست بظاہر دونوں الگ الگ معلوم ہوتے ہیں، مگر جب ہم عہد رسالت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید آج انہیں جدا جدا نام دے دیا گیا ہے، آپ کس حد تک اس فکر سے اتفاق رکھتے ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:- مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں ہے، مذہب کے اندر مجموعی طور پر تمام چیزیں آجاتی ہیں، مذہب میں معاشیات، معاشرت، سماجیات اور مذہبیات سب کچھ

موجود ہے، ہاں مکروفریب والی سیاست سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ سیاست پر مذہب کی بندش ضرور ہونی چاہیے تاکہ انسان دوسروں کو دھوکہ نہ دے سکے اور اللہ سے ڈرتا بھی رہے-یہ بہت ضروری ہے اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ مذہب اور سیاست الگ الگ دو چیزیں ہیں-

سوال:-آج کے اس مادی دور میں مسلم طبقہ کا رجحان مذہبی تعلیم سے ہٹتا جارہا ہے اور وہ عصری تعلیم کو ہی اپنی کامیابی وکامرانی کا محور تصور کرتے ہیں، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:-اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مدارس کی تعلیم سے روزی روٹی نہیں مل رہی ہے اور نہ ہی عزت مل رہی ہے، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ناکامی ہو رہی ہے-عام لوگوں میں یہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ ایک بچہ مدرسہ میں جتنا وقت گزارتا ہے اتنے میں دوسرا بچہ B.A یا M.A کر لیتا ہے، اس لیے مدرسے میں تعلیم کا حصول سراسر عمر کا ضیاع ہے-ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگوں میں یہ رجحان پیدا کریں کہ مذہبی تعلیم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم بھی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ مدارس کے نصاب میں تبدیلی ہو، گوکہ اس کا بنیادی ڈھانچہ وہی رہے، لیکن جدید علوم جیسے سائنس، حساب، ہندی، اور انگلش وغیرہ کو شامل کیا جائے تاکہ مدارس کے طلبہ کو عصری علوم کی شدبد ہو جائے، اسی طرح زبان دانی کی طرف بھی توجہ دی جائے تاکہ ہمارے طلبہ میں عربی، فارسی اور انگریزی میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے-اگر ایسا ہو جائے تو ان کے لیے معیشت کی راہیں اور بھی آسان ہو جائیں گی-ہمارے مدارس میں ایسا نہیں ہو رہا ہے اس لیے لوگوں میں مدارس کے لیے ایک اکتاہٹ سی پیدا ہو رہی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مدارس میں ہمارے بچوں کی عمریں ضائع ہو رہی ہیں، اس لیے مدارس کے نصاب میں جدید علوم کی شمولیت کے ساتھ زبان دانی اور (Direct Method) کی طرف توجہ ضروری ہے تاکہ عام لوگوں میں مدارس کے تئیں یہ رجحان ختم ہو سکے-جنوبی ہند کی درس گاہوں میں میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہاں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم پر بھی توجہ ہے اس لیے لوگ وہاں مدارس کے اندر اپنے بچوں کو داخل کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس

کرتے، ہمیں بھی ایسا ہی کرنے کی ضرورت ہے-

سوال:-موجودہ دور میں مذہب اسلام اور اللہ کے مقدس کلام کے تئیں غیروں کے تیور نہایت جارحانہ ہوتے جارہے ہیں-ان حالات میں ہمیں مذہب اسلام اور قرآن مقدس کی تعلیمات کے صحیح خدوخال کو کس طرح سے عام کرنا چاہیے؟

مفتی محمد مکرم احمد:-سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مقدس کی تعلیمات اور اس کے صحیح خدوخال سے پہلے ہم خود واقف ہو جائیں اور جب تک کوئی شخص خود واقف نہیں ہوگا وہ دوسروں کو اس سے کس طرح واقف کرائے گا اور اس کا دفاع کرے گا-یہ تو ایک طرح کا ٹیم ورک ہے، کچھ لوگ بہت چھوٹے پیمانے پر اس کو کہیں کہیں انجام دے رہے ہیں، مگر جہاں ہم ۲۰ رکروڑ مسلمانوں کی بات کرتے ہیں تو کم سے کم دس یا بیس لاکھ ایسے افراد ہونے چاہیے جو تن من دھن سے قرآن کے دفاع اور اس کے صحیح خدوخال سے منکرین ومتعصبین کو آشنا کرانے میں لگے رہیں-مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے تیور مسلمانوں کے تئیں جارحانہ ہو رہے ہیں، وہ اسی وجہ سے ہو رہے ہیں کہ ان کو صحیح جواب نہیں مل رہا ہے اور نہ ہی صحیح رہنمائی مل رہی ہے-آج اگر کوئی شخص قرآنی آیات کو غلط ڈھنگ سے پیش کر رہا ہے تو اس کو بٹھا کر یا کسی چینل یا اخبار کے ذریعے یا خطوط کے ذریعے ہمیں آگاہ کرنا چاہیے-اگر ہم سلیقے سے کام کریں تو مجھے لگتا ہے اس میں ہمیں کامیابی ملے گی اور دوسری سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر آج ہم اپنے مذہب پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے تو یہ نوبت آتی ہی نہیں-آج ہماری مسجدیں خالی ہیں، رمضان شریف میں لوگ مسجدوں میں آتے ہیں اور عید کے بعد پھر یہی مسجدیں ویران ہو جاتی ہیں، آج مسلمانوں میں مذہبی رجحان کم ہو گیا ہے-دوسرے مذاہب کے لوگوں میں بھی یہی بات تھی مگر ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ مذہب سے وابستگی میں ہماری کامیابی ہے، اس لیے ان لوگوں نے اپنے اندر بیداری لائی اور اس کمی کو پورا کرلیا-ہمیں بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنے اندر بیداری لائیں اور مذہب اسلام کے دامن سے پوری طرح وابستہ ہو جائیں اور جن لوگوں کے تیور جارحانہ ہوتے جارہے ہیں ہم ان کا بھی حکمت عملی سے جواب دیں-

سوال:- موجودہ دور میں علمائے کرام کا میدان دعوت وتبلیغ میں اثر ورسوخ کے گرتے ہوئے فیگر کے کیا اسباب ہیں؟

مفتی محمد مکرم احمد:- سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ آج ہمارے علما تعلیم کچھ اور دے رہے ہیں یا تقریریں کچھ اور کر رہے ہیں اور ان کا اپنا عمل کچھ اور ہے جس کی وجہ سے عوام میں ان کا اثر نہیں پیدا ہو رہا ہے-عملاً ہمارے علما اس قدر پیچھے ہیں کہ لوگوں میں ان کے لیے جو عقیدت ہونی چاہیے وہ نہیں ہے- اگر علم وعمل میں یکسانیت ہو، قول وفعل میں تضاد نہ ہو اور دین کے لیے اخلاص وایثار کا جذبہ ہو تو ہم دعوت وتبلیغ کے میدان میں ضرور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں-ہمیں کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ہم نہایت حکمت اور تدبر کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے مزاج کے مطابق سمجھائیں- اگر کسی صاحب کی داڑھی نہ ہو اور آپ اسے دیکھتے ہی ڈانٹنے لگیں تو اس کے اندر نفرت سی پیدا ہو جائے گی- پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ایک کتاب تحریر فرمائی ہے ''محبت کی نشانی'' جو داڑھی کی فضیلت پر مشتمل ہے، انہوں نے اس کتاب کو نہایت خوبصورت پیرائے میں ترتیب دیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ (داڑھی) حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامت ہے اور جن کو حضور سے محبت ہے وہ ضرور سنت رسول کو اپنائیں گے اور داڑھی بھی رکھیں گے- اس طرح کی دعوت سے لوگوں کے دل پر ایک اچھا اثر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ مثبت ہوتا ہے- آج ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے علما میں بے جا تشدد اور انتہا پسندی بھی آ گئی ہے جو نہایت نقصان دہ ہے، ہمیں ان چیزوں سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے اور نہایت حکمت ودانائی سے دین کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ اچھی تاثیر پیدا ہو سکے-

سوال :-مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات اور اس کی اصل روح کی تازگی برقرار رکھنے کے لیے ہمیں کن اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے؟

مفتی محمد مکرم احمد:- لوگوں میں اسلامی روح پھونکنے کے لیے ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں بیداری لانے کی ضرورت ہے اور استقلال وثابت قدمی سے کام کرنے کی بھی ضرورت ہے- آج کل جو ہمیں فرقہ پرست طاقتیں کامیاب نظر آ رہی ہیں وہ ان کا آج کا مشن نہیں

ہے، بلکہ پچاس سال قبل جو انہوں نے بنیاد ڈالی تھی آج وہ اس میں کامیاب ہیں- ہمیں بھی اسی طرح کام کرنا چاہیے، ہمارے لیے بہترین مثال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے- آج اس نے تمام مسلمانوں کا نام اونچا کیا ہوا ہے، کیونکہ سو سال قبل جس ننھے پودے کو لگایا گیا تھا آج وہ ایک تناور درخت بن گیا ہے- آج بھی اگر ہم حوصلے اور ثابت قدمی سے کام کریں تو ہمیں کامیابی ضرور نصیب ہوگی- اگر ہم ۲۴؍گھنٹوں میں سے ۱۲؍گھنٹے اپنے نجی کاموں میں لگاتے ہیں تو ملت اور مسلک کے کاموں میں ہمیں بلا شبہ تین یا چار گھنٹے ضرور صرف کرنا چاہیے- ہندی، انگریزی، عربی اور دیگر مشہور زبانوں میں تحریروں، تقریروں، جرائد اور مجلّات کے ذریعے ہمیں اپنے مشن کو آگے بڑھانا چاہیے- اسلامی لٹریچرز کو مفت تقسیم کرنا چاہیے اور انھیں گھر گھر پہنچانے کا اہتمام کرنا چاہیے- اگر ہم خلوص کے ساتھ ان تمام اقدامات کو عملی جامہ پہنا لیں گے تو مجھے امید ہے کہ ہمیں کامیابی ضرور ملے گی-

سوال:- اخیر میں قوم کے نام آپ کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟

مفتی محمد مکرم احمد:- آخر میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ آج کل کے حالات سے ہمیں ناامیدی کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی اشتعال میں آنے کی ضرورت ہے- ہندوستان میں جس طرح کے حالات پیدا ہو رہے ہیں اس سے ہمارے کچھ لوگ ناامید ہو رہے ہیں اور کچھ افراد نہایت مشتعل ہو رہے ہیں، ہمیں قرآن مقدس، احادیث کریمہ، اولیائے کرام کے ملفوظات اور ان کی کتابوں میں سب کچھ ملتا ہے- اسلام ایک عالمگیر اور فطری مذہب ہے، اس لیے ہمیں اپنی تہذیب، تعلیم، تاریخ اور ثقافت کو دھیان میں رکھ کر صبر واستقلال کے ساتھ کام کرنا چاہیے- ایک طرف اللہ کی رحمت سے امید رکھیں دوسری طرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کام کریں جس میں ذاتی نمود ونمائش نہ ہو اور ذاتی مفاد مدنظر نہ ہو- اس کے ساتھ میں چاہوں گا کہ مسلمان تعلیم کی طرف زیادہ دھیان دیں خواہ وہ مذہبی تعلیم ہو یا عصری دونوں ہی کی طرف توجہ ضروری ہے اور آپس میں اتحاد واتفاق کے ساتھ ملّت، مسلمانوں اور پریشان حالوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں- □□□

(شمارہ نومبر/دسمبر ۲۰۰۲ء)

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی

سجادہ نشین: خانقاہِ مسعودیہ مظہریہ، شاہی مسجد فتح پوری، دہلی

سرزمین دہلی ہمیشہ سے تاریخ ہند کا ایک اہم حصہ رہی ہے کیونکہ یہی وہ سرزمین ہے جسے علما ومشائخ نے ملکی سطح پر اپنے افکار وعقائد کی تبلیغ کے لیے منتخب کیا تو دوسری طرف اہل سیاست نے حکومتوں کی تنظیم وتنسیق کے لیے اسے اپنی آماجگاہ بنایا- یہ ہندوستان کی سیاسی راجدھانی بھی ہے اور علمی، فکری، ملی اور مذہبی بھی، مگر حیرت کی بات ہے کہ بائیس خواجگان کی دہلیز اور لاتعداد مشاہیر علما ومشائخ کا مسکن ہونے کے باوجود یہاں عقائد اہل سنت کی جڑیں مضبوط اور راسخ نہ ہوسکیں- اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے قائدین علمائے اہل سنت تھے، اس کی ناکامی کے بعد علما نے شعوری یا غیر شعوری طور سے عالم میں انتخاب اس شہر سے منہ موڑ لیا، مگر ایسے ماحول میں جن افراد نے مسلک حق کی ترویج میں اپنا خون جگر صرف کیا ان میں دہلی کے خانوادۂ مسعودیہ مظہریہ کو امتیازی مقام حاصل ہے، جن کے اسلاف نے زندگی کے آخری لمحات تک تعلیمات محمدی کا چراغ گل نہیں ہونے دیا اور پورے طور پر عقائد ومعمولات اہل سنت پر قائم رہے- اسی چراغ سے چراغ جلانے والوں میں ایک نام مفتی اعظم دہلی مفتی مظہر اللہ نقش بندی کے پوتے مفتی محمد میاں ثمر دہلوی نقش بندی سجادہ نشین خانقاہِ مسعودیہ مظہریہ، دہلی کا ہے جن کا تصلب فی الدین، علمی فقاہت اور زہد وتقویٰ عوام اور علما میں یکساں معروف ہے، جو دہلی جیسے بدعقیدہ ماحول میں اہل سنت وجماعت کے عقائد ومعمولات پر سختی سے قائم اور مرجع مسائل شرعیہ ہیں- اس کے علاوہ مفتی صاحب ایک حکیم ومعالج بھی ہیں، پریشان حالوں کے صلاح کار اور مصلح بھی ہیں- اس حوالے سے ماہنامہ ''کنز الایمان'' دہلی میں آپ کا مستقل کالم ''حل المشکلات''، بہت مقبول ہے-

سوال:- سرزمین دہلی بائیس خواجگان نیز اہل سنت وجماعت کے لاتعداد مشاہیر علما، صلحاء، بزرگان دین اور اولیائے کرام کا مسکن رہی اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ اہل سنت وجماعت کی تعداد دہلی میں نہایت محدود ہے؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی:- میں اس کو بھی غلط فہمی ہی کہوں گا کہ دہلی میں اہل سنت کی تعداد بہت کم ہے- دہلی میں جو عوام ہیں ان میں اکثریت اب بھی اہل سنت ہی کی ہے- لیکن فرق اتنا ہے کہ ان کی رہنمائی مکمل طور پر نہیں ہوسکی اور وہ جاری نہ رہ پائی- اس لیے تبلیغی جماعت وغیرہ کے اور دوسرے فرقے کے لوگ ان سے وابستہ ہوگئے- اور اپنی معاشی کمزریوں کی وجہ سے ان لوگوں نے ایک ایک چیز کو نظر انداز کرکے ان سے خلط ملط رکھا اور اس خلط ملط نے سارا معاملہ خراب کیا- یہی وجہ ہے کہ حق وباطل کے درمیان بہت کم لوگ امتیاز کر پاتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی عقیدے کے لحاظ سے یہ بالکل ختم نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک طرح سے ان میں جمود سا آگیا ہے، بے حسی سی پیدا ہوگئی ہے جس سے یہ ان میں ملے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن ایسا ہے نہیں بلکہ آپ اگر غور کریں گے تو وہ لوگ اتنی انتھک کوششوں اور مسلسل محنتوں کے باوجود ابھی تک اپنے آپ کو کامیاب تصور نہیں کررہے ہیں بعض جگہ انہیں ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں مجبور ہونا پڑتا ہے مثال کے طور پر کسی کی وفات کے بعد جو تقریبات ہوتی ہیں ایصال ثواب کی ان میں ابھی تک اہل سنت کا سلسلہ جاری ہے، بلکہ ان لوگوں کو مجبور ہوکر اپنے عقائد کو نظر انداز کرکے یا چھپا کر جس طرح کی بھی ان کے ذہن میں مصلحت ہو اس میں شریک بھی ہونا پڑتا ہے- اور ابھی تک ان میں نہ تو جماعتی سطح پر اور نہ انفرادی طور پر کسی کی جرأت ہوئی ہے کہ وہ برملا اس چیز کو ختم کرنے کی کوشش کریں اور یہ کہیں کہ تم نے یہ کیا کر رکھا ہے بس کسی کا انتقال ہوگیا ٹھیک ہے اللہ سے لو لگاؤ اور دعا کرتے رہو اور جو خیرات کرنا ہو اسے کرتے رہو انفرادی طور پر یہ اجتماع ہی کیا؟ کیسا چہلم؟ کہاں کا سوئم؟ سب بدعت ہیں- یہ آپ خوب جانتے ہیں اور وہ بھی جانتے ہیں کہ مسلکی اعتبار سے یہ وہ چیزیں ہیں جن سے دونوں فرقوں کے درمیان فرق محسوس کیا جاتا

ہے اور یہ طے ہے کہ ان کے مسلک میں یہ سب چیزیں بدعت میں شامل ہیں اس سے کسی نے رجوع نہیں کیا ہے۔لیکن اب تک اس کے باوجود بھی ان کا شامل ہونا اور اس کے اوپر قابو نہ پاسکنا، عوام کو اسے باز نہ رکھ سکنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عمارت گر گئی ہے لیکن آثار پختہ اور باقی ہیں۔ اور معاف کیجئے گا! وہ چیز جس کو آپ پختہ عقیدہ کہتے ہیں آج کل کے فارغین مدارس اہل سنت کے اندر بھی موجود نہیں ہے، چھوڑیئے ہمارے ارد گرد کو آپ ہمارے خاص خاص آستانوں پر جایئے وہاں سروے کیجئے اور دیکھئے کون کون آیا؟ وہاں کی جو محفلیں ہیں ہفت روزہ ہیں، ماہانہ ہیں، سالانہ ہیں ان میں آپ غور سے دیکھئے دہلی کے اکثر لوگ وہاں آپ کو ملیں گے اور ایسے لوگ جن کو دیکھ کر آپ چونکیں گے ہم تو ان کو سمجھتے تھے کہ یہ بدعقیدہ ہے یہ یہاں کیسے اور یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں عام طور پر بریلوی ہے یا دیوبندی ہے اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو بریلوی نہیں سمجھ رہا ہے لیکن دیوبندی بھی نہیں سمجھ رہا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے بزرگوں سے جو طریقے چلے آرہے ہیں ہم تو اس پر ہیں۔

سوال:۔ دہلی کے اطراف ومضافات اہل سنت وجماعت کی عظیم المرتبت ہستیوں کے مراکز رہے ہیں، خواہ وہ بریلی ہو یا بدایوں یا پھر مراد آباد جہاں سے ہمارے اسلاف نے تمام گستاخانِ رسول کے منہ میں لگام دے کر انہیں خاموش کر دیا مگر ان کے اثرات دہلی پر مرتب نہ ہوسکے، آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی:۔ آپ کو شاید یہ معلوم تو ہوگا کہ منہ میں لگام تو سب سے پہلے دہلی کے علما نے دی ہے پھر بدایوں شریف والوں نے، پھر اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے، آپ تاریخ دیکھئے، مسلمہ طور پر یہ حقیقت ہے وہ جو چودہ سوالات اسماعیل دہلوی صاحب سے جامع مسجد دہلی کے اندر کے حصے میں بیٹھ کر علما نے گھیراؤ دے کر کیے تھے اور کہا تھا کہ ان کے جوابات یہیں دیجیے اور ان کے جوابات انہیں دینے پڑے تھے وہ کون تھے؟ وہ یہیں کہ علمائے اہل سنت تھے اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اسماعیل دہلوی کے لیے کوئی مفر مقرر نہ تھا۔ اُن کو مجبور ہو کر جوابات دینے پڑے جس کو حضرت علاّمہ ابوالحسن زید فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں محفوظ فرمالیا۔ آپ یہ دیکھئے کہ باہر کے علما نے تو یہاں قیام کی

زحمت فرمائی ہی نہیں۔ یہ یہیں کے علما تھے اور ایسے ایسے صاحب علم وفضل اور صاحب تقویٰ اور صاحب روحانیت کہ جن کے اثرات پورے شہر پر لوگوں کو محسوس ہوتے تھے اور اس سے انکار کبھی بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جامع مسجد جیسی تاریخی مسجد جس میں آپ دیکھئے کہ پشتیں چلی آرہی ہیں دو تو آپ کے سامنے ہی ہیں سید احمد بخاری صاحب اور سید عبد اللہ بخاری صاحب ان دونوں کے عقائد کے بارے میں اہل سنت مطمئن نہیں ہیں، لیکن ان کے دادا سید حمید بخاری صاحب کے متعلق مَیں نے خود اپنے جد امجد حضرت علامہ امام الاصفیاء شاہ مظہر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ وہ صحیح العقیدہ تھے اور ان سے پہلے عقیدہ کے اعتبار سے کون صحیح تھے ان کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر علم نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ جب وہ سنی تھے تو آباء واجداد بھی یقیناً سنی رہے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بگاڑ آنے کے باوجود بھی ابھی تک عوام میں اثرات اہل سنت برقرار ہیں خاص طور سے دلی میں جو کچھ بھی آپ کو نظر آتا ہے یہ سب انہیں حضرات کی برکتیں ہیں اور انہیں کی محنتوں کا ثمرہ ہے ورنہ یہ اس اجاڑ میں آپ تو یہاں ایک دن کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ بیرونی علما کے اثرات یہاں اتنے نہیں رہے بلکہ آج جو کچھ بھی ہمارے مسلکی نظریات کا چرچا دکھائی دیتا ہے وہ علمائے دہلی کی دین ہے۔

سوال:۔ دہلی کے مذہب خور اور بدعقیدہ ماحول میں آپ اپنے خانقاہی رسوم و روایات کو کس طرح ادا کرتے ہیں؟ اور اب تک ان کا عوام پر کیا اثر رہا؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی:۔ بات یہ ہے کہ ہم سوئے اتفاق سے اپنی خانہ جنگی کا شکار ہو کر اسی میں الجھ کر رہ گئے ہیں جس طرح ہمیں کامیاب ہونا چاہیے تھا اتنے کامیاب نہیں ہوسکے پھر بھی اللہ کا بڑا احسان اور فضل وکرم ہے کہ مسلسل حضرت جد امجد حضرت علاّمہ شاہ مظہر اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت والد ماجد برابر خدمات انجام دیتے رہے جس کی وجہ سے دہلی اور اس کے اطراف میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہمارے بھائی مسلک حقہ سے روشناس ہوئے اور اب تک وہ اس پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔

سوال:۔ علاقۂ میوات کو آپ کے ارادت مندوں اور عقیدت مندوں کا ایک بڑا

مرکز سمجھا جاتا ہے وہیں دوسری طرف تبلیغی جماعت کی ایک بھاری بھرکم تعداد بھی وہاں سکونت پذیر ہے، ایسے میں آپ کو بدعقیدہ دلوں کو مسلک حقہ سے روشناس کرانے میں کتنی کامیابی حاصل ہوئی؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی: - علاقۂ میوات ایک زمانے سے تبلیغی جماعت کا مرکز رہا ہے اور یہ وہیں پیدا ہوکر پوری دنیا میں پھیل گئی مگر ہمارے خانوادے کے اسلاف اور بزرگوں نے اس علاقہ میں ناقابل بیان جہاد اور محنت شاقہ کرکے لاکھوں افراد کو مسلک حقہ سے متعارف کروایا، ہمارے جد امجد امام الاصفیاء حضرت علاّمہ مفتی اعظم محمد مظہر اللہ شاہ، ان کے جد امجد منبع علم ومعرفت حضرت خواجہ محمد مسعود رحیم بخش اور ان کے خلیفہ حضرت علاّمہ رکن الدین شاہ صاحب اور میرے والد ماجد رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بالخصوص اس علاقے میں کافی تگ ودو کی- ہمارے والد ماجد علیہ الرحمۃ والرضوان جن کو حضرت جد امجد نے اپنی خلافت سے نواز کر میوات کی طرف بھیجا تھا ان کی اس وقت کی مساعیٔ جمیلہ اور مساعیٔ شاقہ آج بھی اپنی برکتیں ظاہر کررہی ہیں کہ کس طرح وہ میوات کا پیدل سفر فرماتے، مسلسل کئی ہفتوں تک ان علاقوں کا دورہ کرتے بعض دفعہ اتنے دن ہوجاتے کہ ان کی کوئی خیریت نہیں ملتی تو حضرت جد امجد پریشان ہوجاتے، حضرت جد امجد کی وفات کے بعد حضرت والد ماجد شاہی جامع مسجد فتحپوری کے امام ہوگئے اس لیے ان علاقوں میں وہ نہیں جاسکتے تھے اس لیے میوات کا علاقہ میری کم عمری کے باوجود میرے والد نے مجھے سونپا اور خلافت سے نوازا، یہ خدا کا فضل واحسان ہے کہ اس نوعمری سے ہی وہاں کی خدمت اللہ رب العزت نے میرے کندھوں پر رکھی اور سمجھئے کہ ۱۹۶۷ء سے برابر یہ سلسلہ چل رہا ہے اور اب ہماری تعداد وہاں ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہے جبکہ ہمارا وہاں وطن نہیں تھا اور تبلیغی جماعت کی اکثریت بھی تھی- یہ تو اللہ کا بے پایاں احسان ہے کہ الور کے حضرت علاّمہ رکن الدین شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارا سلسلہ شروع ہوا اور پھیلا اور پھر مجھ فقیر کے حصہ میں آیا-

سوال: - رویت ہلال کے سلسلے میں دہلی اور اس کے مضافات کے اندر بڑے پیمانے پر آپ کا اثر ورسوخ دکھائی نہیں دیتا ہے یہاں تک کہ اہل سنت وجماعت کے عوام و

خواص بھی جامع مسجد کے اعلان پر انحصار کرتے ہیں ایسے میں آپ کا رویت ہلال کمیٹی کی تشکیل دینا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی: - بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی حقیقت ابھی تک آپ کے سامنے نہیں آئی ہے، تشکیل دینے کا لفظ خود بتارہا ہے کہ ابھی آپ کو رؤیت ہلال کمیٹی کے اس حقیقی بیک گراؤنڈ سے واقفیت نہیں ہے، اس سلسلے میں کئی دہائیوں پہلے حضرت جد امجد رحمۃ اللہ علیہ کے جد گرامی حضرت علامہ شاہ محمد مسعود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اس وقت صرف شاہی جامع مسجد فتحپوری دہلی کی ہی رؤیت ہلال کمیٹی تھی اس کے علاوہ کوئی بھی وہابی تنظیم یا دوسری رؤیت ہلال کمیٹی نہیں تھی اس لیے لوگ حضرت موصوف پر پوری طرح اعتماد کرتے تھے اور ان کی اجازت سے ہی اعلان ہوا کرتا تھا- اس کے بعد جد امجد حضرت علامہ شاہ محمد مظہر اللہ نور اللہ مرقدہ کے ذریعے اعلان ہوا کرتا تھا، مگر اب جبکہ طرح طرح کی رؤیت ہلال کمیٹیاں اور تنظیمیں وجود میں آگئی ہیں جو غیر شرعی طریقے پر چاند کی رؤیت کا مسئلہ اٹھاتی ہیں اور اس پر عمل کرتی ہیں اور رونا تو قوم کا ہے اور خاص طور پر ان ذمہ دار افراد کا جو کہ فی الواقع ہمارے نزدیک اہل سنت کے معتمد افراد میں سے ہیں انہوں نے یا تو مجبوراً یا کسی مصلحت کے تحت ان سے نباہ کرلیا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہمیشہ بڑی شرمندگی سے مانا جائے گا اور کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا، ایسے تشویش ناک ماحول میں بہت سے مخلصین کی رائے سے ہم نے باقاعدہ اجلاس کیا اور عوام کی رائے لی اور جب سبھی اس بات پر متفق ہوگئے کہ اہل سنت وجماعت کی ایک رؤیت ہلال کمیٹی کی ضرورت ہے تو ہم نے اسی پرانی مسجد فتحپوری کی رؤیت ہلال کمیٹی کا احیاء کرکے اسے سنی مرکزی کمیٹی برائے رؤیت ہلال کے نام سے موسوم کردیا تو یہ کوئی تشکیل نہیں بلکہ احیاء ہے- اب ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کوئی ہمارا ساتھ دے یا نہ دے اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ رب کے حکم سے ہوتا ہے اور دین کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر تنہا آدمی بھی ہو تو وہ ایک جماعت ہے بشرطیکہ وہ متوکلانہ قائم رہے- مجھے بڑا افسوس ہے کہ ہم نے اپنی روایات کو فراموش کردیا ہے اور تقویٰ جو اہل سنت کا ورثہ ہے اس میں بڑی حد تک کمزوری آگئی ہے اور عوام تو عوام

خواص نے بھی خاموشی اختیار کر کے ان کے پیچھے اقتدا کر لی ہے اور رؤیت ہلال کے مسئلہ میں ان کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں جبکہ عقیدے کی زبان میں سرے سے ان کے پیچھے نماز ہوتی ہی نہیں ہے باطل ہے تو ان کی اطاعت کسی بھی شرعی امور میں کیا معنیٰ رکھتی ہے؟ آج سے تین سال قبل ہم نے اس مہم کا آغاز کیا اور اسی سال صرف مسجد شیخان باڑہ ہندو راؤ میں ہم لوگوں نے عید کی نماز ادا کی جبکہ پورے دہلی میں تمام لوگوں نے روزہ رکھا یہ ہمارے لیے بڑا صبر آزما مرحلہ تھا مگر ہمیں اللہ پر یقین ہے حالانکہ یہ مضحکہ خیز تھا تو اس کی پرواہ کیے بغیر ہم جہاد کر رہے ہیں اور رؤیت ہلال کا جو شرعی مسئلہ ہے اس پر عمل کر رہے ہیں کیونکہ اہل سنت کی اکثریت ان کے تابع ہو گئی ہے۔

سوال:۔مفتی اعظم دہلی اور قاضی اہل سنت کہلائے جانے کے باوجود آپ کا جماعت کے ہم عصر علما اور مفتیان کرام سے کوئی خاص رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی آپ ان کی مجلسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں کہیں نظر آتے ہیں، اس گوشہ نشینی کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو عمداً نظر انداز کیا جاتا ہے؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی:۔میں اس کا کسی پر الزام نہیں رکھنا چاہتا اور اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ ایک تو میری صحت خراب رہتی ہے اس کی وجہ سے بھی اور اس سے پہلے عادتاً بھی میں کم آمیز ہوں لیکن جہاں تک دینی تقریبات کا تعلق ہے تو اس میں جہاں کہیں ضرورت محسوس کی تو میں حاضر ہوا اب آپ تو علامہ کے پوتے ہیں یہ علامہ ہی کا دم تھا کہ ۱۹۹۵ء کے سنی کانفرنس میں انہوں نے مجھے تقریر کے لیے اصرار فرمایا ان کے اصرار سے مجھے مجبور ہونا پڑا اور میں حاضر بھی ہوا یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کا انکار ہو سکے تو اگر چہ لب پر لانے کی نہیں لیکن حقیقت ہے اس لیے اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا اور جب سوال ہی ہو جائے تو پھر جواب سے گریز مناسب نہیں کہ آخری دور ہے اور علما کی حالت جو ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ کم آمیزی جو ہے اسی بنیاد پر ہے کہ میرے نزدیک جو علما کی شان ہونی چاہیے، اور اس منصب کے لیے جن پابندیوں کو اختیار کرنا چاہیے، اللہ و رسول کی طرف دیکھتے ہوئے اس میں بڑی حد تک کمی ہے۔

سوال:۔قارئین ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

مفتی محمد میاں ثمر دہلوی:۔قارئین جام نور کے لیے تو پھر کبھی پیغام دوں گا سب سے پہلے آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ ایک عام صحافی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اس حیثیت سے کہ آپ علامہ ارشد القادری صاحب کے پوتے ہیں اور علامہ سے جو ایک قلبی تعلق ہے وہ تو ختم ہونے سے رہا بلکہ اب وہ بڑھتا ہی جائے گا تو اس کے پیش نظر آپ کی خدمت میں گزارش یہ ہے کہ آپ بڑی احتیاط سے اس پودے کو پروان چڑھائیے، کیوں کہ

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یہ اس کا ابتدائی دور ہے، آپ اس کی نوک پلک سنواریں گے اور پورے ماحول کا جائزہ لے کر احتیاط سے کام لیں گے تبھی کامیابی آپ کا مقدر ہوگی۔□□□

(شمارہ مارچ ۲۰۰۳ء)

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر

سابق صدر مفتی: ادارہ شرعیہ، پٹنہ (بہار)

فقہ وافتاء اور مذہبی مناظرے کے حوالے سے مفتی مطیع الرحمٰن مضطر رضوی کا شمار ہندوپاک کی ان چند علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے جو اسلاف کی یادگار اور ان کے علمی جانشین ہیں- آپ کی ولادت ۱۹۵۱ء میں ضلع کشن گنج بہار کے ایک غیر معروف گاؤں میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے گھر پر ہی حاصل کی اور پھر علم کی کشش بریلی کے جامعہ مظہر اسلام لے آئی جہاں انہوں نے تقریباً ایک سال گزارے اور پھر درس نظامیہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون کے حصول کے لیے جامعہ عربیہ سلطانپور میں مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی سے اکتساب کیا- اسی درمیان مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں علیہ الرحمہ کی علمی اور روحانی شخصیت سے متاثر ہوکر ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے، برسوں ان کی صحبت میں گزارے اور ان سے فقہ وافتا میں استفادہ کیا، یہاں تک کہ تقریباً تین سالوں کے بعد آپ کو موصوف نے افتا کی قلمی سند عطا فرمائی- تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کئی مدارس میں صدر مفتی، قاضی القضاۃ اور صدر مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں جن میں بالخصوص ادارۂ شرعیہ پٹنہ میں ۱۹۷۸ سے ۹۷ء تک بحیثیت مفتی رہے، پھر اسی ادارے میں علامہ ارشد القادری کے اصرار پر دوبارہ ۱۹۹۶ء میں صدر مفتی اور قاضی القضاۃ کے عہدے پر متمکن ہوئے اور پانچ برسوں تک ملت کی رہنمائی کی- آپ نے فقہی، درسی اور سوانحی موضوعات پر کئی اہم کتابیں بھی لکھیں اور ترتیب دیں ہیں جن میں ''حیات اعلیٰ حضرت'' ۳ رجلدوں میں، قول فیصل، اہل قبلہ کی تکفیر، فیصلہ کن مناظرے کا تنقیدی جائزہ' قابل ذکر ہیں- ان کے علاوہ آپ کی سربراہی میں اس وقت کئی مذہبی ادارے اور تنظیمیں مسلمانوں کی رہنمائی کررہی ہیں-

سوال:- کہا جاتا ہے کہ آج کا دارالافتاء اثر ورسوخ کے دباؤ میں ہے، یہ کہاں تک درست ہے؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- افتاء کا مطلب ہے ''شرعی قانون کے مطابق کسی خاص شخص کی کسی خاص حالت سے متعلق حکم متعین کرکے بتانا''- جیسا کہ امام احمد رضا نے تحریر فرمایا ہے- افتاء کی اس تعریف سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے کسی آدمی کا محض تعلیم یافتہ ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ شرعی قوانین کی تعلیم اور مہارت درکار ہے- یہی نہیں، اس خاص شخص کی اس خاص حالت سے متعلق اس قانون کے انطباق کی اہلیت بھی لازمی ہے- فقہائے عظام نے فرمایا ہے کہ ''کوئی شخص فقہ وفتاویٰ کی تمام کتابوں کو ازبر کرلینے کے بعد بھی اس وقت تک فتویٰ دینے کا اہل نہیں ہوسکتا جب تک تربیت کے بعد اس میں ایک گونہ اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوجائے-'' حدیث پاک کا ارشاد بھی ہے: ''**من یرد الله بہٖ خیراً یفقھه فی الدین**'' جب کہ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے بقول ''ہمارے موجودہ مدارس کی نصابی تعلیم کا حال یہ ہے کہ اس سے علم نہیں آجاتا- بس اس کی استعداد پیدا ہوتی ہے-'' پھر نو فارغین کی بات تو جانے دیجیے- درس دینے والوں کے بارے میں فرماتے ہیں ''آج کل درسی کتابیں پڑھنے پڑھانے سے آدمی فقہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوتا ہے-'' مگر افسوس کہ آج ہر دارالعلوم، ہر مدرسہ، ہر مکتب، بلکہ ہر مسجد میں دارالافتاء قائم کرنے کی ہوڑ نے مدارس نظامیہ سے ہر فارغ شدہ مولوی کو مسند افتاء پر لاکر بٹھادیا ہے- اب ایسے میں ان حضرات کی طرف سے جو فتاوے صادر ہوتے ہیں ان کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے؟ کہنے کی ضرورت نہیں- اور ایسے لوگ اثر ورسوخ کے دباؤ میں فتاویٰ لکھیں تو تعجب کی بات بھی نہیں، ورنہ دارالافتاء اور اثر ورسوخ کے دباؤ کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے؟

سوال:- عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ہمارے مفتیان کرام جوابات لکھنے میں عرف عام، حالات اور زمانے کا خیال نہیں رکھتے اور قدیم حالات کے اعتبار سے شی کی حلت وحرمت متعین کرتے ہیں جس کی وجہ سے آج کا تعلیم یافتہ مسلمان ان فتاویٰ کی روشنی

میں اپنی زندگی گزارنے سے قاصر ہے، کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر ہے تو ان میں تبدیلی لانی چاہیے یا نہیں؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- بلا شبہ بہت سے فروعی احکام عرف و حالات کے پیش نظر قابل تغیر و تبدیل ہوتے ہیں- اسی لیے مفتی کے لیے ایک گونہ اجتہاد کی ضرورت ہے اور جو حضرات اس منصب پر فائز ہیں وہ شرائط کے ساتھ اس کا لحاظ بھی رکھتے ہیں- جو لوگ لحاظ نہیں رکھتے یا شرائط کی پابندی نہیں کرتے وہ ایسے ہی حضرات ہیں جن کی طرف میں واضح اشارہ کر چکا ہوں-

سوال:- بحث و تحقیق کا یہ مسلم نظریہ ہے کہ مسائل کی تحقیقات کا دروازہ بند نہیں ہوتا اور یونہی علمی تحقیقات کے نتائج اگر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو شرعی، سماجی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے کسی کی اہانت نہیں سمجھی جاتی چنانچہ ہمارے پیش رو ائمہ کرام، فقہائے عظام اور علمائے کرام نے بے شمار مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا مگر اسے کسی کی تذلیل و توہین نہیں سمجھا گیا، تو پھر آخر عصر حاضر کے مفتیان اسلام نے تحقیقات کا دروازہ اپنے اوپر بند کیوں کر لیا ہے؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- جو تحقیق و اختلاف شرعی دائرے میں رہ کر، خلوص نیت سے مہذب پیرائے میں ہو، اسے تذلیل و توہین سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں، اس طرح کی تحقیق و اختلاف کا دروازہ کبھی ماضی میں بند رہا ہے اور نہ ہی اب بند ہے، ہاں جو تحقیق و اختلاف شرعی دائرے سے ہٹ کر، خلوص سے عاری، غیر مہذب پیرایہ میں ہو اس کا دروازہ بند رہنا ہی چاہیے-

سوال:- اہل سنت کی ایک کل ہند فقہ اکیڈمی ہو جس سے اہل سنت کے تمام چھوٹے بڑے مفتیان کرام وابستہ ہوں، جس کا اثر و رسوخ ملکی پیمانے پر محسوس کیا جائے اور جس کا فیصلہ آخری متصور کیا جائے، ایسی اکیڈمی کا قیام آپ کتنا ضروری محسوس کرتے ہیں؟ اور اگر اس کے قیام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو اب تک مفتیان کرام کا طبقہ اس کی طرف کیوں نہیں متوجہ ہوا؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- ملک کی آزادی سے کچھ ہی پہلے بنارس میں منعقدہ کل ہند کانفرنس کی مطبوعہ روداد آپ پڑھیں تو واضح ہوگا کہ اس طرح کی اکیڈمی قائم کی گئی تھی جو عرصۂ دراز تک اپنی خدمات سے قوم و ملت کو مستفیض و مستنیر کرتی رہی، مگر جس طرح شروع ایام سے ہماری دوسری تنظیموں کا حال ہوا کہ وجود تک باقی نہیں رہا یا باقی رہا تو تن بے جان کی طرح- اسی طرح یہ فقہ اکیڈمی بھی پردۂ عدم میں چلی گئی- اب پھر از سر نو کچھ کوششیں شروع ہوئی ہیں، خدا کرے بار آور ہوں-

سوال:- عام رائے یہ ہے کہ آپ بہت دنوں تک کسی ایک ادارہ سے وابستہ نہیں رہ سکتے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- آپ کا یہ سوال سنجیدہ بھی ہے اور خاصہ پر لطف بھی- مجھے اس پر حافظ شیرازی کا مصرعہ یاد آرہا ہے......ع

کجا دانند حال ما سبک ساران ساحلہا

غالباً اس طرح کا خیال کرنے والے بیشتر وہ افراد ہیں جو گورنمنٹ سے منظور شدہ مدارس میں ہیں اور حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں کہ ملت کو کہیں اور کیسی ہی ضرورت کیوں نہ درپیش ہو وہ وہاں نہیں جا سکتے، کیونکہ یہاں کے فوائد انہیں وہاں حاصل نہیں ہو سکتے، ورنہ ہمارے سامنے اکابر کی زندگیاں ہیں، جو

خنجر چلے کہیں پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کی مصداق تھیں- حضرت محدث سورتی، حضرت صدر الشریعہ، حضرت ملک العلما وغیرہ کن کن بزرگوں کے نام لوں سبھی حضرات ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے اور دین کی ضرورتیں پوری فرماتے رہے- میں نے بھی کئی جگہیں تبدیل کی ہیں- ادارہ شرعیہ بہار ہی دوبارہ آیا گیا ہوں- سر دست وہیں آنے جانے کے اسباب کا تذکرہ کر دینا کافی ہوگا کہ....ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

یہ غالباً ۷۸ء کی بات ہے میں مدرسہ فیضیہ ایشی پور بھاگلپور میں تدریسی خدمات انجام

دے رہا تھا- ادارۂ شرعیہ بہار کے واحد مفتی و قاضی مولانا فضل کریم صاحب جو شدید
علالت کی وجہ سے تقریباً دو ماہ سے اپنے گھر ضلع سیتا مڑھی میں قیام پذیر تھے، ان کے متعلق
یہ خبر پھیل گئی کہ وصال فرما گئے، حالانکہ خبر غلط تھی، وہ باحیات ہی تھے، البتہ مرض کی شدت
سے کبھی کبھی سکر کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی- آپ سوچ نہیں سکتے کہ اس خبر سے بانی
ادارہ حضرت علامہ ارشد القادری کی کیا کیفیت ہوئی؟ وہ ہوش و حواس گم افتاں و خیزاں سیتا
مڑھی کے بجائے ایشی پور بھاگلپور پہنچ گئے- درد بھرے دل اور ڈبڈباتی آنکھوں سے ادارہ
شرعیہ میں میری ضرورت کا مجھے احساس دلایا اور مدرسے کے ناظم اعلیٰ جناب صدیق
صاحب سے بات کی- علامہ نے ادارہ شرعیہ کا قرار واقعی تعارف اور بروقت اس کی
ضرورت کو بیان کر کے صدیق صاحب سے فرمایا ''ادارہ شرعیہ پورے بہار کے اہل سنت کا
مرکزی ادارہ ہے اور فیضیہ سمیت صوبے کے سارے مدارس اس کے ذیلی ادارے ہیں- ہم
مفتی صاحب کو فیضیہ سے مستقل طور پر نہیں لے جا رہے ہیں- ہنگامی حالات کے تحت
ڈپوٹیشن کے طور پر چلیں- انہیں فیضیہ ہی کے مدرس اور ڈپوٹیشن کے اصول پر تنخواہ بھی فیضیہ
ہی ادا کرے- ادارے میں جوں ہی دوسرے آدمی کا انتظام ہو جائے گا وہ واپس آ جائیں
گے-'' حضرت علامہ کی ان باتوں کا جواب صدیق صاحب بے چارے کیا دے سکتے تھے-
مجبور ہو گئے اور مفت کی ادائیگی تنخواہ سے بچنے کے لیے مجھے فیضیہ کی خدمت سے سبک دوش
کر دیا- اس طرح میں پہلی بار ادارۂ شرعیہ پہنچا، پھر کچھ دنوں بعد قاضی فضل کریم صاحب
بھی صحت یاب ہو کر آ گئے-

ابھی مجھے ادارہ شرعیہ کی خدمت کرتے ہوئے صرف ایک سال ہوا تھا کہ ایک نئی افتاد
آ پڑی- ضلع کٹیہار میں مولانا حفیظ الدین رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ مشہور خانقاہ و مدرسہ
ہے، مولانا موصوف مشرقی بہار کے وہ تنہا بزرگ ہیں جو ۱۳۱۸ھ کو پٹنہ کے اندر ''ندوہ'' کے
خلاف منعقد شدہ اہل سنت کی ہفت روزہ عظیم کانفرنس میں شریک رہے تھے اور امام احمد رضا
کو مجدد کا خطاب دیے جانے کی تائید فرمائی تھی- شروع ایام سے آپ ہی کی نسل کا ایک فرد
جو بچپنے میں گھر سے فرار ہو گیا تھا اور بد مذہبوں کے مدرسہ میں جا کر تعلیم حاصل کر لی تھی، وہ

اپنی ہوشیاری اور صلح کل کی پالیسی سے مدرسہ و خانقاہ پر قابض ہو گیا تھا، جس سے خطرہ پیدا
ہو گیا تھا کہ وہاں کے متعلقین و منتسبین کے عقائد نہ بگڑ جائیں اس لیے اس پورے علاقے
کے علما اور عمائدین اہل سنت نے اس خانقاہ و مدرسہ کو واگزار کرانے کے لیے مجھے مجبور کیا-
اس طرح میں ادارہ شرعیہ چھوڑ کر وہاں چلا گیا اور کئی سال کی مسلسل علمی، قانونی اور عملی
جد و جہد کے بعد الحمد للہ مدرسہ و خانقاہ واگزار ہو گئی تو اسے اسی خاندان کے سنی العقیدہ افراد
کے ہاتھوں سونپ کر الگ ہو گیا-

دوسری بار میں استاذ گرامی حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب مدظلہ العالی کے زیر سایہ
دار العلوم نور الحق فیض آباد میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا کہ حضرت علامہ ارشد
القادری صاحب نے ادارہ شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ملک بھر سے نمائندہ بہاری علما،
دانشوران اور عمائدین اہل سنت کی جنرل میٹنگ بلائی- فیض آباد سے حضرت خواجہ کے جلو
میں میں بھی حاضر ہوا- دو شبانہ روز کی بحث و تمحیص اور کامل غور و خوض کے بعد متعدد نئی
کمیٹیوں کی تشکیل ہوئی، مجلس عاملہ کے صدر ممبر پارلیمنٹ مولانا عبید اللہ خاں اعظمی، مہتمم
مولانا محمد ایوب مظہر منتخب ہوئے اور انہوں نے اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانے کا عہد کیا-
پورے صوبہ میں بیداری لانے کے لیے اصلاح معاشرہ کانفرنسوں کا انعقاد کیا جانا طے کیا
گیا- ضلعی شاخوں کے قیام کا فیصلہ ہوا- افتاء و قضاء کی تربیت کے لیے نئے شعبے کا اضافہ کی
تجویز ہوئی اور اس کے لیے حضرت علامہ کی تحریک پر سب نے بیک زبان میرے نام پر صاد
کی- میں نے اپنی کم علمی اور بعض دوسری وجوہات کی بنا پر مسلسل انکار کیا تو حضرت علامہ
نے میری ایک نہیں سنی اور نہایت ہی رقت بھرے لہجہ میں فرمایا ''مفتی صاحب! ادارہ شرعیہ
کے قیام کا محرک اول اور بانی میں ضرور ہوں، مگر اس کی بنا میں بقدر نصیبہ اس وقت کے
سارے اکابر کا حصہ ہے- بالخصوص اہل سنت کے تاجدار اور آپ کے پیر و مرشد حضور مفتی
اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عین مرضی کے مطابق، ان ہی کی حمایت کے سایہ میں اس کا قیام ہوا
ہے- اگر حضرت کی توجہ خاص اور علمی و فکری سرپرستی ہمیں حاصل نہ ہوتی تو ہم ہرگز ادارہ
شرعیہ کا تصور نہیں کر سکتے تھے، مگر وائے ہماری محرومی و نامرادی کہ جن عظیم مقاصد کے لیے

اس کا وجود ہوا تھا ان کی تکمیل تو کیا ہوتی...... کن کا گلہ کریں کہ صحیح معنوں میں اس طرف پیش
قدمی بھی نہیں ہو سکی- میں اگر چہ اس وقت بھی جوان نہیں تھا، مگر اب تو عمر طبعی کی آخری
منزلوں میں ہوں- اس لیے اس کی باگ ڈور آپ جیسے جوانوں کے ہاتھوں میں دے کر اس
کے اپنے اہداف کو پا لینے کا دن دیکھنا چاہتا ہوں، مگر آپ ہیں کہ کسی طرح تیار ہی نہیں
ہوتے- تو کیا اس کے لیے آسمان سے کوئی آدمی ٹپکے گا یا پردۂ غیب سے نمودار ہوگا؟'' مولانا
عبید اللہ خاں اعظمی نے فرمایا: ''مفتی صاحب! اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے الگ الگ
صلاحیتوں کے افراد پیدا فرمائے ہیں- ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ آپ سے ہر گز نہیں ہوگا اور
آپ جو کر سکتے ہیں وہ ہم کسی طرح نہیں کر سکیں گے، لیکن ہم اور آپ مل جائیں گے تو سب
کچھ کیا جا سکے گا- آج ہم اور ہمارے رفقا ادارۂ شرعیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنا خون تک
دینے کو تیار ہیں- کمی ہے تو صرف ایک آپ کی طرف سے- سن لیجئے! اب خدانہ کردہ ادارۂ
شرعیہ اپنے مقاصد کو پانے میں ناکام رہا تو خدا کے ہاں صرف آپ جواب دہ ہوں گے-''
اس پر میں نے دارالعلوم نور الحق فیض آباد کے سرپرست مولانا محمد حنیف صاحب بستوی
مرحوم سے اپنے معاہدہ کی بات کی تو حضرت علامہ اور مولانا عبید اللہ خاں اعظمی نے ان سے
اجازت دلوانے کا ذمہ اپنے سر لے لیا اور چند دنوں کے بعد حضرت علامہ کا پرزور تفصیلی خط
لے کر مولانا عبید اللہ اعظمی مولانا حنیف صاحب سے ملے اور نہ جانے ان سے کیا کیا کہا کہ
مولانا مرحوم نے خوشی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ مجھے اجازت دے دی-
اس طرح میں ایک بار پھر ادارۂ شرعیہ آ گیا، مگر کیا عرض کروں کہ ابھی چند مہینے ہی ہوئے
تھے کہ مولانا عبید اللہ اعظمی منصب صدارت سے مستعفی ہو گئے- سال تمام ہونے پر مولانا
ایوب صاحب بھی اہتمام سے علیحدہ ہوئے اور میں پھر بھی تقریباً ۵/سال تک ادارہ کی
خدمت کرتا رہا- یہ ہیں میری یہاں سے وہاں منتقل ہونے کی داستانیں- اگر اس طرح میرا
منتقل ہونا جرم ہے تو بیشک میں نے جرم کیا ہے اور دانستہ کیا ہے-

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

سوال:- ایک عرصے سے اہل سنت کے درمیان آپسی نزاع کا بازار گرم ہے جس

نے ہمیں کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ سلسلہ تھمتا دکھائی نہیں دیتا، جس میں سربراہان
اور سرکردہ علما ملوث ہیں- آخر آپسی مصالحت کے لیے کون آگے بڑھے گا اور مصالحت کی کیا
صورت نکل سکتی ہے؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- سربراہان دعا فرمائیں اور خدا کرے کہ دین کا درد رکھنے
والے بالغ نظر علما اور دانشوران آگے بڑھیں- بڑوں کو چھوٹوں سے شفقت و محبت کی اسلامی
تعلیم ملحوظ رہے، چھوٹے بڑوں کا ادب و احترام کا خیال رکھیں تو'' **تعالوا الیٰ کلمۃ سواء
بیننا و بینکم**'' کے پیش نظر مصالحت کی صورت نکل سکتی ہے، اے کاش! ایسا ہو-

سوال:- ''حیات اعلیٰ حضرت'' کے تینوں حصوں کی آپ نے از سر نو ترتیب
دے کر اور اس کی تسہیل فرما کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اس حیثیت سے کہ اس کے
بقیہ دو حصے اب تک شائع نہیں ہوئے تھے، ہمیں اختصار کے ساتھ بتائیں کہ آپ اس کی
ترتیب و تسہیل کی طرف کیسے متوجہ ہوئے اور اس کی ترتیب میں آپ کو کن دشواریوں کا
سامنا کرنا پڑا؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- میں نے ''حیات اعلیٰ حضرت'' کی بالذات تسہیل نہیں کی
ہے، ترتیب نو کے نتیجہ میں خود بخود اس کی تسہیل ہو گئی ہے- البتہ نقل کتاب سے پیدا شدہ علمی
وفنی غلطیوں کی تصحیح حتی الامکان ضرور کی ہے- رہی اس طرف متوجہ ہونے کی بات تو میں
حیات اعلیٰ حضرت جلد اول کے شروع میں ''گفتنی'' کے عنوان سے بیان کر چکا ہوں، اس
طرح اس سلسلہ میں پیش آمدہ کچھ دشواریوں کا اجمالی تذکرہ بھی ہو گیا ہے-

سوال:- اخیر میں ماہنامہ جام نور اور اس کے قارئین کے لیے آپ کوئی پیغام دینا
پسند فرمائیں گے؟

مفتی مطیع الرحمٰن مضطر:- خوشتر صاحب! میں کون اور میرا پیغام کیا؟ بس یہ کہوں گا کہ
مخالف طاقتوں نے منصوبہ بند سازش کے تحت عہد امام احمد رضا کے بعد سے اب تک ہماری
ساری توجہات صرف اور صرف عقائد و مسلک کی کچھ خاص سرحدوں پر مبذول و مرکوز کرا
رکھی ہیں- نتیجتاً ہم نے ساری توانائیاں وہیں صرف کر دی ہیں حتی کہ سپاہیوں کے ساتھ

دوسرے محکموں کے بھی سارے افراد کو فوجیوں کے جھوٹے لبادے میں ملبوس کر کے وہیں اتار دیا-ہم کبھی سوچ ہی نہیں سکے کہ ان کے علاوہ بھی سرحدیں ہیں یا اندرون سرحد بھی دیکھ ریکھ اور کڑی نگاہ کی ضرورت ہے-پہلی بار حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا احساس کیا اور اس وقت کے ''جام نور'' کے ذریعے آواز بلند کی-خدا کرے آپ فکری، علمی اور عملی ہر اعتبار سے علامہ کے صحیح وارث ثابت ہوں اور حضرت علامہ کی اس آواز کو بلند سے بلند کرتے جائیں جیسا کہ آج کے ''جام نور'' کے ذریعے آپ نے اپنی کوشش شروع کر دی ہے اور پھر:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

کا مصداق ہو (آمین) الحمدللہ! آثار ایسے ہی ہیں-□□□

(شمارہ فروری ۲۰۰۴ء)

مولانا منظر الاسلام ازہری

ڈائریکٹر اسلامک ایسوسی ایشن، نارتھ کیرولینا، امریکہ

''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کا اسلامی مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جیسی ضرورت ہوتی ہے خالق ارض وسما اس کے لیے مناسب اسباب پیدا فرما دیتا ہے -جب ہم دین کے حوالے سے ناموافق حالات کے مشاہدہ کے ساتھ اپنی اکابر ہستیوں کو یکے بعد دیگر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو مایوسی ہمارے اعصاب کو جکڑ لیتی ہے مگر یہ دیکھ کر کہ نئے حالات کے مطابق ہم میں افراد بھی اٹھ رہے ہیں، ہمارے اضطراب کو سکون مل جاتا ہے اور پھر ہم بے نیازی سے کہہ دیتے ہیں کہ ''خدا اپنے دین کا محافظ خود ہے-'' مولانا منظر الاسلام ازہری ایک نوجوان فاضل ہیں اور ان کے جوش وولولہ، جذبہ وفکر اور ان کی علمی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور ہمارے سامنے امید کی یہ کرن بھی پھوٹتی ہے کہ شاید خدا ان جیسے نوجوانوں کو اپنے دین کی حالات کے تقاضوں کے مطابق کچھ خدمات انجام دینے کی توفیق بخشے-مولانا موصوف ۱۹۷۸ء میں مدار گنج ضلع ارریا بہار میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حفظ وقرأت تک دارالعلوم عمادیہ پٹنہ (بہار) سے حاصل کی-۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۷ء تک مدرسہ ضیاء العلوم بنارس میں درس نظامیہ کی تکمیل کی، ۱۹۹۷ء میں ہی منظر اسلام بریلی سے دستار بندی ہوئی، ۱۹۹۸ء-۱۹۹۹ء جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی زیر تعلیم رہے اور ۱۹۹۹ء-۲۰۰۳ء تک جامعہ ازہر میں رہ کر ثانویہ، تخصص فی الحدیث اور مذاہب اربعہ میں افتا کی مشق کی، ازہر میں دوران قیام امام احمد رضا بریلوی کے کئی رسالوں کی تعریب، تحقیق اور تخریج کا کام کیا-موصوف کے علمی مضامین مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، جب کہ مختلف کتابوں کے تراجم اور ان کی تحریر کردہ تصانیف شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں-

سوال: - جامعۃ الازہر سے فراغت کے بعد امریکہ کا رخ کرنے کا باعث کیا ہوا؟ اور پچھلے تین برسوں سے امریکہ رہنے کے بعد ایک ازہری ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی دینی و علمی سرگرمیوں سے کتنا مطمئن ہیں؟

مولانا منظر الاسلام ازہری: - امریکہ رخ کرنے کے دو بنیادی اسباب ہیں، پہلی وجہ، علمی، فکری اور دعوتی ہے، دوسری وجہ ادارتی اور معاشی، ، جامعۃ الازہر میں تعلیم کے دوران ،اساتذہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالتے تھے، تفسیر، حدیث، فقہ، عقیدہ سے لے کر فلسفہ تک کے تمام موضوعات میں ایک بات کا خاص لحاظ کیا جاتا تھا کہ موضوع سے متعلق عصر حاضر کے نظریات کیا ہیں؟ ان نظریات کی تردید اکیڈمک اسلوب میں کس طرح کی جاسکتی ہے؟ یورپ اور امریکہ میں اسلام کے خلاف روز بروز جنم لینے والے نئے الحادی افکار کو خاص طور پر سامنے رکھا جاتا تھا، دوران لیکچر اساتذہ ان موضوعات پر بحث و نقاش کو پسند کرتے تھے، میں یہ سوچتا تھا کہ موقع ملے تو ضرور اس الحادی معاشرہ کو دیکھنا چاہیے، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن چیزوں کو میں کتابوں میں پڑھ رہا ہوں اور جن افکار و خیالات کا میرے اساتذہ ذکر کر رہے ہیں ان کو براہ راست دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے گا اور اپنی بساط کے مطاق ایسے بگڑے ہوئے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی جائیگی، مگر یہ سارے خیالات اس وقت دم توڑ دیتے جب اپنے ظاہری اسباب پر نظر پڑتی، کیونکہ امریکہ میں رہنے والے کسی عالم دین سے میرے ایسے تعلقات نہیں تھے جس کی بنیاد پر مجھے امید کی کوئی کرن نظر آتی، اس لیے اس خیال کو دل سے نکال کر پھینک دیتا، مگر بخاری شریف کی حدیث: **الارواح جنود مجندة فما تعارف منها ائتلف وماتناكر منها اختلف** - کے تحت جب ازل میں ہی طے ہو چکا تھا کہ ہماری ملاقات ایسے ملحدوں سے یقیناً ہوگی تو میرے پروردگار نے ہی اس کے لیے سبب بھی پیدا کیا اور ایک اجنبی توسط سے جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ امریکہ سے دعوت نامہ آیا ہے تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا، ضروری کارروائی کے بعد الحمدللہ مجھے بڑی آسانی سے ویزا مل گیا اور میں اکتوبر

۲۰۰۴ء میں امریکہ پہنچ گیا- دوسری طرف جامعۃ الازہر سے فراغت کے بعد ہندوستان میں علمی اور ادارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کا جذبہ بھی ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا تھا، ہندوستان جیسے ملک میں جہاں پہلے ہی سے درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں خیراتی ادارے مسلمانوں کی توجہات کے مرہون منت ہیں اس زمین پر اپنی فکر کو عملی جامہ پہنانا بظاہر مجھے آسان نہیں لگ رہا تھا قادر مطلق نے میری مدد فرمائی، اور مجھے امریکہ پہنچنے کا موقع عطا فرمایا، گرچہ یہاں پہنچ کر بھی مجھ جیسی طبیعت رکھنے والوں کے لیے اس فکر کی تکمیل مشکل ہی ہے تاہم اللہ تعالی کی ذات سے کامل یقین ہے، غرضیکہ یہی دو بنیادی اسباب ہیں جو امریکہ آنے کا باعث بنے-

جو کچھ میں نے اپنے اساتذہ کی زبان سے سنا تھا، اور جن چیزوں کو عربی زبان میں پڑھا تھا، ان سب کو یہاں قریب سے دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، ابتداء میں کیلیفورنیا کے مشہور شہر سانفرانسیسکو میں رہا، جغرافیائی اعتبار سے اس شہر کو پوری دنیا میں اور خاص طور پر امریکہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، سمندر، سبز پہاڑ، شفاف چشمے جہاں ایک طرف اہل نظر کے لیے دعوت نظارہ ہیں وہیں بدقسمتی سے اوباش خیالی اور الحادی فکر میں بھی یہ شہر اپنی نظیر آپ ہے، پہلے سے موجود مختلف اسلامی تنظیموں سے میں نے رابطہ کیا، ان کے طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر اپنے طور پر میں نے تبلیغی مہم کا آغاز کیا، کسی نئے ملک اور نئی قوم کے درمیان پہنچ کر اپنے کاز سے فوراً مطمئن ہو جانا کوئی آسان کام نہیں، دعوت و تبلیغ کا میدان کوئی Majic stick نہیں ہے کہ ہلاتے ہی اندر کا جن باہر آ کر پلک جھپکتے ہی سارا کام انجام دیدے اور انسان اپنی کوششوں سے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، اس لیے ازہری ہونے کی حیثیت سے میں اپنی دینی اور علمی سرگرمیوں سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں، البتہ جس نہج پر میں اپنی ازہری فکر کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا ہوں توفیق ایزدی شامل رہی تو یقیناً مجھ جیسے درجنوں داعیان اسلام کے سکون کا باعث بن سکے گی-

سوال: - دیکھا گیا ہے کہ یورپ و امریکہ کا رخ کرنے والے اکثر اہل علم دعوت و تبلیغ کے نام پر سفر کرنے کے بعد وہاں اپنی سرگرمیوں کو امامت تک محدود کر دیتے ہیں، آپ

ان سے مختلف کیسے رہے اور آئندہ کے لیے آپ خود سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:- آپ اور آپ جیسے بہت سارے ملت کا درد رکھنے والوں کا مشاہدہ یقیناً درست ہے کہ یورپ اور امریکہ میں دعوتی کام انجام دینے والے عام طور پر اپنی سرگرمیوں کو امامت تک محدود کر دیتے ہیں، اب میرا مشاہدہ سماعت کیجئے! در اصل یورپ وامریکہ کا سفر کرنے والے علما دو طرح کے ہیں، پہلی قسم میلادی، نیازی، تعویذاتی اور آسیبی علما کی ہے، جبکہ دوسری قسم میں باوقار فاضل علما کرام ہیں، پہلی قسم کے جو علما ہیں وہ برطانیہ، ہالینڈ، ساؤتھ افریقہ، امریکہ وغیرہ محض کسی خاص تعلق، دوستی، رشتہ داری کی وجہ سے آگئے ہیں، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی زمین پر وہ بھاری تھے تو کسی طرح امریکہ یا یورپ پہنچ گئے، یہ زیادہ تر اپنے اوقات کا استعمال جھاڑ پھونک، دعاء تعویز، ٹیوشن پڑھانے، اردو بولنے والوں کے گھروں میں جا کر میلاد خوانی کرنے اور اس طرح کے دوسرے مشاغل میں کرتے ہیں، اصل میں یہ لوگ مقصد علم ہی سے ناآشنا ہیں، اس لیے صحیح علم تک ان کی رسائی بھی نہیں ہوسکی اور جب علم حقیقی تک نہیں پہنچ سکے تو وہ امریکہ کیا چاند پر بھی پہنچ جائیں تو کسی آسیب زدہ ہی کہ تلاش میں رہیں گے، ان لوگوں کا ماننا ہے کہ مسجد یا سینٹر کی طرف سے جو ذمہ داری ملی ہے وہی در اصل کام ہے، یعنی پانچ وقت کی نماز پڑھا دینا، بچوں کو ایک گھنٹہ پڑھا دینا یہی اصل ذمہ داری ہے، اس کے علاوہ جو اوقات ہیں ان میں دعاء تعویذ کرنا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو امامت تک ہی محدود رکھا، امریکہ کیوں آئے اس کا انہیں علم ہی نہیں، ان کے پڑوس میں کوئی ملحد بھی رہتا ہے، یا کوئی ایسا شخص ہے جو اسلام سمجھنے میں دلچسپی رکھتا ہے اس سے وہ کوئی سروکار بھی نہیں رکھنا چاہتے، بڑے بڑے انگریز اسکالرز جو مسلمان ہوئے ان کے نظریات کیا ہیں؟ وہ اسلام کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ اس جانب کبھی انہوں نے توجہ ہی نہیں کی، اگر کبھی کسی نے ان کی مجلس علم (آسیبی مجلس) میں کسی نئے مسلم اسکالر کا ذکر چھیڑ دیا تو ایک لفظ میں بحث کا دروازہ بند کر دیتے ہیں کہ وہ بدعقیدہ ہے-

دوسری قسم کے جو علما ہیں، فاضلانہ کردار، عالمانہ وقار اور فکری بلندی کے مالک ہیں،

انہیں اپنے مقصد کا خوب پتہ ہے، اس کے حصول کے لیے وہ پیہم کوشش بھی کرتے رہتے ہیں، ان کے نزدیک تبلیغی سرگرمیوں کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کا طریقہ خود مختار ادارہ کی موجودگی ہے (جو کسی حد تک درست بھی ہے)، اس کے لیے انہوں نے ادارتی کام کی ذمہ داری سنبھال لی ہے، جس کی وجہ سے علمی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود وہ علمی سرگرمیوں سے کٹ گئے-

جہاں تک میرا مسئلہ ہے تو مجھے فطری طور پر درس نظامی کے پہلے سال سے ہی لکھنے اور مطالعہ کرنے سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی، بنارس میں تعلیم کے دوران جب اپنے اساتذہ کو کسی اہم مسئلہ پر بڑی بڑی کتابوں کی طرف رجوع کرتا دیکھتا تھا تو میرے دل میں ان کتابوں کو جلد از جلد سمجھنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، ایک مرتبہ میرے استاذ مفتی قاضی فضل احمد مصباحی کا ایک غیر مقلد سے فاسق کی نماز جنازہ سے متعلق تحریری مناظرہ شروع ہوا، حوالہ اور مصادر کی تلاش میں تفسیر، حدیث، رجال کی بڑی بڑی کتابوں کو سامنے رکھ کر اس کا جواب لکھتے تھے، میں بہت شوق سے ان کتابوں کو اٹھاتا تھا، میں ابتدائی درجہ کا طالب علم ہونے کی وجہ سے صرف کتابوں کو لانے اور لیجانے کا کام ہی کر سکتا تھا، ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر لانے کو کہا، میں نے کتاب لاتے ہوئے ایک بار کھول کر دیکھا تو صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ اس مسئلہ میں سولہ بحثیں ہیں، ہر بحث کے دس پہلو ہیں، مجھے یہ بات بہت پسند آئی، جب حضرت مفتی صاحب حوالہ تلاش کر چکے تو میں دیر تک کتاب ہاتھ میں لیے الٹتا رہا، اللہ تعالی سے دعاء کرتا رہا کہ جلد مجھے بھی یہ کتاب سمجھنے کا موقع عطا فرما، ٹھیک یہی خیال رجال کی کتابوں کو بھی ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھنے میں ہوا، فراغت کے بعد جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء میں داخلہ ہوگیا (وہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے) وہاں ادیب عصر مولانا مقبول صاحب مدظلہ العالی سے کم وبیش چھ مہینے استفادہ کیا، ان چھ مہینوں میں ان سے مقالہ نگاری کا ڈھنگ سیکھنے کا خوب موقع ملا، پھر اللہ تعالی نے مجھے الازہر شریف جانے کی سعادت بخشی، میں نے اپنا تمام مقصد پڑھنے اور لکھنے پر صرف کیا، اس سے میرے دل میں مطالعہ اور تحریر کی محبت راسخ ہوتی گئی، چونکہ میں نے اپنے مقصد کی

تعیین پڑھنے کے زمانہ میں ہی کرلی تھی اس لیے امریکہ جیسے علم خور ملک میں سب سے پہلے
میں نے سینٹر کی ذمہ داری کے علاوہ مطالعہ اورتحریر کا وقت نکالنے کی کوشش کی، گرچہ شروع
میں کچھ دنوں تک میں بھی علم سے کٹا رہا مگراس دوران میرا ضمیر مجھے بار بار ملامت کرتا رہا
،اس لیے جلد ہی میں نے مطالعہ کرنے اور حاصل مطالعہ کو قید تحریر میں لانے میں کامیاب
ہوگیا، بحمدہ تعالی اس وقت میں اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود روزانہ کم ازکم چالیس سے
پچاس صفحات کا مطالعہ کرتا ہوں، کبھی موضوع زیادہ دلچسپ رہتا ہے تو ایک ساتھ پوری
کتاب پڑھ لینے کا شرف بھی مل جاتا ہے، یہ سب میرے پروردگار کا فضل، بزرگوں کی
عنایتیں، والدین کی دعائیں اوراساتذہ کی محنتوں کا نتیجہ ہے، آئندہ بھی اپنے پروردگار سے
یہی دعا کرتا ہوں کہ میری اس دلچسپی کو برقرار رکھے اور مجھے اسلام کی خدمت کا خوب سے
خوب موقع عطا فرمائے-

سوال:- ہندوستان سے مصراوروہاں سے پھر امریکہ جانے کے بعد آپ اپنی دعوتی
واسلامی سوچ میں کس طرح کی تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

مولانا منظرالاسلام ازہری:- جب میں ہندوستان میں تھا تو میری بھی فکر عام طلبہ کی
طرح تھی، کبھی یہ سوچتا تھا کہ ایک اچھا مفتی بننا ہے، کبھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ مناظر بن جانا
زیادہ اچھا ہوگا، کئی بار یہ خواہش ہوتی تھی کہ کسی میدان میں کامیابی نہیں ملی تو جعلی سند حاصل
کرکے پیر بن جاؤں گا مگر میری یہ تمام فکریں اس وقت دم توڑ دیتیں جب میرے والد محترم
(اطال اللہ عمرہ) خط لکھ کر یا ہر دو تین ماہ بعد مدرسہ میں آکر یہ کہتے کہ آپ کو جامعۃ الازہر جانا
ہے، جب سے میں نے شعور کی منزل میں قدم رکھا تھا اس وقت سے ہی والد صاحب کی یہ
بات میرے کانوں سے ہر وقت ٹکراتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے میرے اندر سوچنے کا جذبہ
بیدار ہوا، پھر جب الازہر شریف پہنچا تو پیر بننے کا خیال تو پہلے ہی دم توڑ چکا تھا، عالمی سطح پر
دعوتی کام کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا، وہاں بھی والد صاحب کے خطوط میری فکر کو مہمیز دیتے
رہے، ہمیشہ ان کی تلقین ہوتی تھی کہ عالمگیر فکر رکھنا ہے، کبھی وہ بڑے بڑے علما، مشائخ اور
دانشوران کی مثالیں بھی پیش کرتے تھے، آج جبکہ میں امریکہ پہنچ چکا ہوں تو بھی ان کی

رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ہے، قیام مصر کے دوران جو کچھ میں نے پڑھا، سنا تھا اس کا ہر
وقت یہاں مشاہدہ ہوتا ہے، اس کو علمی اور دعوتی انداز میں بروئے کار لانے کی کوشش کرتا
رہتا ہوں، میں نے مصر میں کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے کسی چرچ میں بھی جا کر لیکچر دینا
پڑیگا، یا جب پیغمبر اسلام کی ذات مقدس پر حملے ہوں گے تو امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں منعقد
سیمینار میں رسول کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ کے پیش کرنے کا موقع ہاتھ آئیگا، بحمدہ تعالی
یہاں اس طرح کے مواقع خوب ملتے ہیں، اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے اسلام اور پیغمبر
اسلام کے حقائق کو دوٹوک الفاظ میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں-

سوال:- ۹/۱۱ کے بعد امریکہ میں اسلام کا فروغ، عصر حاضر کا ایک گرم موضوع
بحث ہے، اس حوالے سے آپ کے خیالات کیا ہیں؟

مولانا منظرالاسلام ازہری:- یہ سچ ہے کہ نائن الیون کے بعد قلمکاروں نے اس
موضوع پر گرما گرم بحث شروع کر رکھی ہے، مگر صداقت سے کہیں زیادہ مبالغہ ہے، یہ ٹھیک
ہے کہ مسلمانوں میں سیاسی سوج بوجھ، تنظیمی ڈھانچہ کے قیام کا شعور ضرور تیزی سے بڑھا
ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۲ء کے دوران ڈیڑھ لاکھ امریکی مسلمان
ہوگئے، ایک اندازہ کے مطابق نائن الیون سے پہلے ہی سالانہ پچاس ہزار امریکیوں کا
اسلام قبول کرنا بتایا جاتا ہے، نائن الیون کے بعد اس تعداد میں اضافہ یقیناً ہوا ہے، مگر مسجد
اور اسلامک سینٹر کا رخ کرنے والے تمام امریکی اسلام ہی قبول کرنے جاتے ہوں ایسا بھی
نہیں، ہاں اسلام سمجھنے کا شعور، قرآن پڑھنے کا رجحان، نبی اکرم ﷺ کی سیرت کے مطالعہ
کی طرف توجہ (بالخصوص کارٹون ایشو کے بعد) ضرور بڑھا ہے، میں ان لوگوں میں سے
نہیں جو ریت پر محل تعمیر کرکے حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں اور قوم کو خوش فہمی کی بھول
بھلیوں میں رکھ کر فکری شعور کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی کچل ڈالتے ہیں-

سوال:- روزنامہ ٹائمز آف انڈیا اشاعت ۲۶/ جولائی ۲۰۰۷ء کی ایک سروے
رپورٹ ہمارے سامنے ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ 60% امریکی اپنی آنے والی نسل کے
تئیں تشویش میں مبتلا ہیں، صرف 30% ان کی بہتر زندگی کی امید رکھتے ہیں، اور 4% ایسے

ہیں جن کا کہنا ہے کہ آنے والے دن موجودہ حالات پر رہیں گے، اس حوالے سے آپ کی کیا رائے ہے؟ امریکی معاشرہ نفسیاتی طور پر کس رخ پر جارہا ہے؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:- روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کا سروے اپنی جگہ درست ہے، امریکی معاشرہ بہت تیزی سے انحطاط کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کے متعدد اسباب ہیں، مثلاً صلہ رحمی کا فقدان، باہمی محبت کی کمی، والدین کی نافرمانی، اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ امریکی قانون کے مطابق اٹھارہ سال کے بعد بچہ آزاد ہوجاتا ہے، والدین اس پر کچھ جبر نہیں کرسکتے، جس کا خطرناک اثر معاشرہ پر یہ پڑ رہا ہے کہ بچے والدین کے سامنے بے حیائی میں مصروف رہتے ہیں، والدین اشک بہانے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے-

شادی کا رسم ختم ہوتا جارہا ہے، عورت ومرد غیر شرعی تعلق کو ترجیح دیتے ہیں، ولد الزنا کی کثرت ہے، ستر کی دہائی میں تو شادی اور طلاق کا تھوڑا بہت رواج بھی تھا، مگر آج تشویش کی حد تک اس میں کمی واقع ہوچکی ہے، اس سے معاشرہ پر نفسیاتی دباؤ بڑھ رہا ہے، امریکہ کی مشہور مصنفہ Maggie Gallagher نے اپنی کتاب Abolotion of marriage مطبوعہ مئی ۱۹۹۶ء میں اس خدشہ کا اظہار بھی کیا ہے-

سوال:-۹/۱۱ سے اب تک پچھلے سات سالوں سے امریکہ مسلسل دہشت گردی مخالف مہم میں لگا ہوا ہے، اس سے قطع نظر کے یہ مہم ہر طرح فلاپ ہے، سوال یہ ہے کہ امریکی ادیب، صحافی، لیڈر اور عوام اس مہم کو اب کس نظر سے دیکھ رہے ہیں اور اس مہم سے صدر بش کے امیج پر کیا اثر پڑا ہے؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:-حقیقت یہ ہے کہ امریکی عوام صدر بش کی موجودہ پالیسی سے سخت نالاں ہیں، خاص طور پر تجارتی طبقہ صدر بش اور ان کی پالیسی سے مطمئن نظر نہیں آتا ہے، دانشوران، صحافی، سیاسی لیڈران سے لے کر عوام تک کی یہی خواہش ہے کہ صدر بش کی war and terror پالیسی صحیح نہیں، آجکل تو کانگریس میں بڑی زور وشور سے اس بات پر بحث جاری ہے کہ فوج کو جتنی جلد ہوسکے عراق سے واپس بلالیا جائے، جبکہ صدر بش اسے اپنی انا کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور کانگریس کی قرارداد کو ویٹو کردیتے ہیں، New

Yourk Times کے اے جائزہ کے مطابق جو جولائی ۲۰۰۷ء میں کرایا گیا ہے، ۵۱ فیصد لوگ عراق جنگ کے مخالف نظر آتے ہیں، اور مئی ۲۰۰۷ء میں ۶۱ فیصد لوگوں کی رائے تھی کہ امریکہ کو عراق سے باہر آجانا چاہیے- مذکورہ اخبار کے سروے کے مطابق جو جون ۲۰۰۷ء اور جولائی ۲۰۰۷ء میں کیا گیا، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ عراق میں امریکی جنگ کی وجہ سے دہشت گردی بڑھ رہی ہے یا اس میں کچھ کمی آرہی ہے؟ جون میں ۵۱ فیصد نے کہا کہ دہشت گردی میں اور اضافہ ہورہا ہے، ۱۷ فیصد کا کہنا تھا کہ دہشت گردی میں کمی آرہی ہے، ۲۴ فیصد کا کہنا تھا کہ دہشت گردی پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا، ۸ فیصد نے کہا کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں-

جولائی کے سروے کے مطابق ۴۴ فیصد لوگوں کا ماننا تھا کہ دہشت گردی بڑھ رہی ہے، اٹھارہ فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ دہشت گردی کا خاتمہ ہورہا ہے، ۲۷ فیصد کا ماننا تھا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے، ۱۱ فیصد کا کہنا تھا کہ نہیں معلوم-

ایک اور سوال کہ اس جنگ سے کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ کے جواب میں ۳۶ فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ جنگ مفید ہے، ۶۳ فیصد لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، ایک فیصد کا کہنا تھا کہ مجھے نہیں معلوم-

اپریل ۲۰۰۳ء میں اسی سوال کے جواب میں ۷۰ فیصد لوگوں کا کہنا تھا جنگ کرنا مفید ہے، ۲۷ فیصد کا خیال تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، ۲ فیصد کا کہنا تھا کہ مجھے نہیں معلوم-

اس سے صدر بش کی حیثیت بری طرح متاثر ہوئی ہے، اس کا اندازہ مذکورہ اخبار کے اس سروے سے لگایا جاسکتا ہے جو جولائی ۲۰۰۷ء میں اس اخبار نے کیا ہے، اس کے مطابق ۲۹ فیصد کا ماننا تھا کہ صدر بش جو کر رہے ہیں وہ صحیح ہے، ۶۴ فیصد کا کہنا تھا کہ یہ غلط ہے، ۷ فیصد کا کہنا تھا کہ مجھے نہیں معلوم-

دسمبر ۲۰۰۵ء میں ۴۰ فیصد کا کہنا تھا کہ وہ ٹھیک کر رہے ہیں، ۵۳ فیصد کا ماننا تھا کہ ان کا یہ قدم غلط ہے، ۷ فیصد کا کہنا تھا کہ مجھے معلوم نہیں- دانشوروں کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۴ء میں صدر نکسن کے ساتھ جب Water gate Scandal کا معاملہ ہوا تھا تو انہوں نے صرف اسلیے

استعفی دے دیا تھا کہ لوگ ان سے بہت زیادہ بدظن ہو چکے ہیں، صدر بش کا گراف اس سے کہیں زیادہ گھٹ گیا ہے۔(ABC NEWS January 2007)

سوال:۔امریکہ کے اندر مذہبی آزادی کی کیا صورت حال ہے؟ کیا وہاں پرمسلم پرسنل لا کا کوئی تصور موجود ہے؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:۔امریکہ ایک جمہوری ملک ہے، یہاں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے طریقہ پر عبادت بجالانے کی پوری اجازت ہے، جمعہ،عیدین اور دیگر مذہبی پروگرام مسلمان آزادی کے ساتھ مناتے ہیں، کمپنیوں میں کام کرنے والے لوگوں کو عام طور پر جمعہ کی نماز کے لیے چھٹی بھی مل جاتی ہے، البتہ مسلم پرسنل لاء کا یہاں کوئی تصور نہیں۔

سوال:۔امریکہ میں مسلم دعاۃ ومبلغین اور علما وقائدین کی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہیں اور امروز وفردا پر نظر کرتے ہوئے آپ ان سے کس طرح کی جدوجہد کا تقاضا کریں گے؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:۔امریکہ میں دعوتی کام کرنے کے چار پلیٹ فارم ہیں، مساجد، اسلامک اسکول، اسلامک سینٹرز اور تنظیم ،تنظیم کی مختلف شکلیں ہیں ، کچھ تنظیمیں ملکی سطح پر ہیں، کچھ صوبائی سطح پر، کچھ کی سرگرمیاں علاقہ تک ہی محدود ہیں اور کچھ اسٹوڈنس کی تنظیمیں ہیں جو یونیورسٹیوں میں کام کرتی ہیں، دعوت کی یہ تمام شکلیں دو قسموں میں منحصر ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جن کا مقصد امریکی باشندے اور غیر مسلمان نہیں (بلکہ انہیں اس کا احساس ہی نہیں) بلکہ اپنے ہم ملک، ہم زبان، ہم خیال لوگ ہیں، اس قسم کے دعاۃ کا تعلق زیادہ تر ہندو پاک سے ہے، اس کی اصل وجہ ان مدعو کی زبان اور فکر سے ناآشنائی ہے (جو کہ دعوت کا اساسی پہلو ہے) دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ہم مذہب کے ساتھ ساتھ امریکیوں پر زیادہ توجہ مرکوز کرتا ہے، یہ عام طور پر عرب دعاۃ ہیں، غیر مسلموں سے میل جول، انہیں اپنے پروگراموں میں بلانا، ان کے پروگراموں میں جاکر اسلام کی تشریح کرنا، چرچوں میں جانا، قرآن کریم تقسیم کرنا، سیرت پر لکھی گئی کتابیں تقسیم کرنا، ان کا عام طریقہ کار ہے جو بہت حد تک مؤثر بھی ہے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر میرے خیال میں دوسرا طریقہ زیادہ پسندیدہ ہے،

امریکی بہت سادہ لوح ہوتے ہیں، اخلاق اور کردار سے انہیں بہت جلدی متاثر کیا جاسکتا ہے، وہ عام طور پر ہٹ دھرم نہیں ہوتے ، ایسے ماحول میں صوفیۂ کرام کی سخت ضرورت ہے جن کی شکل دیکھ کر لوگ اسلام قبول کرلیں۔

سوال:۔ذرائع ابلاغ سے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں امریکہ میں تصوف اور روحانیت کو بہت زیادہ فروغ مل رہا ہے، آپ کے نزدیک اس بات کی کیا حقیقت ہے؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:۔تصوف کی جہاں تک بات ہے تو آپ یہ سن کر حیران رہ جائیں گے کہ پوری دنیا میں روحانیت کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھ رہا ہے، یہاں امریکہ میں عرب مشائخ ،بعض ترک مشائخ اور نیو مسلم امریکی اس طرف بہت تیزی سے بڑھ رہے ہیں ، رومی کی امریکہ میں مقبولیت سے متعلق میرا ایک مضمون جام نور میں شائع ہو چکا ہے، حضرت رومی کی کتاب پڑھ کر امریکی اسلام سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں، یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ہندوستان جہاں کہ حضرت خواجہ غریب نواز نے اپنی ایک نگاہ سے لاکھوں دلوں کو ایمان کی دولت عطا کردی تھی اور صحراء افریقہ میں جو کام مرابطین کی جماعت نے کیا، ٹھیک اسی کام کو ماضی قریب میں سری لنکا کے ایک صوفی منش درویش بابا عبدالرحیم نے انجام دیا، بابا عبدالرحیم سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے، ظاہری خدوخال اور شکل وصورت سے درویشی پھوٹتی تھی، بظاہر کالے رنگ کے (جیسا کہ سری لنکا کے باشندے عام طور پر ہوتے ہیں) مگر بلال حبشی کا اثر ان کے قلب وجگر میں بسا ہوا تھا، انہیں اپنی علاقائی زبان تامل کے علاوہ کوئی دوسری زبان بھی نہیں آتی تھی، مگر ان کے دل کی زبان سے جو بات نکلتی تھی سننے والے انگریز کے دل میں اتر جاتی تھی، ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو اور دل موہ لینے والی بات ہی کی وجہ سے امریکہ کے اسسٹنٹ جنرل سکریٹری روبرٹ مولر نے انہیں خصوصی دعوت دے کر بلایا تھا اور اسلام کی آفاقی دعوت اور امن وامان کے پیغام سے متعلق کچھ گزارشات بھی کی تھی، جو امریکیوں کے دلوں میں گھر کر گئی، پھر تو بابا عبدالرحیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ دامن اسلام سے وابستہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ایک دو درجن نہیں سیکڑوں یہودیوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، سری لنکا واپس چلے گئے ت حلقہ

بگوشوں کو راحت نصیب نہیں ہوئی ،اتنے مصر ہوئے کہ پھر یہاں آ کر ہی آباد ہونا پڑا، ۱۹۸۶ء میں آپ کا وصال ہوا، جاں نثاروں نے ٹھیک اسی طرح مزار کی تعمیر کی جیسا کہ ہند وپاک میں مزرات گنبد کے ساتھ تعمیر کیے جاتے ہیں اور امریکہ کے صوبہ Philadelphia میں آج تک آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے، مجھے ذاتی طور پر جولائی ۲۰۰۶ء میں زیارت کا شرف ملا ہے، میں نے ان لوگوں سے بات بھی کی جنہیں ان کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف ملا ہے، بابا عبدالرحیم فلوشپ کے نام سے انہوں نے ایک تنظیم بنائی ہے، جس کا کام تصوف کا فروغ، پیغام اسلام کی ترویج واشاعت، سالانہ عرس اور لٹریچر کی طباعت ہے، کانگریس لائبریری سے آپ کے اکثر ملفوظات چھپ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں- اس میں کچھ شک نہیں کہ آج بھی اسلام کی تبلیغ کا صحیح کام صوفیۂ کرام ہی انجام دے رہے ہیں-

سوال:- رؤیت ہلال اور اس طرح کے دوسرے مسائل کے حوالے سے امریکی علما اور مسلمانوں کا نظریہ وعمل کیسا ہے؟ خصوصا علماے اہل سنت کا عمومی رویہ کیسا ہے؟ اگر اس حوالے سے امریکی مسلمانوں کے لیے کچھ ''خاص عذر'' سمجھتے ہیں تو ان کی وضاحت کریں؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:- رؤیت ہلال سے متعلق امریکہ میں چار ادارے ہیں ،ایک یہاں کی سب سے بڑی تنظیم اسنا ہے، جو سعودی عرب کا ترجمان ہے، انہوں نے سعودی کیلینڈر کی روشنی میں اپنا ایک کیلینڈر ترتیب دے رکھا ہے چاند دیکھنا کوئی ضروری نہیں سمجھتے ، بلکہ اس کے عبادت ہونے کا بھی انکار کرتے ہیں، جبکہ ان کے کیلینڈر کو خود سعودی ماہرین نے چیلنج کر رکھا ہے-

دوسرا ادارہ دیوبندیوں کا ہے، جو امریکہ کے بڑے بڑے صوبوں میں موجود ہے، یہ لوگ حنفی اصول کو ہی سامنے رکھ کر فیصلے کرتے ہیں مگر کبھی کبھی سعودی مصلحت بھی ان کے آڑے آجاتی ہے تو اس جماعت کے بڑے بڑے قاضی بھی Under the Table سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور غلط بیانی سے باز نہیں آتے، جیسا کہ گذشتہ عید میں ہوا-

تیسرا ادارہ علما اہل سنت کا ہے، جو چاند کے معاملہ میں بڑا احتاط رویہ رکھتا ہے اور شہادت

ورؤیت پر ہی اس کا پورا دارو مدار ہے، ہم لوگ یہاں ٹیلیفونک گواہی کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں متعدد ٹیلیفون کو استفاضہ کے حکم میں مان کر چاند کا اعلان کر دیا جاتا ہے، مولانا قمر الحسن بستوی صاحب جو کہ جماعت کے قاضی ہیں، ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں چاند نظر آجاتا ہے اس علاقہ کے کسی سنی عالم کو اپنی قضاء بذریعہ ٹیلیفون تفویض کر دیتے ہیں، وہ عالم وہاں موجود لوگوں سے گواہی لیکر اعلان کر دیتا ہے-

ٹیلیفون کی خبر پر اعتماد کرنے کی کئی وجوہات ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امریکہ بہت بڑا ملک ہے، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں ہوائی جہاز سے گھنٹوں لگ جاتے ہیں، مختلف صوبوں کے مابین تین تین گھنٹوں کا فرق ہے، یہ اور اس طرح کی دیگر شرعی وجوہات کے پیش نظر ٹیلیفون کی خبر کو معتبر مان لیا گیا ہے-

چوتھا ادارہ ماہرین ہیئت اور ڈاکٹروں کا ہے، یہ لوگ سائنس کو وسیلہ کی حیثیت دیتے ہیں، اپنے علم کی روشنی میں امکان رؤیت کا اعلان پہلے ہی سے کر دیتے ہیں، رؤیت نہ ہونے پر یہ علما کی موافقت کرتے ہیں، انہوں نے اپنی تنظیم میں دیوبندی اور سنی دونوں ہی علما کو شامل کر رکھا ہے اور دونوں کے مشورہ سے فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ گرچہ منجھے ہوئے سائنٹسٹ ہیں مگر ان کی تنظیم ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے، مئی ۲۰۰۷ء میں ان لوگوں کے ساتھ کیلیفورنیا میں منعقد ایک نیشنل سیمینار میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا، جس میں مولانا زرقانی صاحب بھی شریک تھے، ذاتی طور پر میں ان کے طریقہ کار سے متفق ہوں اور میرے نزدیک اختلاف کو حل کرنے کا یہ بہت آسان ذریعہ ہے-

سوال:- جام نور کے حوالے سے آپ کے جذبات کیا ہیں؟

مولانا منظر الاسلام ازہری:- جام نور اہل سنت و جماعت کا معیاری اور مقبول ترین رسالہ ہے، اس کے قارئین باشعور ہیں، گزشتہ کئی سالوں سے آپ کی ادارت میں کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، مختلف حلقوں سے خراج تحسین بھی حاصل کر رہا ہے، میں ہمیشہ اسے ترقی کے بام عروج پر دیکھنا چاہتا ہوں، اللہ تعالی اس کی عمر دراز فرمائے-□□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۰۷ء)

مفتی محمد نظام الدین رضوی

صدر: شعبۂ افتا، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

حسب ونسب اور مال ودولت سے تو بہت سے لوگ پہچانے جاتے ہیں، مگر اپنی ذاتی خوبیوں اور علمی لیاقتوں کے سبب شہرت ومقبولیت بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے- محقق مسائل جدیدہ مفتی محمد نظام الدین رضوی کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے علم وفکر کے سبب پہچانے جاتے ہیں- آپ ضلع کشی نگر (یوپی) کی ایک پسماندہ وغیر معروف بستی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد ہندوستان کی مایۂ ناز درس گاہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور حاضر ہوئے اور وہیں سے ۸۰ء میں معقولات ومنقولات سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد دو سالوں تک شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی سے فقہ وافتا میں خصوصی استفادہ کرتے رہے- ۸۲ء میں الجامعۃ الاشرفیہ کے منصب تدریس وافتا پر فائز ہوئے اور تادم تحریر تربیت افتا، فتویٰ نویسی اور درس نظامیہ کی منتہی کتابوں کی تدریس میں مصروف ہیں- آپ ''مجلس شرعی'' مبارک پور کے ناظم بھی ہیں اور الجامعۃ الاشرفیہ کے شعبۂ افتا کے صدر بھی- آپ نے دہلی، ممبئی، حیدرآباد اور علی گڑھ کے دسیوں دینی، علمی اور سماجی سمیناروں میں شرکت فرمائی اور اپنی گراں قدر علمی مباحث سے غالب ونمایاں رہے- آپ کی نوک قلم سے درجنوں علمی وتحقیقی کتابیں معرض وجود میں آچکی ہیں، جن میں عصمت انبیا، مشینی ذبیحہ مذاہب اربعہ کی روشنی میں جدید بینک کاری اور اسلام، شیئر بازار کے مسائل اور لاؤڈ اسپیکر کا شرعی حکم، نے بطور خاص ارباب علم و دانش سے سند قبول اور داد وتحسین حاصل کی ہیں- ذاتی حیثیت میں مفتی صاحب خلیق وملن سار، متواضع اور متحمل و بردبار ہیں- ان کی سادگی، شرافت اور شیریں گفتاری ہر شخص کو پہلی ہی نظر میں اپنا اسیر بنا لیتی ہے-

سوال:- عصر حاضر میں جب کہ ہر صبح نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، فقہ وافتاء کی اہمیت وضرورت کس قدر بڑھ گئی ہے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی:- فقہ وافتاء کی ضرورت ہر دور میں تھی اور آج بھی ہے لیکن آج کے دور میں اس کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اس شعبہ میں قحط الرجال پڑا ہوا ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ طرح طرح کے دینی، مذہبی، سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور عصری مسائل نہ تھمنے والے طوفان کی طرح سب کو اپنے گھیرے میں لیتے جارہے ہیں- جن شخصیات سے ان مسائل کے شرعی حکم یا حل کے اظہار کی توقع ہو سکتی تھی وہ ایک تو گوناں گوں مصروفیات کے ہجوم میں گھری ہوئی ہیں، دوسرے سہولیات اور وسائل کی بڑی حد تک کمی بھی ہے، کچھ اور بھی اسباب ہیں جن کے باعث تمام نو پیدا مسائل پر گہری نظر، ان کے حقائق، مضمرات اور منافع ومضار کا وسیع مطالعہ، پھر کتاب وسنت کی روشنی میں ان کے شرعی احکام کی تحقیق وتنقیح، وغیرہ میں دشواری پیش آ رہی ہے، ان تمام مشکلات کا جائزہ لینے کے بعد گیارہ سال پیشتر جامعہ اشرفیہ مبارکپور میں ''مجلس شرعی'' کا قیام عمل میں آیا تھا جس کے زیر انتظام عظیم الشان پیمانے پر فقہی سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں اور نو پیدا مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ فقہا کی ٹیم بھی تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ممکن حد تک ضرورت کی تکمیل ہو سکے، الحمد للہ! یہ کوشش بار آور ہو رہی ہے-

اس امت کو ''خیر امت'' کا اعزاز اس لیے بخشا گیا کہ یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی ہے، ارشاد باری ہے ''**کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر**'' جو امتیں لوگوں میں ظاہر ہوئیں ان میں تم سب سے بہتر امت ہو، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو- (سورہ آل عمران: ۳، آیت: ۱۱) یہ فریضہ زیادہ تر فقہ وافتاء کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لیے بھی اس کی ضرورت و اہمیت زیادہ ہے-

سوال:- آج کل مدارس میں جو فقہ کی تعلیم ہو رہی ہے، آپ کی نظر میں وہ کہاں

تک اطمینان بخش ہے؟ اور آپ کی رائے میں فقہ کی تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی: -سوال کے پہلے جز کے متعلق فقیہ فقید المثال اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں: ''آج کل درسی کتابیں پڑھنے پڑھانے سے آدمی فقہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوتا''۔ (فتاویٰ رضویہ، ص:۵۶۵، ج:۴)

اور دوسرے جز کے تعلق سے حضرت صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

''جو کچھ اس زمانے میں مدارس میں تعلیم ہے وہ ظاہر ہے، اول تو درس نظامی جو ہندوستان کے مدارس میں عموماً جاری ہے اس کی تکمیل کرنے والے بھی بہت قلیل افراد ہوتے ہیں، عموماً کچھ معمولی طور پر پڑھ کر سند حاصل کر لیتے ہیں اور اگر پورا درس پڑھا تو اس پڑھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اب اتنی استعداد ہوگئی کہ کتابیں دیکھ کر، محنت کر کے علم حاصل کر سکتا ہے ورنہ درس نظامی میں دینیات کی جتنی تعلیم ہے ظاہر ہے کہ اس کے ذریعہ سے کتنے مسائل پر عبور ہو سکتا ہے۔ ان نوآموز مولویوں کو ہم خیر خواہانہ نصیحت کرتے ہیں کہ تکمیل درس نظامی کے بعد فقہ و اصول و کلام و حدیث و تفسیر کا بکثرت مطالعہ کریں اور دین کے مسائل میں جسارت نہ کریں، جو کچھ دین کی باتیں ان پر منکشف ہو جائیں ان کو بیان کریں اور جہاں اشکال پیدا ہو اس میں کامل غور وفکر کریں کہ علم کی بات پوچھنے میں کبھی عار نہ کرنا چاہیے'' (بہار شریعت، ص:۱۴۰، حصہ ۱۵، حج کا بیان)

سوال: - پھر فقہ کی کما حقہ تعلیم جس سے طلبہ کے اندر غیر معمولی ذوق تحقیق اور جدید مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، کیا صورت ہے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی: - اس کے لیے ''تخصص فی الفقہ'' کا کورس مکمل کرنا ضروری ہے۔ تخصیص کی وجہ سے خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں، دل و دماغ کے دریچے کھل جاتے ہیں اور محقق یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اندھیرے سے روشنی کے اجالے میں آ گیا ہے اس کی افادیت و اہمیت وضرورت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سراج الامہ کاشف الغمہ امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائج علوم وفنون کی تکمیل کے بعد

اختصاص کے لیے فقہ کا ہی انتخاب فرمایا، آپ ہی کی تقلید میں میں نے جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے درجۂ اختصاص فی الفقہ میں داخلہ لیا اور آج اس کے پاس تھوڑی بہت جو کچھ بھی برائے نام فقہ کی پونجی ہے وہ اسی درجے کی برکت ہے۔

سچ یہ ہے کہ صرف عمومی نصابی تعلیم کا فارغ التحصیل کسی شعبے میں کوئی بڑا قابل قدر کارنامہ نہیں انجام دے سکتا جبکہ اس شعبے کا محقق محنت اور لگن کے ساتھ کام کرے تو زمانہ کو حیرت زدہ کر سکتا ہے، ہم غیروں میں اس کی مثال پیش کر سکتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ ہم میں سے کچھ لائق افراد آگے بڑھیں اور خود اس کی مثال بن کر افق عالم پر نمودار ہو جائیں۔

فقہی مہارت پیدا کرنے کا دوسرا ذریعہ فقہی مذاکرات کی بحثوں میں حصہ لینا ہے اس کے ذریعہ ایک اچھی ٹریننگ ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی جدید مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی قدرت بھی مل جاتی ہے۔

سوال: - یہاں مدعیان اسلام کی ایک ایسی جماعت بھی ہے جو ''فقہ'' کو قرآن و حدیث سے زائد اور اس کی تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتی ہے۔ یہ اعتراض کہاں تک درست ہے اور اس کا صحیح جواب کیا ہے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی: - ان حضرات کی بات پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

ساغر کو گھٹا، محل کو پیمانہ سمجھتے ہیں

یہ لوگ حقیقت کو افسانہ سمجھتے ہیں

قرآن حکیم میں ہے: **وما کان المؤ منون لینفروا کآفۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طآئفۃ لیتفقھوا فی الدین و لینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون** ○ اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تا کہ ''فقہ دین'' حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں۔ (عذاب الٰہی سے احکام دین کا اتباع کر کے)

(سورۂ توبہ:۹، آیت:۱۲۲)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا" من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین " اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا فقیہ بناتا ہے۔(بخاری ومسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا" **فقیہٌ واحدٌ اشد علی الشیطان من الف عابدٍ**" ایک فقیہ، شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت ہے(جامع ترمذی)

وجہ ظاہر ہے کہ ایک شیطان ہزار عابدوں کو بہکا سکتا ہے لیکن ہزار شیطان مل کر بھی ایک فقیہ کو نہیں بہکا سکتے۔

آیۂ کریمہ اور احادیث نبویہ سے روز روشن کی طرح ''فقہ دین'' کی ضرورت واہمیت کا اندازہ ہر انصاف پسند مسلمان کرسکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ اس اعتراض کی حیثیت کیا ہے اور اس کا سبب کیا ہے، مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن حکیم کی جملہ آیات اور احادیث نبویہ پر ایمان رکھنا فرض ہے۔

فقہ کے دلائل چار ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس۔ اجماع اور قیاس کی حجت کا ثبوت بھی کتاب وسنت سے ہے جس کو علما نے روز روشن کی طرح عیاں کردیا ہے۔

سوال:۔حدیث میں اختلاف رائے کو رحمت کہا گیا ہے۔مگر ہمارے یہاں اسے تنقیص اور زحمت تصور کیا جاتا ہے، آخر کیوں؟ آخر اس تصور میں تبدیلی کس طرح ممکن ہے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی:۔انہیں نرمی کے ساتھ سمجھایا جائے کہ دلائل اور نیک نیتی کی بنیاد پر فروعی مسائل میں اختلاف جائز ہے، بلکہ حدیث پاک میں اسے امت کے لیے رحمت بتایا گیا ہے، ہاں! جو مسئلہ ضروریات دین سے ہو یا اجماعی ہو، یا کتاب وسنت میں اس کی صراحت ہو، یا کم از کم ائمہ اربعہ کے نزدیک متفق علیہ ہو اس میں اختلاف جائز نہیں کہ دراصل یہی اختلاف زحمت ہے، عوام یہ سمجھتے ہیں کہ مطلقاً ہر اختلاف مذموم ہے اس لیے ان کی تفہیم ضروری ہے۔

سوال:۔کچھ عرصہ قبل آپ نے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جائز ہونے پر اپنی تحقیق پیش

فرمائی تھی، جو کتابی شکل میں ''لاؤڈ اسپیکر کا شرعی حکم'' کے نام سے شائع ہوئی، اس پر علما اور عوام کی جانب سے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی:۔الحمد للہ! برصغیر اور یورپ وامریکہ میں اس کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے، ہر چہار سمت سے اس کی ستائش اور پذیرائی ہوئی، کتنے علما اسی موقف کے حامی ہو گئے اور کچھ علمائے کرام نے اختلاف رائے بھی کیا۔

سوال:۔انہوں نے غیر علمی انداز میں جس طرح آپ کی تحقیق پر دشنام طرازی کی اور طوفان کھڑا کیا، اس سے آپ کو نہیں لگتا کہ اجتہاد اور تحقیق کا دروازہ دانستہ طور پر ہمارے یہاں بند کیا جارہا ہے؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی:۔میں نے اجتہاد کا دروازہ کھولا ہی نہیں کہ کسی کو اسے بند کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں شروع سے ہی فقہائے اہل سنت کے درمیان دلائل کی بنا پر اختلاف رہا ہے، جواز کے قائلین میں مبلغ اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ سیدی اعلیٰ حضرت اور دوسرے کئی اجلہ علما سر فہرست ہیں، ہم نے اس باب میں انہی کا دامن تھام لیا اور ایسے فقہی، فروعی، نو پید ااختلافی مسئلے میں اس کی شرعاً اجازت ہے کہ کسی ایک طبقہ علماء کا موقف اختیار کیا جائے، اس سے عیاں ہے کہ ہم نے نہ اختلاف کیا ہے اور نہ یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے کثیر مسائل میں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کے تلامذہ نے اختلاف کیا اور آج انہی تلامذہ کے بہت سے اقوال پر بے شمار علما کا عمل وفتویٰ ہے اور ان کی طرف امام اعظم سے اختلاف کا کسی کو شبہہ اور وہم تک نہیں ہوتا۔

سوال:۔بریلی کی ''شرعی کونسل'' نے اپنے حالیہ سیمینار میں کچھ نرمی برتی ہے اور جم غفیر ہونے کی صورت میں مکبر کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کو جائز قرار دیا ہے، اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اب بھی آپ مطلقاً لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے قائل ہیں یا مکبر کے ساتھ؟

مفتی محمد نظام الدین رضوی:۔شاید آپ نے میری کتاب ۱۹۸۹ء کے بعد نہیں پڑھی اس میں یہ نرمی بھی ہے اور مکبر رکھنے کی ہدایت بھی۔□□□ (شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء)

مولانا وارث جمال قادری

صدر: آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی

ملک کی صنعتی راجدھانی عروس البلاد ممبئی پوری دنیا میں اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے جانا جاتا ہے- اس کی ایک بڑی خصوصیت مذہبی مزاج اور روحانی روایات واقدار کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہے-جب اسلاف بیزاری پورے ملک کو گھن کی طرح کھا رہی تھی ، اہل سنت و جماعت کے قدیم مسلک کو اسی سرزمین نے مادی توانائی فراہم کی- بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن اکابر علما نے اس سرزمین کا رخ کیا اور اس کی زرخیزیوں سے مذہب ومسلک کی کشت ویراں کی آبیاری کی، ان میں مولانا وارث جمال قادری (پیدائش غالباً ۱۹۵۰ء) کا نام بھی بہت نمایاں ہے- الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے معقولات ومنقولات سے فراغت کے بعد ممبئی پہنچے، ۱۹۷۸ء سے آل انڈیا تبلیغ سیرت سے وابستہ ہوئے اور نہایت سرگرم عمل رہے- آج ممبئی کی سرزمین پر جو لوگ فصلیں کاٹ رہے ہیں، شاید ان میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان کو اگانے میں حضرت سید العلما مولانا آل مصطفیٰ مارہروی کی 'سنی جمعیۃ العلما' اور مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن اڑیسوی کی 'آل انڈیا تبلیغ سیرت' کا نمایاں کردار رہا ہے-مولانا وارث جمال قادری آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بینر تلے مختلف سیاسی ، سماجی ، مذہبی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہنے کے علاوہ اپنی تصنیفات 'بھیگی پلکوں کا بوجھ'، 'کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟'، 'امام شعر وادب'، 'اسلام اور شادی'، 'جہان حیرت'، 'انوار کنز الایمان' وغیرہ سے بھی جانے جاتے ہیں- آج ممبئی میں مذہبی سرگرمیوں کی جگہ شخصی رقابتیں پروان چڑھ رہی ہیں، ایسے میں آج ضرورت ہے تفکر وتدبر کی، جہد وعمل کی اور پیش رفت کی-لیکن یہاں تو ہر کوئی شاکی ہے-

سوال:-آل انڈیا تبلیغ سیرت سے آپ کب وابستہ ہوئے اور کس طرح اس کے منصب صدارت تک پہنچے؟

مولانا وارث جمال قادری:-آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی میں ۱۹۷۸ میں قائم ہوئی- اس سے پہلے یہ تنظیم ملک کے دوسرے حصوں میں تو تھی مگر ممبئی میں نہیں تھی- اس سے پہلے یہاں سنی جمعیۃ العلما تھی مگر حضور سید العلما سید آل مصطفیٰ مارہروی کے وصال کے بعد یہ زوال پذیر ہوگئی تھی اور جس طرح دوسری تنظیموں کا حشر ہوتا ہے یہ بھی سمٹ کر رہ گئی، اس کی وجہ سے علما اور ذمہ داروں نے حضرت مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن اڑیسوی علیہ الرحمہ پر دباؤ ڈالا اور اصرار کیا کہ ممبئی کے اندر بھی آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام عمل میں لایا جائے- چنانچہ حضرت مجاہد ملت ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے تیار ہوگئے اور ۱۹۷۸ء میں اس کا پہلا اجلاس ممبئی میں ہوا جس میں خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی بھی شریک ہوئے اور اس کی غرض وغایت کے حوالے سے خطاب فرمایا- میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا اور اسی وقت سے میں آل انڈیا تبلیغ سیرت سے نہ صرف وابستہ رہا بلکہ اس میں سرگرم عمل بھی رہا- اس وقت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بینر تلے بہت سے مذہبی وسماجی کام ہوئے، پھر جب حضرت مجاہد ملت کا وصال ہوگیا تو یہ تنظیم سرد مہری کا شکار ہوگئی اور ایک عرصہ تک سناٹا چھایا رہا- پھر بابا کی تحریک پر اس کا احیا کیا گیا-تبلیغ سیرت کو بابا ہی فائنانس کرتے تھے- اس سے بڑے بڑے لوگ وابستہ ہوئے اور ہر طبقہ کے لوگ اس سے جڑ کر کام کرنے لگے- احیا کے بعد حضرت مولانا سید محمد ہاشمی میاں کو جنرل سکریٹری اور مولانا عاشق الرحمٰن الہ آبادی کو صدر بنایا گیا- مجھے نائب صدر یا جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ دیا گیا، اس کے بعد تبلیغ سیرت میں نئی جان پڑ گئی- اسی زمانہ میں میرٹھ، ملیانہ، سیتامڑھی اور ملک کے دوسرے حصوں میں فسادات برپا ہوئے ، ان فسادات میں تبلیغ سیرت نے ریلیف کا کام بڑے پیمانے پر کیا- بھاگل پور فساد میں اس زمانے میں ۹ لاکھ روپے کا سامان اور پیسہ متاثرہ افراد تک پہنچایا گیا- اس وقت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ بھاگل پور

میں کیمپ لگائے ہوئے تھے-تبلیغ سیرت کی ساری گاڑیاں انہیں کے کیمپ کے پاس خالی کی
گئیں اور انہی کے ہاتھوں تمام سامانوں کی تقسیم کا عمل ہوا- میرٹھ اور ملیانہ کے فسادات میں
تو تبلیغ سیرت کی طرف سے مولانا سید سراج اظہر صاحب اور احسان اللہ پہلوان کے ساتھ
میں خود بھی گیا تھا- خلاصہ یہ کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے سماجی اور رفاہی کام بڑے
پیمانے پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ذریعے ہوا- پھر اس کے بعد میرٹھ، ملیانہ اور ملک کے
دوسرے حصوں میں مسلمانوں کے قتل عام کا سیاسی جواب دینے کے لیے آل انڈیا تبلیغ
سیرت نے کانگریس کو منھ توڑ جواب دیا- حضرت علامہ سید حامد اشرف اشرفی جیلانی رحمۃ
اللہ علیہ کی قیادت میں کانگریس کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی- اس کا اثر یہ ہوا کہ
۱۹۷۷ء میں دہلی سے کانگریس بے دخل ہوگئی اور جنتا دل اقتدار میں آگئی- چونکہ جنتا دل کو
تقویت پہنچانے میں ہمارا عملاً حصہ تھا، اس لیے اس کا اثر یہ ہوا کہ اس وقت دہلی میں علمائے
اہل سنت کا اثر ورسوخ اور عمل دخل بڑھ گیا تھا- اس کے گواہ مولانا یٰسین اختر مصباحی اور
دوسرے لوگ ہیں جو اس وقت دہلی میں موجود تھے-

۱۹۹۰ء میں جب پوری دنیا عراق کے خلاف متحد ہوگئی تھی اس وقت آل انڈیا تبلیغ
سیرت نے اعلانیہ عراق کی حمایت کی، اس پر بہت سے اخبارات نے واویلا بھی مچایا- اس
وقت عراق کی حمایت میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے جو کچھ کیا اس کی روداد بہت طویل ہے- نہ
اس کے لیے وقت ہے اور نہ گنجائش، ہم نے اسے الگ سے کہیں لکھا ہے- اس وقت جو اور
بہت سے کام ہوئے ان میں ایک بڑا کام یہ بھی ہوا کہ کئی بار ہمارا عراق کا دورہ ہوا، دو بار میں
خود بھی شریک رہا اور وہاں پر پہلی بار عالمی سطح پر اہل سنت و جماعت کا تعارف امام احمد رضا
قادری بریلوی کے حوالہ سے کرایا گیا- وہاں بین الاقوامی کانفرنس میں ۷۰ رممالک کے
نمائندے شریک تھے- علما، ماہرین تعلیم، وزراے اوقاف، سفرا کے سامنے مقالہ پڑھا گیا اور
اس طرح پہلی بار اعلیٰ حضرت اور ان کے افکار کا تعارف عالم عرب اور عالم اسلام میں شاندار
طریقے پر کرایا گیا- فتاویٰ رضویہ کی جلد اول جو زیادہ تر عربی مشمولات پر مشتمل ہے اور
الدولۃ المکیہ کا عربی نسخہ ہم لوگ ساتھ لے گئے تھے، ہم نے مندوبین میں انہیں تقسیم کیا-

حالات چوں کہ ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، جہد وعمل میں سردی وگرمی آتی رہتی ہے-
چنانچہ پھر ایک وقت آیا جب آل انڈیا تبلیغ سیرت کی سرگرمیوں میں جمود آگیا- اس چیز کو
حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کیا اور انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں ممبئی
کے راستے سے کیرالا جارہا ہوں، ایک رات ممبئی ٹھہروں گا، تم مجھے ممبئی سینٹرل سے لے لو،
مجھے تنہائی میں چند گھنٹے تمہارے ساتھ گفتگو کرنی ہے-سوئے اتفاق کہ حضرت کا خط مجھے نہیں
موصول ہوسکا اور میں حضرت کو لینے نہیں جاسکا- جب حضرت ممبئی آگئے تو انہوں نے مولانا
معین الحق علیمی سے مجھے فون کرایا اور کہلایا کہ حضرت علامہ آپ کو یاد کررہے ہیں- میں نے
حضرت سے فون پر بات کی تو حضرت نے ناراضگی کا اظہار کیا- میں نے معذرت کی اور بتایا
کہ حضرت کا خط مجھے موصول نہیں ہوسکا تھا- حضرت نے کہا کہ تم فوراً میرے پاس آؤ، مجھے
بہت ضروری بات کرنی ہے- یہ ۱۹۹۳ء کے ممبئی فسادات کے بعد کا زمانہ تھا- میں نے کہا کہ
اتنی رات میں آنا میرے لیے اچھا نہیں ہے-شہر کے حالات بہتر نہیں ہیں-حضرت میں صبح
سات بجے آپ کی خدمت میں حاضر آجاؤں گا اور آپ کے ساتھ ہی ایئرپورٹ چلوں گا،
اس طرح پانچ چھ گھنٹے کا وقت مل جائے گا-

الغرض میں صبح کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا- حضرت نے فرمایا کہ دیکھو اپنی
جتنی تنظیمیں تھیں ان میں سے اکثر درگور ہوچکیں، بعض بستر مرگ پر ہیں تو بعض زندگی کی
آخری سانسیں لے رہی ہیں-آل انڈیا تبلیغ سیرت بھی سرد پڑی ہوئی ہے- اس وقت
جماعت کے اندر تنظیمی، سیاسی اور سماجی سطح پر مکمل جمود ہے- غیروں کے پاس متعدد تنظیمیں
ہیں اور بااثر ہیں-مگر اپنی جماعت کے پاس کچھ بھی نہیں ہے- میں چاہتا ہوں کہ جماعتی سر
بلندی کے لیے ایک بار اپنی تمام توانائیوں کو نچوڑ کر رکھ دوں اور جماعت کے لیے کچھ کر
ڈالوں، اس کے لیے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا-تم آل انڈیا تبلیغ سیرت کی نشاۃ ثانیہ کے
لیے ایک ہنگامی میٹنگ بلاؤ اور تم لوگوں کے سامنے میری بات رکھو اور اس کی ضرورت کا
انہیں احساس دلاؤ، تاکہ سیاسی سطح پر جماعت کے وجود کو ثابت کیا جاسکے-

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بتانا چاہوں گا کہ ہمارے یہاں تمام تر سیاسی سر

گرمیوں کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے-ایسے میں حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی بصیرت کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے کہ انہوں نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے دستور میں ایک کالم یہ بھی رکھا کہ اس تنظیم کو سیاست حاضرہ سے تعلق رہے گا-یہ عملی سیاست میں حصہ تو نہ لے گی لیکن باہر سے عام مسلمانوں کے اور جماعت اہل سنت کے مفاد میں سیاسی سطح پر جو کچھ کر سکتی ہے، کرے گی-

خیر! علامہ کے مشورے پر میں نے بڑی ہنگامی میٹنگ کی اور علامہ کے احساس کو شرکا کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی-اس کا اثر یہ ہوا کہ اکثریتی نہیں کلی طور پر حضرت علامہ کی باتوں کی تائید کی گئی-اس میٹنگ میں براؤں شریف کے مولانا حنیف قادری رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے-انہوں نے کہا کہ حضرت علامہ ارشد القادری شہرت وعظمت کی جس بلندی پر ہیں انہیں اب کسی مزید شہرت کی ضرورت نہیں ہے-یہ علامہ کا سراپا اخلاص ہے-ان کے وجود میں تو خود ہی کئی جماعتیں گم ہیں-شہرت کے لیے انہیں آپ کی تنظیم کی ضرورت نہیں ہے-انہیں سیاسی اور سماجی سطح پر جماعت کی کس مپرسی دیکھی نہیں جارہی ہے-اس لیے وہ بے چین ہیں، ہمیں کھل کر ان کا تعاون کرنا چاہیے اور ان کی آواز میں آواز ملانا چاہیے-

میٹنگ کے بعد میں نے حضرت علامہ کو تمام باتوں سے مطلع کیا اور بتایا کہ تمام لوگوں نے کلی طور پر آپ کی موافقت کی-آپ تشریف لائیے اور کام آگے بڑھائیے-اس پر علامہ نے کہا کہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے صدر مولانا عاشق الرحمٰن ہیں، اس لیے پہلے انہیں مطلع کیجیے اور ان کی تائید حاصل کرنے کے بعد مجھے بتائیے-میں نے مولانا عاشق الرحمٰن صاحب کو رجسٹری کی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا-ادھر تاخیر کی وجہ سے علامہ صاحب کا دوبارہ خط بھی آگیا کہ آپ نے مجھے کوئی خبر نہیں دی-اب میں نے اس زمانے میں جب کہ فون کافی مہنگا تھا، مولانا عاشق الرحمٰن الہ آبادی صاحب کو فون کیا اور میں نے اپنے خط کے بارے میں پوچھا-انہوں نے کہا کہ ہاں! وہ آپ کا خط مل گیا تھا اور ساتھ ہی علامہ صاحب پر برس پڑے-ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بہت دنوں سے بھرے بیٹھے ہوں، موقع ملتے ہی وہ بالکل پھٹ پڑے-میں نے کہا کہ آپ نے حضرت علامہ کے خلاف جتنے

چارج لگائے ہیں ان میں میری طرف سے دس چارج کا مزید اضافہ کر لیں لیکن اس کے ساتھ آپ بتائیں کہ اہل سنت و جماعت کے حوالے سے اس بندے کی جو عالمی خدمات ہیں، کیا آپ ان کو فراموش کر سکتے ہیں-یہ شخص آج عالمی سطح پر سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی شناخت بنا ہوا ہے اور صرف اپنی خدمات پر بنا ہوا ہے-کیا آپ اس سے انکار کریں گے؟ اور کیا جس کام کے لیے وہ ہمیں آمادہ کر رہا ہے اس کی ضرورت سے آپ انکار کریں گے؟ آپ تقویٰ اور طہارت کی بات کر رہے ہیں-جماعتیں صرف تقویٰ اور طہارت سے نہیں چلا کرتیں-آپ اسے لے کر بیٹھے رہیے-مولانا اس پر بہت گرم ہو گئے اور زور زور سے مجھے ڈانٹنے لگے-میں نے کہا مولانا! میں کوئی آپ کا مرید یا شاگرد نہیں کہ آپ مجھ سے اس طرح باتیں کر رہے ہیں-آپ جس جماعت کے صدر ہیں میں اس کا جنرل سکریٹری ہوں-آپ علامہ غلام جیلانی میرٹھی کے شاگرد ہیں ان کا شاگرد میں بھی ہوں-پھر کیوں آپ مجھے اس انداز سے مخاطب کر رہے ہیں؟ آپ خیال رکھیں کہ میں آپ کا مرید یا شاگرد نہیں ہوں-

اس پر مولانا نے فون رکھ دیا-اب وہ دن تھا اور آج کا دن ہے-مولانا نے پھر پلٹ کر نہیں دیکھا-مولانا سراج اظہر صاحب نے انہیں کرایہ بھیجا کہ آپ ممبئی تشریف لائیں، معاملے کا تصفیہ کر لیا جائے-مولانا نے کرایہ واپس کر دیا اور اور نہیں آئے-کچھ دنوں بعد یہاں کے ایک صاحب ثروت کی دعوت پر ممبئی آئے اور دو تین آدمی کو لے کر، ذمہ داران جماعت سید مثنیٰ میاں صاحب وغیرہ کسی کو بھی کوئی اطلاع دیے بغیر خود سے ہی جماعت کو منسوخ قرار دے دیا اور اپنی طرف سے ایک ایسے شخص کو جماعت کو سپرد کر دیا، جو جماعتی مفاد کے سخت خلاف تھا اور موصوف اخبارات میں خبر چھپوا کر واپس ہو گئے-اس کی وجہ سے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں-مجھے پھر اخبار کو یہ بیان دینا پڑا کہ مولانا نے اپنی طرف سے جو انتخاب کیا ہے، یہ غیر جمہوری اور خلاف دستور ہے-انہوں نے نہ ذمہ داران کو اطلاع دی اور نہ وہ طریقۂ کار اپنایا جو انتخاب کا ہوتا ہے-پھر بڑی خاموشی سے میں نے جماعت کا رجسٹریشن کرایا، میں صدر ہوا اور پھر تنظیم کا کام آگے بڑھا-حج کانفرنس اور تحفظ بغداد کانفرنس کا شاندار انعقاد آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بینر تلے ہوا لیکن بہر حال اس کے ساتھ یہ بھی سچائی

ہے کہ جماعت زوال پذیر ہوگئی- اب اس کے وہ مخلص افراد بھی نہیں رہے اور پھر آہستہ آہستہ کافی کمزور ہوتی چلی گئی- خاص طور سے ادھر دو تین سالوں میں کوئی کام نہیں ہوا-

سوال :-آپ کی صدارت میں آنے کے بعد اس کے ذریعے کام بھی ہوئے، پھر گزشتہ چند سالوں میں اس کے اندر اتنی سرد مہری کیوں آگئی؟

مولانا وارث جمال قادری: - اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب ممبئی میں کوئی با اثر شخصیت ایسی نہیں رہی جو اختلافات کو سلجھا سکے اور حکم کا کردار ادا کر سکے- اب جو لوگ ہیں سب ایسے ہی ہیں جو ہر مسئلے میں فریق ہوتے ہیں، تو با اثر افراد کا ہمارے بیچ سے اٹھ جانا نہ صرف آل انڈیا تبلیغ سیرت بلکہ پوری جماعت کے جمود اور انتشار کا سب سے بنیادی سبب ہے-آل انڈیا تبلیغ سیرت کے جمود میں کچھ اور دوسرے اسباب بھی ہیں مثلاً جو لوگ اس کے خاص معاونین تھے ان میں سے کچھ کا انتقال ہوگیا، حاجی رشید طیب صاحب ترکی ہجرت کر گئے- کچھ اور لوگ بھی ممبئی چھوڑ کر کہیں چلے گئے- کچھ لوگ یوں ہی سرد پڑ گئے تو اسباب وذرائع ہی ختم ہوتے چلے گئے-

سوال :-ممبئی میں تو اہل ثروت کی بڑی تعداد آج بھی موجود ہے- ایسے میں اسباب وذرائع کے فقدان کی شکایت کرنا عجیب بات ہے؟

مولانا وارث جمال قادری: - جہاں تک ممبئی کی موجودہ صورت حال کی بات ہے تو آج ممبئی میں مختلف پیروں اور باباؤں کا اپنا الگ الگ حلقہ اور دائرہ اثر ہے- سب نے مریدین کا ذہن ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا ہے- سب نے اپنے مریدین کو یہ سمجھا دیا ہے کہ میرے بنائے ہوئے دائرے میں رہو گے جبھی جنت میں جاؤ گے، اگر ذرا سا قدم ادھر ادھر بڑھایا کہ جہنم میں پہنچے- اب تمام ارباب ثروت صرف اپنے پیروں کے اشاروں پر چلتے ہیں- (الا ماشاءاللہ) ایک زمانہ تھا کہ ہم اپنے قلم کو چلاتے تھے اور مختلف لوگوں کے اوپر لکھا کرتے تھے- اس وقت ہم بھی لائق اعتنا سمجھے جاتے تھے- اب حال یہ ہوگیا ہے کہ سب کو غوث اور قطب کہلوانا ہے- اب یہ سب ہم سے ہو نہیں پاتا- اس لیے ہم اب کسی کے لیے لائق اعتنا نہیں ہیں تو ایسے میں اب ہمیں کون تعاون کرے گا؟ اس کے علاوہ جو مسائل

ہیں وہ تو آپ سمجھتے ہی ہیں-

سوال :-اس وقت جماعتی کام کے لیے آپ بہتر طریقہ کس کو سمجھتے ہیں، انفرادی کوشش کو یا تنظیمی جدوجہد کو؟

مولانا وارث جمال قادری: -اگر آپ اجتماعیت کا انتظار کرتے رہیے گا تو پھر کوئی کام نہیں ہوگا، کیوں کہ ہمارے یہاں اجتماعیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے- اس لیے میری رائے یہ ہے کہ انفرادی سطح پر جو کچھ ممکن ہو وہ کیا جائے- ہاں! اس کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ اجتماعیت کا جب بھی موقع ملے تو اسے لبیک کہا جائے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج تو ہر شخص اپنے انفرادی تشخص، انفرادی شناخت اور انفرادی حیثیت کو قائم کرنے کی فکر میں ہے- اسی فکر میں ہر کوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کے لیے کوشاں ہے- جب بھی اجتماعیت کی بات آتی ہے تو وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا ذاتی تشخص نہ ختم ہو جائے- اس لیے انفرادی طور پر آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں- امین ملت حضرت سید محمد امین میاں برکاتی نے کبھی اجتماعیت کا انتظار نہیں کیا کہ سب لوگ آجائیں تو قدم بڑھاؤں بلکہ انفرادی حیثیت کے مدنظر وہ کام کر رہے ہیں اور وہ کامیاب ہیں- خود جام نور نے جماعت میں علمی وفکری اور صحافتی بیداری کے حوالے سے جو کچھ کیا یہ مولانا خوشتر نورانی کی انفرادی کوشش تھی- اگر وہ جماعت اور تنظیم کا انتظار کرتے تو وہ اتنا بڑا کام نہیں کر پاتے- یہی حال بدایوں شریف کا بھی ہے- مولانا اسید الحق قادری صاحب جامعہ ازہر سے واپس آئے تو وہاں سے بھی مختلف علمی کام ہو رہے ہیں- ہمیں مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں- خود رضا اکیڈمی ممبئی کو دیکھیے- ایک انفرادی سوچ تھی اور اس کے تحت انفرادی کام ہوا اور بہت بڑا کام ہوا- آج اشاعتی میدان میں ہم پیچھے نہیں رہ گئے-

ویسے جماعتی برکات کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا- حدیث پاک میں آیا ہے **ید اللہ علی الجماعۃ** -لیکن آج جو حالات ہیں ان کے پیش نظر اجتماعیت کا انتظار کرنا عقل مندی نہیں ہے- انفرادی کام کرنا ہی حالات کے عین مطابق ہے-لیکن انفرادی کام کے یہ معنی بھی نہیں کہ آپ تنہا کام کریں، انفرادی کام سے مراد ہے کہ جو آپ کے معتبر دست وبازو ہوں

ان کو ساتھ رکھیں اور ان کی مدد اور شرکت کے ساتھ کام کرتے چلے جائیں-

سوال:- جماعت اہل سنت میں اتفاق واتحاد کی سبیل آپ کی نظر میں کیا ہے؟

مولانا وارث جمال قادری:- جہاں تک اختلاف وانتشار کی بات ہے تو اس کے مضر اثرات جگ ظاہر ہیں- ویسے اختلاف وانتشار کی وجوہات بھی مختلف ہیں- کچھ اختلافات تو صرف اپنے قد کی پیمائش کے لیے ہیں جو یقینی طور پر قابل مذمت ہیں- کچھ اختلافات اخلاص کی بنیاد پر ہوتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ آج کے حالات میں اخلاص نام کی چڑیا ڈھونڈنے جائیے گا تو آپ یقینی طور پر نامراد رہیے گا- اب تو ہمارے یہاں اخلاص دیکھنے کو نہیں ملتا- تو جب سارے اختلافات ہی غیر مخلصانہ ہوں، اپنے قد کی پیمائش کے لیے ہوں تو ایسے میں اتفاق واتحاد کی سبیل کی تلاش واقعی بہت مشکل ہے- ایسے میں بس ایک تدبیر کارگر نظر آتی ہے- وہ یہ کہ جو لوگ جماعت کے ہر کاز کو لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھ کر ٹھکرا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کی بہت زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے- آپ ان کے پیچھے ہی مت پڑیے- آپ کو دینی، تبلیغی اور جماعتی حوالے سے جو کچھ کرنا ہے، خاموشی کے ساتھ کرتے رہیے، اختلافات کے گرداب سے خود کو نکالیے اور مثبت طریقے سے اپنا کام کرتے چلے جائیے-

یہاں ایک بات یہ بھی کہہ دوں گا کہ اب نوجوانوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے- ہم لوگ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہمارے قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں- ہم میں اب وہ پہلی سی بات نہیں ہے- اس کے برعکس جوانوں میں جوش وجذبہ ہے، صلاحیت ہے اور امنگیں ہیں- اس لیے خود انہیں آگے بڑھنا چاہیے اور جماعتی کاز کو مخلصانہ انداز میں کرنا چاہیے- اسی کے ساتھ جماعت کو تصلب کے نام پر پروان چڑھ رہے تشدد سے نجات دلانا ہوگا- جب تک نام نہاد تصلب کا خاتمہ نہیں ہوتا جماعت میں اتحاد واتفاق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا- اتحاد واتفاق کو قائم کرنے کا ایک موثر ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم حکمت وتدبیر سے ہر کام کریں- ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے یہاں حکمت بالغہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے- حکمت وموعظت کے ساتھ دعوت الی اللہ کا حکم جو ملا تھا اسے تو ہم نے عملاً منسوخ سمجھ لیا ہے- اور اس پر ظلم یہ کہ ہر حکمت وموعظت کا نام منافقت اور صلح کلیت رکھ دیا گیا ہے- اس رجحان کو بھی ختم کرنا

ہوگا اور تصلب، تشدد، منافقت اور مداہنت کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکمت ودانائی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھنا ہوگا-

سوال:- ماضی کی بہ نسبت آج جماعت میں تصنیف وتالیف کا رجحان زیادہ ہوا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی نظر میں وہ کون سے موضوعات ہیں جن پر ہمارے اہل قلم عام طور پر توجہ نہیں دے رہے ہیں؟

مولانا وارث جمال قادری:- یقینی طور پر آج جماعت میں تصنیف وتالیف کا رجحان بڑھا ہے- بہت سے جوان اہل قلم سامنے آئے ہیں، جو علم وفکر اور شعور کے مالک ہیں- مختلف موضوعات پر کتابیں بھی آرہی ہیں- مگر اس کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ موضوعات کے انتخاب میں جتنا تنوع ہونا چاہیے وہ نہیں ہے- خصوصاً سیرت اور تصوف وغیرہ پر جیسا کام ہونا چاہیے ہمارے یہاں نہیں ہو رہا ہے- حضرت علامہ پیر کرم شاہ ازہری نے ضیاء النبی لکھ کر سیرت پر زبردست کام ضرور کیا جو جماعت کی طرف سے فرض کفایہ ہے مگر ایک ہی کتاب لکھ دینے سے سیرت پر کام ختم نہیں ہو جاتا- ہماری مخالف جماعتیں ہر دن الگ الگ جہت سے سیرت پر کتابیں لکھ رہی ہیں، جب کہ ایسا رجحان ہمارے یہاں نہیں پایا جا رہا ہے- اس لیے ہمارے اہل قلم کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے-

سوال:- مذہبی صحافت کے ماضی وحال پر آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

مولانا وارث جمال قادری:- سچ تو یہ ہے کہ ماضی میں ہمارے یہاں مذہبی صحافت نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، کبھی اپنے شوق کی تسکین کے لیے تو کبھی اپنی عقیدت کی تسکین کے لیے کوئی پرچہ نکال لیا اور خود ہی پڑھ لیا- لوگ مجھے اچھا کہیں یا برا، سچائی یہی ہے کہ مذہبی صحافت کا پہلا نقش علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے جام نور نکال کر پیش کیا اور مولانا خوشتر نورانی نے اسی جام نور کا تجدید واحیا کر کے مذہبی صحافت کو بلندی پر پہنچایا- اس بات کا بھی برملا اعتراف ہے کہ جام نور نے صحافت کا پختہ رنگ دیا، جس سے پہلے سے نکل رہے بہت سے رسالوں نے خود کو رنگا، اپنے اندر اصلاح لانے کی کوشش کی- نیز جام نور کے اثرات سے دوسرے متعدد نئے رسالے بھی نکلنے لگے- یہ سب جام نور کے اثرات ہیں جن کا

اعتراف صاف دلی سے کیا جانا چاہیے- جام نور کی سب سے نمایاں اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ اس نے توسع اور وسعت نظری کا بھرپور مظاہرہ کیا اور کمال یہ کہ پورے تصلب اور پختہ نظری کے ساتھ کیا-

سوال:- کیا موجودہ حالات میں تبلیغ واشاعت کے لیے الکٹرانک میڈیا کے استعمال کو آپ ضروری سمجھتے ہیں اور کیا اس سلسلے میں آپ کے کچھ تحفظات بھی ہیں؟

مولانا وارث جمال قادری:- بالکل ضروری سمجھتے ہیں اور یہ تو مسلمات میں سے ہے کہ آپ کا دشمن جس معیار کا ہتھیار استعمال کر رہا ہو اسی انداز کا ہتھیار آپ کو بھی اختیار کرنا پڑے گا- اب لوگوں نے طویل داستان اور ناول پڑھنا چھوڑ دیا- کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں- اب تو لوگ اخبارات اور میگزین بھی بمشکل تمام پڑھتے ہیں ادھر الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے بڑھتے ہوئے اثرات کا عالم یہ ہے کہ وہ گھر گھر بلکہ ہر ہر کمرے میں داخل ہے- مخالفین اسلام اس کا استعمال بڑے پیمانے پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کر رہے ہیں، اس کے مسموم جراثیم سے نئی نسل کو بچانا حقیقت یہ ہے کہ ناممکن ہے- ایسے میں زہر کا تریاق بھی اگر اسی فارم میں دیا جائے تو بڑی حد تک اس کی کاٹ ہو سکتی ہے اور جہاں تک یک طرفہ مخالفت اور اس پر اصرار کی بات ہے تو یہ ایسے ہی ہے کہ دشمن بندوق لے کر سامنے آئے اور اس کے مقابلے کے لیے کوئی غلیل اٹھانے کا مشورہ دے- برقی ذرائع ابلاغ کی من کل الوجوہ مخالفت کرنے والوں کو گہرائی سے اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ ان کے پاس برقی ذرائع ابلاغ کی زہرافشانیوں کے جواب کے لیے معقول ہتھیار کیا ہے؟

اور جہاں تک برقی ذرائع ابلاغ میں میرے تحفظات کی بات ہے تو جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام سید محمد مدنی میاں اشرفی صاحب نے کہا ہے کہ جو چیز ٹیلی ویژن سے باہر دیکھنا غلط ہے وہ اندر دیکھنا بھی غلط ہے- اس لیے اسلامی پروگرام بناتے وقت ان چیزوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے-

سوال:- عروس البلاد ممبئی سنی مسلم صنعت کاروں کا شہر ہے اس کی آنے والی نسل بھی سنی مسلمان رہے، اس کے لیے علمائے دین کو کس طرح کی کوششیں کرنی ہوں گی؟

مولانا وارث جمال قادری:- یہ واقعی بہت اہم سوال ہے- اہل نظر جانتے ہیں کہ ممبئی کے حالات اب پہلے سے نہیں رہے- حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، ان بدلتے حالات میں ایک بڑا کام یہ تھا کہ لوگ مسائل پر سنجیدہ غور وفکر کرتے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے- اس وقت ممبئی میں سنی علما آپس میں ہی دست وگریباں ہیں- ادھر ذاکر نائک اور دوسرے افراد اور جماعتوں کے اثرات روز بروز بڑھ رہے ہیں، مگر ہمارے پاس وقت بھی نہیں ہے کہ ان حالات پر غور کریں- یہ اہل سنت وجماعت کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے، جس پر کشادہ دلی اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا اور علمی پیش رفت کرنا وقت کی ضرورت ہے-

ممبئی یقیناً اہل سنت سرمایہ داروں کا شہر ہے لیکن ممبئی کا موجودہ المیہ یہ ہے کہ یہاں کوئی بااثر شخصیت موجود نہیں ہے- سیاسی اور سماجی سطح پر حال یہ ہے کہ کوئی اس پارٹی کے پیچھے بھاگ رہا ہے تو کوئی اس پارٹی کے پیچھے دوڑ رہا ہے- کچھ لوگ استغفر اللہ کے دائرے سے باہر نکلنا نہیں چاہتے- وہ اپنے سامنے کے چند سروں کو عالم اسلام سمجھ بیٹھے ہیں- تو ایسے مسائل پر جب تک عالمی تناظر میں غور وفکر نہیں کیا جائے گا اور کوئی لائحہ نہیں بنایا جائے گا، جب تک کوئی صحیح حل سامنے نہیں آ سکتا- عالمی تناظر الگ ہے اور عامی تناظر الگ ہے- چند عوام آپ کی باتوں پر نعرہ لگا دیں اور چند لوگوں کو آپ توبہ کرا دیں تو اس سے آپ کی انا کی تسکین تو ہو جائے گی، لیکن اسلام کا کوئی کام نہیں ہوگا- اسلام کو چہار دیواریوں میں مقید مت کیجیے- اسلام اپنے اندر جتنی وسعت رکھتا ہے اسی وسعت نظر کے ساتھ اسلام کو سمجھیے اور دیکھیے-

سوال:-"بھیگی پلکوں کا بوجھ" آپ کی دینی قدروں کی حامل کہانیوں کا مقبول مرقع ہے، مذہبی ادب میں اس اسلوب کو اختیار کرنے کی وجہ کیا ہوئی اور آپ کی نظر میں یہ کوشش کتنی کامیاب رہی؟

مولانا وارث جمال قادری:- دراصل ہمارے نوجوانوں کو ناول اور افسانے پڑھنے میں زیادہ دلچسپی ہے- وہ کہانی کی زبان میں بات سمجھنا چاہتے ہیں- علامہ ارشد القادری نے جوانوں کے اسی مزاج کا خیال رکھتے ہوئے اپنے رسالہ میں "بزبان حکایت" کے عنوان

سے مستقل لکھنا شروع کیا اور وہ کالم بہت مقبول ہوا جس کا مجموعہ بعد میں ''لالہ زار'' اور ''زلف وزنجیر'' کے نام سے شائع ہوا- میں نے بھی علامہ کی پیروی میں اس اسلوب کو اختیار کیا اور مستقل کالم کے تحت استقامت میں لکھنا شروع کیا- اس کالم کی پذیرائی کا عالم یہ ہوا کہ بقول مدیر استقامت مولانا ظہیر الدین مرحوم کے اس کالم کی اشاعت سے قبل استقامت ۵/ہزار کی تعداد میں چھپتا تھا جب یہ کالم شروع ہوا تو ۶/۵ مہینے میں استقامت کا سرکولیشن ۱۵/ہزار ہوگیا- آج بھی ہر سال دو دو تین تین ایڈیشن اس کا آرہا ہے- تو اس اسلوب کے اختیار کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ جو بچے اپنا وقت بے مقصد ناولوں کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں وہ اس قیمتی وقت کو اسلامی کہانیاں پڑھنے میں صرف کریں اور زبان کی چاشنی کے ساتھ اعتقاد کی پختگی بھی حاصل کریں-

سوال :-جن لوگوں نے آپ کی وہ کتاب پڑھی ہے ان کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر آپ نے اس سلسلے کو بعد میں کیوں بند کر دیا؟ جب کہ اگر آج بھی اس طرح کی تحریریں آئیں تو لوگ پسند کریں گے-

مولانا وارث جمال قادری: -ہاں! وہ سلسلہ رک گیا- دراصل مختلف اوقات میں انسان کی طبیعت مختلف موضوعات اور کاموں کی طرف مائل ہوتی رہتی ہے- انسانی طبیعت میں تلون ہے، بعد میں میری دوسری کتابیں آئیں- امام شعر وادب آئی، پہلے حق اکیڈمی نے شائع کیا تھا، اب رضوی کتاب گھر سے چھپ رہی ہے- کراچی سے بھی چھپی- اس کا اثر یہ ہوا کہ کراچی کی یونیورسٹی میں حدائق بخشش کو شامل نصاب کیا گیا- یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو کا خط بھی اس حوالے سے جہان رضا لاہور میں شائع ہوا- اسلام اور شادی بھی میری مقبول کتاب ہے اور بھی میری کئی کتابیں اور مقالات ہیں- ۱۹۷۰ء کے دہے میں جب کہ مولانا یٰسین اختر مصباحی اور مولانا ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی اشرفیہ میں زیر تعلیم تھے، اس وقت میں تنہا تھا جو امام احمد رضا کے حوالے سے تحریری دنیا میں نمائندگی کر رہا تھا- جہان حیرت کے نام سے بھی میرا ایک مقالہ خاصا اہم ہے- انوار کنز الایمان بھی ۱۶۰ رصفحات پر مشتمل ہے- ایک زمانے میں چھپی اور پھر ناپید ہوگئی- اعلیٰ حضرت اور کنز الایمان پر میرا ایک مقالہ

استقامت میں چھپا تھا جس پر مولانا اسلم بستوی مرحوم نے مجھے مبارک باد دی اور انہی کی تحریک پر پھر میں نے اسے کتابی شکل دی- پھر بعد میں جب میدان میں مجھ سے اچھا لکھنے والے کئی ایک صاحب قلم آگئے تو اپنے اندر تکان کا احساس ہونے لگا اور تحریر وقلم کی طرف توجہ کم ہوگئی- چوں کہ یہ خوشی بھی تھی کہ چلو اب میدان تحریر مالا مال ہوگیا، اس سے پہلے جو احساس محرومی تھا وہ ختم ہوگیا اور یک گونہ طمانیت کا احساس آگیا- پھر ایک وجہ یہ بھی رہی کہ میں پہلے آزاد تھا، اب ہمارے اوپر اتنی ذمہ داریاں آگئیں کہ میرے پاس وقت بھی نہیں رہا-

سوال:-پچھلے کچھ سالوں سے مخالفین اہل سنت نے ہمیں 'بریلوی' سے متعارف کرا کے عالم عرب میں یہ تاثر دینا چاہا کہ ہم اہل سنت و جماعت، قادیانیت کی طرح کوئی جدید فرقہ ہیں، اس پر آپ نے ''کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟'' لکھ کر اس بے بنیاد الزام کا جواب دیا، لیکن آخر کیوں کچھ اپنے ہی لوگوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی؟

مولانا وارث جمال قادری:- یک مختصر گروپ ہے جو اس احساس سے نہ خود نکلنا چاہتا ہے اور نہ دوسروں کو نکلنے دینا چاہتا ہے، اس نے اعلیٰ حضرت کی شخصیت کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بنالیا ہے، ان کو یہ غلط احساس ہوگیا ہے کہ جب تک ہم خود کو 'بریلوی' کہتے رہیں گے جبھی تک ہمارا پیٹ بھرے گا- حالاں کہ یہ ان کی غلط نفسیات ہے- میں نے تو اپنی کتاب میں متعدد دلائل دیے ہیں اور بریلوی کہلانے کے نقصان کو اجاگر کیا ہے- میرے پاس مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مصطفیٰ رضا قادری کا ارشاد گرامی بھی محفوظ ہے، آپ نے ۱۹۶۰ء کے پاسبان کے کسی شمارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ''بریلوی' وہابی ملاعنہ کا دیا ہوا لفظ ہے جس کو سختی سے مسترد کیا جانا چاہیے- میرے پاس یہ قیمتی حوالہ موجود ہے اور ان شاء اللہ اپنی کتاب کی اگلی اشاعت میں اس کو شامل کروں گا- اس سلسلے میں ہماری ایک بات ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو کسی خطے میں محدود کرنے کی بجائے عالمی سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی کی فکر کرنی چاہیے-□□□

(شمارہ ستمبر ۲۰۰۹ء)

مولانا یٰسین اختر مصباحی

بانی ومہتمم: دارالقلم، دہلی

مولانا یٰسین اختر مصباحی ان چند مخلص علما میں سے ہیں جو داد و صلے سے بے نیاز علمی وفکری سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں- موصوف بھی تقریباً ۳۰/سالوں سے نہایت بے نیازی کے ساتھ اپنے فکر وقلم کے ذریعے ملت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں- ۱۹۷۰ء میں آپ کی فراغت الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور سے ہوئی، پھر ندوۃ العلما لکھنو سے دوسالہ کورس ''الاختصاص فی الادب العربی'' کی تکمیل کی، اس کے بعد الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں ہی ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۲ء تک تدریسی خدمات انجام دیں پھر سعودی عرب چلے گئے جہاں ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک ڈیفنس منسٹری میں ملازمت کی، مگر جب دل کو اطمینان نہیں ہوا تو ہندوستان واپس ہوئے اور دہلی کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، جس کے نتیجے میں دارالقلم کے نام سے تصنیف و تالیف کا ادارہ قائم کیا، ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۲ء تک اپنی ادارت میں ماہنامہ 'حجاز جدید' نکالا، مذکورہ رسالے کے بعد تقریباً ۷/سالوں تک ماہنامہ 'کنزالایمان' دہلی کی ادارت فرمائی، بے شمار مضامین ومقالات لکھے اور تقریباً دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف وتالیف کیں، جن میں 'تعارف اہل سنت' اور 'امام احمد رضا اور ردِّ بدعات و منکرات' کو خاص اہمیت حاصل ہے- خصوصاً ۱۸۵۷ء سے متعلق متنازع مسائل پر جس فاضلانہ انداز میں متعدد کتابیں تحریر وتدوین کی ہیں، وہ جماعت اہل سنت کی طرف سے فرض کفایہ کی ادائیگی کا درجہ رکھتا ہے- موصوف کی علمی وفکری اٹھان سے متاثر ہوکر علامہ سید محمد بن علوی مالکی مکۃ المکرّمہ نے انہیں سند حدیث کی تحریری اجازت عطا فرمائی اور بیرون ممالک بالخصوص پاکستان، لیبیا، ساؤتھ افریقہ اور برطانیہ کے مختلف عالمی کانفرنسوں اور سمیناروں میں بھی مدعو کیے گئے-

سوال:- مسلم معاشرے کو مذہبی صحافت سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ کیوں نہیں ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب کی طرف ہمارے قارئین کی اتنی توجہ نہیں ہے جتنی توجہ سیاسی صحافت کی جانب ہے- سیاست اس وقت کا سب سے زیادہ دلچسپ، گرم اور ہر لحاظ سے مفید موضوع ہے، اس لیے اس کی طرف بہت زیادہ توجہ ہوتی ہے اور مذہب میں چوں کہ پابندیاں ہیں، خود عمل کرنے اور کرانے کی ترغیب ہوتی ہے، اس لیے معاشرہ میں اس کا التزام کم کیا جاتا ہے، جس کا اثر صحافت پر بھی پڑا ہے- مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اس کی زیادہ دلچسپی کتابوں سے ہے اور کتابوں کے ذریعہ ہی وہ اپنا ذوق پورا کرتا ہے- مذہبی صحافت یعنی مذہبی اخبارات ورسائل کے مطالعے کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا شعور اتنا بالغ نہیں ہے اور ہمارے ذمہ داروں نے بھی کما حقہ اس کی طرف توجہ نہیں دلائی کہ مذہبی صحافت نہایت ضروری اور اہم چیز ہے- دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان مطلقاً صحافت ہی میں کمزور ہے- اگر اس کی سرپرستی کی جائے تو مذہبی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تجارتی ہر طرح کی معلومات ہوں گی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اردو زبان کا تحفظ اور بقا کا ایک انتظام بھی ہوگا- اس سلسلے میں ہم لوگوں کو اپنے طور پر ایک تحریک کی شکل میں کوشش کرنی چاہیے تاکہ عوام اردو اور مذہبی صحافت کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوں اور وقت کی جو ضرورت ہے اس کی تکمیل کریں، کیونکہ میڈیا اس زمانے میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے، انہیں متأثر کرنے، دوسرے لوگوں کو عام مسلمانوں کے تعلق سے غلط فہمیوں کے ازالے، دیگر شعبوں کی معلومات حاصل کرنے اور دوسروں تک اپنی معلومات پہنچانے کا نہایت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے- یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مجموعی طور پر اردو زبان کافی کمزور ہے اور اس کی نسبت سے مذہبی صحافت اور زیادہ کمزور ہے، کیوں کہ ہمارا انحصار جو کچھ ہے وہ ریڈرشپ (Reader ship) پر ہے اور ریڈرشپ کی کمزوری کا انجام مذہبی صحافت کو بھی بھگتنا پڑ رہا ہے- چوں کہ مذہبی صحافت میں شرعی نقطۂ نظر سے بہت ساری پابندیاں ہیں اور

اشتہارات وغیرہ کے اندر ہمارے تحفظات ہیں ان کی وجہ سے ہماری بنیاد کمزور رہتی ہے اور معاشی طور پر وہ صحیفے جو مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں ان کی اشاعت مخصوص اور مختصر ہوتی ہے- ان سب باتوں کی طرف قوم بھی توجہ کرے، صحافی بھی توجہ کریں اور قائدین بھی توجہ کریں تب کوئی بات بن سکتی ہے-

سوال:- کامیاب اور صحت مند صحافت کے لیے کن امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے؟ کیا انہیں مذکورہ چیزوں پر توجہ دی جائے جو ابھی آپ نے بیان فرمائی ہے یا پھر کچھ اور؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-مضامین کا انتخاب اس طور پر ہو کہ مذہبی طبقہ مجموعی طور پر مطمئن اور متاثر ہو اور مضامین دونوں طرح کے ہونے چاہئیں، معیاری بھی ہوتا کہ ہر طبقہ متاثر ہو سکے اور دوسرے طبقے کے لوگ جن کو مذہب سے کم دلچسپی ہے، پڑھ کر کے متاثر ہوسکیں- یہ بھی ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کیا جائے تو اس کا بھی فائدہ مذہبی صحافت کو پہنچے گا- اشتہارات کا خانہ تو مذہبی صحافت کے لیے لگ بھگ صفر ہے، حکومت کا جو شعبہ ہے وہ مذہبی رسائل کو اشتہارات دینے میں بے رخی برتتا ہے اور جو کمپنیاں ہیں وہ بھی بے رخی برتتی ہیں، لیکن پھر بھی مشکل حالات کے باوجود جیسے ہر شعبے میں انسان کوشش کرتا ہے تو کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے اس طرح اگر کوشش کی جائے تو پرائیویٹ قسم کے ہی سہی کچھ اشتہارات مل سکتے ہیں، اس کے لیے اصحاب خیر کو توجہ دلائی جائے تو وہ بھی اس میں معاون ہو سکتے ہیں- ریڈر شپ کو بھی مضبوط کیا جائے اور اشتہارات کے شعبے کو بھی مضبوط کیا جائے تو یہ سب باتیں مل کر کے مفید اور کارگر ثابت ہوسکتی ہیں- قرآن اور حدیث کی روشنی میں موجودہ مسائل کا حل پیش کیا جائے، بزرگوں سے رابطہ اور تعلق کی طرف ان کو متوجہ کیا جاتا رہے اور عصری ایجادات کے سلسلے میں بھی ان کو معلومات دی جاتی رہے، اس طرح کی جو جائز چیزیں ہیں انہیں ان کی طرف پیش کیا جائے- عصری ایجادات یا عصری علوم یا عصری فنون جو بھی اسلام اور انسانیت کی خدمت کے لیے مفید ہوں اور جن کو بھی بتانے، سمجھانے اور پیش کرنے کی ضرورت ہو وہ پیش کیا جائے- یہ تو اسلام کا مزاج ہے اور اس کا سلسلہ پہلے ہی سے چلا آرہا ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں ہوگی، بلکہ ایسا ہوتا ہی

آیا ہے- ہر دور میں اس دور کی جو جائز چیزیں بھی مفید رہی ہیں خواہ وہ اسلام کے لیے ہو، انسانیت کے لیے یا مسلمانوں کے لیے ان کو ہمارے اسلاف نے اپنایا ہے اور ان کا استعمال کیا ہے- ہمیں بھی استعمال وانتخاب اور اختیار کے شعبے میں اپنے اسلاف ہی کے نقش قدم کو اپنانا چاہیے-

سوال:- مذہبی صحافت کی اثر اندازی میں علمائے کرام کی کتنی اہمیت ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- علمائے کرام ہی کے ذریعے مذہبی صحافت مجموعی طور پر جاری اور باقی ہے- مذہبی صحافت کی تاریخ کو سامنے رکھا جائے تو نمایاں قسم کے جو لکھنے والے ہیں وہ زیادہ تر مذہبی شخصیات ہی ہیں، کیونکہ ان کا مذہبی مطالعہ بھی اچھا ہوتا ہے اور قارئین اور عوام پر ان کا اثر بھی ہوتا ہے- جس طرح سے پریشانی اور بدحالی کے باوجود علمائے کرام نے مدارس کو باقی رکھا ہے، اسی طرح سے مذہبی صحافت کو بھی باقی رکھا ہے- اس شعبے میں انھیں نہ تو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور نہ اصحاب ثروت کی، جو کچھ ہے وہ عام قارئین کی رفاقت اور خریداری کی شکل میں تعاون ہے- اس لیے مشکل ہی سے یہ گاڑی چل رہی ہے اور بیشتر علمائے کرام ہی اس کو چلا رہے ہیں، لیکن بہرحال یہ گاڑی چل رہی ہے اور ان شاء اللہ چلتی رہے گی-

سوال:- ہمارے علما میں تحریری ذوق وصلاحیت کا بالکل فقدان ہے جب کہ مدارس سے فارغ ہونے والے بیشتر علما میدان خطابت میں اپنی قسمت آزمار ہے ہیں، اس کا ذمہ دار آپ کس کو مانتے ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:-تحریری اور قلمی خدمات کا سلسلہ شروع ہی سے جاری ہے- کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا ہے کہ علما نے تحریر وتصنیف اور قلمی خدمات کی جانب توجہ نہ دی ہو- کم اور بیش ہوسکتا ہے اور فیصد کی کمی ہوسکتی ہے، لیکن یہ سلسلہ شروع ہی سے جاری ہے- اب رہا سوال کہ اس کا ذمہ دار کون ہے تو اس کو میں ایک مثال کے ذریعے بہتر طریقے پر سمجھا پاؤں گا: کسی مارکیٹ میں جس مال کی زیادہ سپلائی اور مانگ ہوتی ہے، وہ مال زیادہ تیار ہوتا ہے اور فیکٹری کا مالک اس کو زیادہ بنانا چاہتا ہے- تحریر اور تصنیف کا معاملہ یہ ہے کہ

اب سے دس سال پہلے تک علما نے کتابیں لکھیں، لیکن لکھنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ان کے سامنے یہ ہوتا تھا کہ چھپے کیسے اور کتاب چھپ گئی تو اس کی نکاسی کیسے ہو؟ مگر بفضلہ تعالیٰ اب حالات تبدیل ہو گئے ہیں، کتابیں اب کافی تعداد میں لکھی جا رہی ہیں اور ان کی اشاعت بھی ہو رہی ہے- خطابت اور تحریر کا جب موازنہ کریں گے تو ایک چیز جو ابھر کر آئے گی وہ بہت اہم یہ ہوگی کہ لکھنے والے کو نذرانے یا معاوضے کی شکل میں کوئی چیز نہیں ملتی ہے جب کہ مقرر ایک دو گھنٹے کی تقریر کرتا ہے تو فوراً اسے خاطر خواہ معاوضہ مل جاتا ہے- ظاہر ہے کوئی مذہبی انسان ہو یا دنیادار سب کو اپنی معاشیات کے استحکام کی کم سے کم ضرورت کی حد تک فکر رہتی ہے، وہ اس کی طرف توجہ کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے- اس طرح آپ بنیادی طور پر معاشیات ہی کو ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں- اس کے علاوہ تقریر کی مانگ بھی مارکیٹ میں زیادہ ہے اور نکاسی بھی ہے- چونکہ تقریر کی نکاسی زیادہ ہے اور تحریر کی اس کے مقابلے میں بہت کم ہے، نکاسی ہے بھی تو اس میں کوئی مادی فائدہ نہیں، جب کہ تقریر کی نکاسی بھی ہے اور اس کا مادی فائدہ بھی ہے- ان دونوں باتوں کی وجہ سے نو فارغین کی تقریر کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے-

سوال:- ماہنامہ ''حجاز جدید'' ایک زمانے تک آپ کی ادارت میں نکلتا رہا جس نے جماعتی سطح پر ایک اچھی گرفت بھی بنالی تھی، پھر آخر وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- اس کی بھی بنیادی وجہ مالیات ہی ہے، حجاز جدید کی اشاعت کے دوران میں کچھ دورے کرتا تھا، اس میں ممبر سازی کرتا، پھر اس ممبر سازی کے ذریعے جو رقم آتی رسالہ کی طباعت اور اشاعت وغیرہ ہوتی تھی- مجھے اس سلسلے میں کافی پریشانیاں اور دقتیں جھیلنی پڑتی تھیں، لیکن فوری طور پر جن چیزوں کا اثر ہوا، ان میں ایک یہ کہ کشمیر میں بہت اچھا خاصا رسالہ جاتا تھا، مگر وہاں کے جو حالات ہوئے ان حالات کا رسالے پر اثر پڑا اور پھر ٦ ر دسمبر کا حادثہ- نومبر ١٩٩٢ء تک رسالہ نکلا اور ٦ ر دسمبر کے بعد پورے ملک کے حالات ایسے ہو گئے کہ کہیں دورہ کرنا اور دورہ کے ذریعہ ممبر بنانا مناسب

نہیں تھا- اسی ٦ ر دسمبر کے حادثے کے نتیجے میں گویا رسالہ بند ہوا، بند ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی فنڈ تھی، اگر وہ رہتا تو مثلاً ٦ ر مہینہ میں نکالتا اور ٦ ر مہینہ دورہ کر کے پھر اس کی کمی پوری کرتا تو اس کے پیچھے بھی گھوم پھر کر کے وہی مالیات ہی کا معاملہ ہے-

سوال:- ہمارے قائدین اور اسلاف یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور ساتھ ہی باصلاحیت علما بھی کم پیدا ہو رہے ہیں، ایسے میں آپ جماعت اہل سنت کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہمارے اکابر اور اسلاف جن کو ہم نے دیکھا ہے وہ علم وفضل کے اعتبار سے بلند مقام پر فائز تھے- ان میں سے کم از کم میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ میرے جو اسلاف تھے وہ لگ بھگ اس دنیا سے جا چکے ہیں- ان کے حساب سے اگر ہم اپنے آپ کو ناپتے ہیں اور اپنے حساب سے بعد والوں کو ناپتے ہیں تو کافی فرق معلوم ہوتا ہے، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہم بڑوں کو دیکھ لیتے ہیں تو ان کے مقابلے میں ہمیں خود بھی اپنی حیثیت کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتی ہے اور بعد والوں کی بھی، لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعد والے یا ہمارے جو معاصرین ہیں وہ بعد والوں کی نظر میں چونکہ اسلاف ہوں گے اس لیے یہی اسلاف ان کو ایسے نظر آئیں گے کہ وہ بہت قابل قدر ہوں اور انہیں میں سے ایسے افراد پیدا ہوں جو نمایاں ترین کام کریں- انحطاط اور زوال عصری لحاظ سے بھی چلا آ رہا ہے جیسا کہ ہر تنظیم و تحریک میں ہوتا ہے، دینی تنظیموں اور دنیاوی تنظیموں میں بھی- اب جماعتی اعتبار سے دیکھا جائے مثلاً آپ اعلیٰ حضرت سے شروع کیجیے تو ان کے خلفا صدر الشریعہ، صدر الافاضل، حجۃ الاسلام اور حضرت مفتی اعظم ہند وغیرہ کا مقام بہت اونچا تھا، لیکن پھر ان کے جو خلفا اور تلامذہ تھے، مثلاً محدث اعظم پاکستان، حافظ ملت، مجاہد ملت اور مفتی اعظم کانپور وہ صدر الافاضل وغیرہ کے مقابلے میں کم تھے، پھر ان حضرات کے جو شاگرد تھے مثلاً حضرت مفتی حبیب اللہ نعیمی صاحب علامہ ارشد القادری صاحب یا مولانا عبد الرؤف بلیاوی علیہم الرحمہ وغیرہ تو وہ اپنے پہلے کے مقابلے میں بہت کم تھے- اب چوتھی نسل جس میں میں اپنے آپ کو شمار کرتا ہوں یہ اپنے پہلے کے مقابلے میں کم ہے- یہ انحطاط عصری

حساب سے چلا آ رہا ہے اور کچھ نظامِ قدرت بھی ہے کہ کوئی بھی تحریک یا تنظیم ابھرتی ہے تو دور کے لحاظ سے عموماً اس میں انحطاط آتا ہے- اسی چیز کو آپ سیاسی زبان میں سمجھیں تو ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک کے لیڈروں کا جائزہ لیجیے، دور کے لحاظ سے ان کے معیار میں اسی حساب اور اسی انداز سے فرق ہے- اب جو کچھ بھی ہے اور جیسا بھی ہے انہیں میں کرنا ہے اور جو کیا جا سکتا ہے وہ ہو رہا ہے، اس کو سنوارا جائے، سجایا جائے، اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے لیے وسائل پیدا کیے جائیں تو ان شاء اللہ اپنے دور کے لحاظ سے یہی اسلاف ہوں گے اور اپنے دور کے حساب سے کارگر اور مفید بھی ثابت ہوں گے-

سوال:- آج عالمی سطح پر اسلام مخالف تحریکوں کا دور دورہ ہے جن کا تحریری اور تقریری جواب تمام مکاتب فکر کی تنظیمیں دیتی رہی ہیں، مگر جماعت اہل سنت کی طرف سے بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے اور نہ ہی سیاسی سطح پر اس کے وجود کی کوئی اہمیت ہے- ایسے میں کسی سیاسی اور سماجی تنظیم کی آپ کتنی ضرورت محسوس کر رہے ہیں جس کی نمائندگی ہمارے علمائے کرام کریں؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہمارے یہاں مجموعی طور پر سیاسی اور تنظیمی اعتبار سے کافی کمزوری ہے- چند حضرات نے اگر اپنے اپنے طور پر کام کیا بھی تو ہمارا جماعتی مزاج ان کا معاون نہ بن سکا- سیاسی اور تنظیمی فیلڈ میں اگر نام لیا جائے تو حجۃ الاسلام، محدث اعظم ہند، مجاہد ملت، سید العلما اور حضرت علامہ ارشد القادری یہ وہ نمایاں نام ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اپنے انداز سے کام کیا اور کام کرنے کی کوشش بھی کی اور دیگر تنظیموں سے بھی ان لوگوں کا رابطہ رہا اور ملی سیاست میں بھی اپنی اپنی قیادت کا فریضہ انجام دیا، لیکن جیسے دیگر تنظیمیں بہت زیادہ عوامی سطح پر کام کرتی ہیں یا خواص علما کی سطح پر اس طرح ان کی پذیرائی نہ ہو سکی جیسی ہونی چاہیے تھی- کسی تنظیم کی ضرورت کے احساس کا جہاں تک سوال ہے اس کی ضرورت محسوس بھی کی گئی ہے اور آج بھی محسوس کی جا رہی ہے- یہ کام ہونا چاہیے، لیکن اقدام کی اور عمل کی جہاں تک بات ہے اس میں کافی دقتیں ہوتی ہیں- ہمارے سنی عوام کا مزاج کچھ اس طرح سے بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے کہ وہ ملی سیاست اور تنظیم کو

بہت زیادہ کار ثواب نہیں سمجھتے ہیں، دیگر نفل اور مستحب کاموں میں جوان کا ذوق وشوق ہوتا ہے وہ اس طرح کے کاموں میں نظر نہیں آتا- کچھ تعاون بھیڑ کی شکل میں ضرورت اور مواقع کے لحاظ سے تو کر دیتی ہے لیکن کوئی بھی تنظیم اور تحریک اپنے متعلقہ سہولیات کے بغیر نہیں چل سکتی مثلاً آفس اور دیگر سہولیات کے ساتھ صوبوں اور اضلاع میں ممبر سازی ہو، میٹنگ اور جلسے وغیرہ کرنے کے لیے فنڈ ہوں، اخباری بیانات دینے اور اخبارات کو متوجہ کرنے کے لیے جو آج طریقے ہیں ان کو استعمال کیا جائے تو کام ہو سکتا ہے اور عوام کے مالی تعاون کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا ہے- ہمارے علاوہ دیگر جماعتوں میں جو تنظیمیں کام کر رہی ہیں انہوں نے اپنے عوام کا بھی اس طرح کا مزاج بنایا ہے جس کا انہیں فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور ایک بہت بڑی بنیادی چیز یہ ہے کہ ان کو بعض چند ایسے ذرائع سے فنڈ بھی مل جاتا ہے جو ہم کو نہیں مل سکتا- اس کی وجہ سے ان کو اور زیادہ کامیابی حاصل ہو جاتی ہے جو ہمیں میسر نہیں- تو یہ کمی ہے اس کا ازالہ ہونا چاہیے اور اس کی جانب چند تنظیمی اور تحریکی مزاج رکھنے والے حضرات نے ہمیشہ توجہ کرائی ہے، لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی ہے-

سوال:- آپ تقریباً دو دہائیوں سے تصنیف وتالیف کے ایک عظیم مرکز بنام دار القلم کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، مگر کیا وجہ ہے کہ عملی طور پر آج بھی اس کا کوئی وجود نظر نہیں آتا ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہاں! منصوبے کے مطابق تو واقعتاً دار القلم اس طرح سے اپنا کام ابھی شروع بھی نہیں کر سکا ہے جس طرح سے ہونا چاہیے، اس میں بھی ایک رخ یہ ہے کہ ہمارے سنی عوام مسجد اور مدرسے کے نام پر تو آسانی سے تعاون کر دیتے ہیں، لیکن قلمی اور تحریری کام کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے، یہی وجہ ہے کہ ''المجمع الاسلامی'' جس کو میں نے اور میرے چند ساتھیوں نے مل کر قائم کیا تھا، جس کے قیام کو بھی تقریباً ۲۶ رسال ہو گئے، مگر وہ بھی اس طرح سے کام نہ کر سکا جیسا کرنا چاہیے تھا اور یہی حال دار القلم کا ہے جو دہلی میں اس کی دوسری شکل ہے- عوام کو دار التصنیف اور دار القلم وغیرہ سے رغبت نہیں ہوتی ہے- جب رغبت نہیں تو پھر ان کا مالی تعاون بھی نہیں ہوتا اور کوئی

بھی کام بغیر عوام کے مالی تعاون کے نہیں کیا جاسکتا- دوسری وجہ کا تعلق میری شخصی کمزوری سے ہے- وہ یہ کہ جس طرح دوسرے بہت سے لوگ چندہ کر لیتے ہیں اور کسی سے بھی کسی انداز میں مانگ لیتے ہیں، اس طرح سے میں نہیں کر پاتا ہوں، دوسرے لفظوں میں مجھے چندہ کرنے کا فن نہیں آتا ہے-

سوال:- یہ کہاں تک درست ہے کہ ماہنامہ ''کنزالایمان'' کا وجود آپ کے اداریہ پر انحصار کرتا ہے؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ہاں! اکثر لوگوں کے ذہن میں اس طرح کی باتیں ہیں، وہ کہتے ہیں اور زبانی طور پر یہ تأثر بھی دیتے ہیں- ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے کہ کسی بھی میگزین اور رسالے میں اصل چیز اداریہ ہی ہوتا ہے، اسی سے رسالے کا رخ متعین ہوتا ہے اور رسالے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن آپ کو یقیناً یہ معلوم ہوگا کہ ''کنزالایمان'' رضوی کتاب گھر کا رسالہ ہے اور رضوی کتاب گھر ہی اس کو نکالتا ہے، میں اس کا صرف مدیر اعلیٰ ہوں تو ہر کام مجھے اپنی مرضی سے کرنا بھی نہیں چاہیے- رضوی کتاب گھر ایک تجارتی ادارہ ہے ساتھ ساتھ اس نے ایک تبلیغی اور صحافتی کام بھی شروع کیا ہے، اس لیے مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ رضوی کتاب گھر کو بھی دیکھنا ضروری ہے اور دونوں کو ملا کر دیکھا جائے گا تو بات سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی- اداریہ کو آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ یہ خواص کے لیے ہے اور باقی مضامین عوام کے لیے ہیں اور خواص وعوام کو ملا کر ہی گاڑی چلائی جاسکتی ہے-

سوال:- قارئین ماہنامہ جام نور کے لیے آپ کی طرف سے کوئی پیغام؟

مولانا یٰسین اختر مصباحی:- ماشاءاللہ ماہنامہ جام نور کے جتنے بھی شمارے اب تک نکلے ہیں وہ ہماری نظر سے گزرے ہیں اور اطمینان بخش ہی نہیں بلکہ حوصلہ بخش اٹھان ہے، جام نور کو آپ صحافتی معیار کے لحاظ سے بہت ٹھیک ڈھنگ سے چلا رہے ہیں- آپ اپنے معیار کو بھی دیکھیں، قوم کے معیار کو بھی دیکھیں اور اس کو سمجھیں- بنیادی حلقہ چوں کہ آپ کا اہل سنت و جماعت کا ہے اس لیے سنی عوام کیا چاہتے ہیں اس کو بھی سامنے رکھیں اور آپ کیا چاہتے ہیں اس کو بھی سامنے رکھیں، دونوں میں ہم آہنگی ہونی چاہیے- قارئین کا فرض یہ ہے

کہ وہ (جام نور جو پرانا بھی ہے اور نیا بھی) کا خریدار بن کر کے اس کو تقویت پہنچائیں- ظاہر سی بات ہے اس کو تقویت پہنچانے کی جہاں اصحاب قلم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مضامین و مقالات اور تحریروں کے ذریعے اس کو تقویت پہنچائیں وہیں بلکہ اس سے کہیں بڑی ذمہ داری سنی عوام کی ہے کہ خود خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی خریدار بنائیں- مجھے امید ہے کہ ان شاءاللہ مستقبل میں یہ ایک اچھا اور مؤثر رسالہ ثابت ہوگا- دور جدید کے جو تقاضے ہیں ان پر ہم سب کو نظر رکھنی چاہیے اور جائز ذرائع اور وسائل کا استعمال کر کے سنیوں کو، سنی رسالوں کو اور سنی اصحاب قلم کو مل جل کر اسلام اور سنت کا پیغام پہنچانا چاہیے، دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہیے- اس سلسلے میں اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ مثبت سوچ کے ساتھ ساتھ رسالے کا انداز داعیانہ ہونا چاہیے اور بوقت ضرورت مناظرانہ انداز کی بھی ضرورت ہے، لیکن عمومی لحاظ سے دعوت کا پہلو نمایاں ہو- ❑❑❑

(شمارہ اپریل ۲۰۰۳ء)